لٹ خانہ

عبداللہ جان جمالدینی

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

مری لیب فاطمہ جناح روڈ کوئٹہ

کتاب کے جملہ حقوق سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے نام محفوظ ہیں

کتاب: لٹ خانہ

مصنف: عبداللہ جان جمالدینی

اشاعتِ اول: 2002

اشاعتِ دوم: 2013

قیمت: 150 روپے

کتاب حاصل کرنے کا پتہ:

مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ

081-2843358

www.sangatacademy.net

انتساب

میں اپنی کتاب ''لٹ خانہ'' کی دوسری اشاعت کا انتساب بلوچی زبان کے نامور ادیب اور دانشور، اپنے رفیق، استاد، مرشد، جناب شان گل، ڈاکٹر شاہ محمد مری کے نام کرتا ہوں اور ساتھ ہی اپنی پہلی اور آخری بلوچی نظم جو میں نے اُن کے بارے میں موزوں کی ہے، پیش کر رہا ہوں، اس نظم کو بھی اس انتساب کے ساتھ شائع کیا جائے۔

شان گل(1) تو کجائیے

شان گل تو کجائیے — پرچے تو نہ یائیے
تو مہر و وفائیے — تو پاک و صفائیے (2)
ہر درد ءِ دوائیے — چو سُہر و طلائیے
ہر وخت مس دلائیے — پچمانی تہائیے
مئے بخت ءِ بہائیے (3) — ''چو پُل ءِ وڑائیے'' (4)
دُور پہم و گچین ئے — پچّماں تو پچین ئے
پکرا چوں سمائے — علما پہ فدائے
زانتا پہ گنوکئے — کارا پہ چمو کئے
ظلم ءِ تو خلا فئے — مہلوک ءِ طرفدار یئے
وارانی تو یارئے — بدواہ تو زردارئے
''من پر تو زراں — من بے تو مراں''

مستؔ ءِ تو مریدئے — دژمن تو (ہر) یزیدئے
راجا تو وزیر ئے (5) — پما تو دبیر ئے
سمو راج ءِ تو وکیل ئے (6) — شاگرد ءِ کریم ئے (7)
استاد ءِ کلیم ئے (8) — ہر کس ءِ ندیم ئے

رحمت بی پر تہ رب رحیم ئے

1-شان گل ڈاکٹر شاہ محمد ءِ کسانی ءِ نام ایں کہ اے نام آ نہی ماث آ ئرا تو ار کرتے۔

2-صفا شیخ سعدی ءِ صوفیانی گروہ ءِ مرداں گشتنت۔ اخوان الصفا۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا فارسی ادبءِ مستریں نام کہ آئی قلمی نام ہے مناسبتا صفات۔

3-قدر، قیمت، value

4-اے گال چہ ورنائیں نامی ایں گشندہ (گلوکار) واجہ عارف بلوچ ءِ شیرءِ زرتگوں۔ اے بہر ہمانہی ءِ شیرانت

5-شاہ محمد ءِ خانوادہ ءَ وزیرزئی گشنت۔ آئی ڈاڈا نام ہم وزیراث او آں مزنیں خیر بخش ءِ صلاح کار (وزیر) بوتہ۔

6-سموراج۔ اے لوز ءَ شاہ محمد پہ زالانی صفتا کار مرز کنت۔ آئی نامی ایں کتاب ''بلوچ سماج میں عورت کا مقام'' انت۔

7-مری مگ ءِ مستریں دانشور، صوفی، انسان دوست کہ آئی ءَ شان گل ءَ مسیت ءَ ابتدائی اسلامی، عربی و فارسی تعلیم داتہ۔

8-واجہ کامریڈ کلیم خان کہ مری لیب ءَ کار ءَ کنت۔

عبداللہ جان جمالدینی

گلشن حبیب، فیض آباد، سریاب۔کوئٹہ

24 جولائی 2009

فہرست

دوسرے ایڈیشن کا پیش لفظ	شاہ محمد مری	7
پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ	ڈاکٹر خدائیداد	10
باب ۱		14
باب ۲		18
باب ۳		21
باب ۴		27
باب ۵		32
باب ۶		38
باب ۷		45
باب ۸		50
باب ۹		55
باب ۱۰		69
باب ۱۱		79
باب ۱۲		83
باب ۱۳		94
باب ۱۴		102
باب ۱۵		112
باب ۱۶		119
باب ۱۷		128
باب ۱۸		135
باب ۱۹		142
باب ۲۰		146
باب ۲۱		151
باب ۲۲		154
باب ۲۳		159
باب ۲۴		164
باب ۲۵		169
باب ۲۶		173
باب ۲۷		177
باب ۲۸		181
باب ۲۹		189
باب ۳۰		194
باب ۳۱		197
باب ۳۲		201
باب ۳۳		210
باب ۳۴		218
باب ۳۵		224
باب ۳۶		231
باب ۳۷		238
باب ۳۸		246

دوسرے ایڈیشن کا پیش لفظ

یہ بلوچستان میں چند روشن فکر اذہان کے تجربات پر مشتمل کچھ برسوں کی کہانی ہے۔ایسے اذہان جنہوں نے اچھی اچھی نوکریاں چھوڑ دیں ۔ اور سماجی خدمت ، ادب ، صحافت اور سیاست ہر جگہ جھپٹا مارنا شروع کر دیا ہے۔نت نئے تجربات سے بھر پور جوانی کی ملاقات کے نتیجے میں، رواں کارواں میں کئی نئی چیزوں کا اضافہ ہوا۔تحریر، کتاب تحقیق کی نئی باتیں عمومی فضا کا حصہ بنیں۔ یہ نوجوان *لٹ خانہ* کے نام کا ایک کمیون سا بنا کر اُس میں رہتے رہے۔نیم انقلابی رومانٹک نوجوان!

لٹ خانہ بلوچستان میں ترقی پسندی اور بالخصوص ترقی پسند ادب کی تاریخ کے ایک ٹکڑے کو بیان کرتا ہے۔اس میں صرف ایک زبان یا ایک قبیلے کی نہیں بلکہ من جملہ بلوچستان کی کہانی موجود ہے۔

نیز اس کتاب میں بلوچستان کی اُس زمانے کی بہت ساری شخصیات کا تذکرہ ہے جن کے قول وفعل نے خطے میں اچھا یا برا، اثر ضرور ڈالا۔*لٹ خانہ* ایک سچے آدمی نے لکھی ہے، اور اُس وقت لکھی جب اُس کے سچ بولنے والے سارے کامریڈ زندہ تھے۔سچائی لکھنے والے کی سچائی سے کھیلنا ذرا نقصان دِہ ہوتا ہے۔

جب ان کی تنظیم کا ڈھانچہ سلامت نہ رہا اور اُن لوگوں نے اپنے اپنے علاقوں میں جا کر

وہاں کے مخصوص حالات کے مطابق سماجی سیاسی سرگرمیوں میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو اُن کی دوستیاں ایک تحفظاتی حصار دیے رکھتی رہیں اِس فکر کو۔ ہر شخص اپنے اپنے میدان میں نظر انداز نہ کیے جا سکنے کی حد تک بڑھوتری کرتا رہا۔ جب تک کہ ایک نئی پود جوان ہوئی۔ جو کہ اُن کے بھاری بوٹ پہننے کی طفلانہ غلط فہمی میں ابھی تک مبتلا ہے۔

لٹ خانہ کی پہلی بار اشاعت کے بعد کے اِن بیس پچیس سالوں میں اس روشن فکر تحریک کے کئی زندہ گواہ کوچ کر گئے ۔ خدا داد کو تو سب سے زیادہ جلدی تھی ۔ پھر کمال خان نے سوچا کہ خدائیداد کے بنا کیا جینا؟۔نادر قمبرانی بھی اپنا طبعی دورانیہ پورا کر گیا۔

خود ماما عبداللہ جان ہست ونیست کے دوراہے پہ ہے۔آنکھ، کان ،زبان ، اور بایاں حصہ دماغ کے ساتھ ہارمونی برقرار رکھنے کے فریضے سے غافل ہو چکے ہیں۔قویٰ مضمحل ہیں...... بڑھتی عمر اپنا کام کرتی جا رہی ہے۔مگر زندہ ہے یہی غنیمت ہے۔کہ وہ *سنڈے پارٹی* کے اکٹھ کا بہانہ ہے۔*بلوچستان سنڈے پارٹی* زندہ باد ،کہ اس سے پروگریسو ڈاکٹرز فورم نکلا ،یہیں سے بزنجو فاؤنڈیشن چل پڑی اور یہیں سنگت اکیڈمی آف سائنسز کو کھاد پانی ملتا رہا۔''بلوچستان سنڈے پارٹی''، روشنیوں، روشن دماغیوں کی فیکٹری ہے......اور عبداللہ جان سنڈے پارٹی کا سایہ دار درخت بھی ہے اور سبز ونرم گھاس سے بھرا فرش بھی۔عبداللہ جان، تمہارے سائے میں بلوچستان کو بہت نعمتیں میسر آئیں۔......اور سب سے بڑی نعمت، فکر کرنے والے ذہنوں کی حوصلہ افزائی کی ہوتی ہے۔

اُس کا کارواں چل رہا ہے کہ کارواں کو چلتے ہی رہنا ہے۔اب اُسے جونیر اور نسبتاً کم تجربہ کار پیرو کار چلا رہے تھے۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ کاروان لاغر یا سست ہے کہ یہ کارواں کی بے حرمتی ہوگی۔مگر چیلنجز بہت بڑھ چکے ہیں۔پیچیدگیاں بہت در آئی ہیں۔کنفیوژنیں بہت ساری ابھر آئی ہیں۔مقابل بہت مضبوط ہو چکا ہے۔

گُل ہوتی ہوئی اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی ہے جب اسے کاروان کی حرکت پذیری کے تسلسل کا پتہ چل جاتا ہے۔اگلے ہفتے تک مزید اچھی خبریں ملنے کی آس میں زندہ رہتا ہے۔انسانیت کی راہ میں ہر چھوٹا قدم اُسے مسرور کر دیتا ہے۔ یارو! ہم نے عبداللہ جان کو بہت کچھ دے

دیا ہے، کیوں ناشکری کریں۔

لٹ خانہ کا پچھلا ایڈیشن کب کا ختم ہوا۔ ایک عرصہ سے لوگ اس کے خواہاں تھے۔ بالخصوص سائیں کمال خان شیرانی کی وفات کے موقع پراس کی سخت ضرورت محسوس کی گئی۔اور پھرتو خود ماما عبداللہ جان نے اصرار کرنا شروع کردیا۔وہ جب بھی پوچھتا ہے''سنگت چھپ گیا؟''تو اس کا مطلب ہوتا ہے''لٹ خانہ چھپ گیا''؟۔ ماما کا ایک دفعہ کہنا بہت ہوتا ہے،اس کا کسی بات پہ اصرار کرنا تو خجالت کی بالٹیاں انڈیل دینا ہوتا ہے۔

شاہ محمد مری

چھ جولائی 2013

پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ

اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس وقت جو تحریر آپ پڑھ رہے ہیں۔ وہ ایک کتاب ہے۔شک اور حیرت کی جو بات آپ کے ذہن میں گھوم رہی ہے یا شاید ایسا نہ ہو۔مگر کافی عرصے سے یا پہلی دفعہ اس وقت جب اس کتاب کا نام سامنے آجاتا ہے۔ ویسے اکثر کہا جاتا ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ایک کتاب ہے،اس کا کوئی بھی نام رکھا جاسکتا ہے۔ بات تو کچھ اس قسم کی بھی دکھائی نہیں دیتی کیونکہ نام ہی میں تو سب کچھ رکھا ہے۔کتاب کا نام پڑھتے ہیں تو پتہ بھی لگ جاتا ہے کہ اس کا مضمون کیا ہے اور کس تعلق سے کتاب تحریر کی گئی ہے۔

اس کتاب کا نام *لٹ خانہ* جیسا کہ اس نام کے بارے میں کافی وقت سے حیرت ظاہر کی جارہی ہے۔اور بعض حضرات کی سمجھ میں ابھی تک بھی بات نہیں سما سکتی۔اور سوال کچھ اس قسم کا ذہن کو پریشان کرتا رہتا ہے کہ *لٹ خانہ* تو ٹھیک ہے ؛ وہ جگہ جہاں لٹ لوگ رہتے ہیں۔مگر لٹ کا مطلب کیا ؟ اور یہ سوال تو جب سے *لٹ خانہ* وجود میں آچکا ہے،بعض لوگوں کے ذہن میں گھوم گھوم کر ان کی پریشانی کا سبب بنا ہوا ہے۔ ہمارے اپنے ایک لٹ ساتھی سے ایک دن کسی نے پوچھا،تو اس کا ایک جلا بھنا جواب کچھ اس طرح سے تھا؛ کہ لٹ کا مطلب ہے؛ لٹ،لغو اور بیکار۔

مگر بات تو ایسی بھی نہیں۔ یادش بخیر اس نام کے حوالے ہی سے ایک بڑی شخصیت یاد آ گئی۔ اس خطے میں سب سے پہلے لوگوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے والی عظیم شخصیت جناب عبدالصمد اچکزئی شہید لٹ خانہ اور لٹوں کی سنگت کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ موصوف کی عنایت اور شفقت کی پوری توجہ لٹ خانے اور لٹ سنگت ٹھہر گئی تھی۔ لٹ خانے چل کر آنا کرنا اور لٹوں کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرنا لٹ سنگت کے لیے خوش نصیبی کی بات تھی۔ مگر یہاں تو ان کی یاد اس نام کے حوالے سے کرنی ہے، جس طرح اس نام کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں سوال اٹھا کرتے تھے۔ تو عبدالصمد اچکزئی نے شہید سے بھی لٹوں کے ساتھ تعلق کی بنیاد پر کوئی نہ کوئی سوال کر ہی لیا کرتا تھا۔ تو اس سلسلے میں موصوف کا جواب بڑا اخندہ سا تھا کہ لٹ ایسے لوگ ہیں جو کسی اونچے مقصد یا کام کے پیچھے لٹ بن کر پڑ جاتے ہیں۔ اس وقت تک اپنی پوری جانفشانی سے کام جاری رکھتے ہیں جب تک کہ اس کو تکمیل تک نہیں پہنچاتے۔ اور لٹ کا اصل مطلب بھی یہی ہے کہ پختہ ارادے والا۔ ویسے تو کچھ لوگ اور بھی تھے۔ جن کی ملاقات اکثر لٹوں کی سنگت کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ اور غالباً یہ لوگ اس سنگت کو اپنے مقاصد میں شامل کر کے اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے تھے۔ یا اپنی لیڈری چمکانا چاہتے تھے۔ خیر جو کچھ بھی تھا گزرتے ہوئے وقت نے اپنی رفتار کے پاؤں تلے ان کو روند ڈالا۔ بات صرف یہ تھی کہ ایسے لوگ بھی لفظ لٹ کی تشریح کچھ اس طرح سے کیا کرتے تھے کہ لٹ جو لوگ کسی کام کے نہیں۔ یہاں تک کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے بھی کوئی کام نہیں کرتے۔ بھوک جب بہت زیادہ ستانے لگ جاتی ہے تو لٹ خانے میں پڑے کاغذات اور اخبارات جمع کر کے بغل میں دبا کر ردی میں بیچ دیتے ہیں۔ اور اس طرح سے ایک دو وقت کی روٹی ان کے ہاتھ لگ جاتی ہے جو پیسے کاغذوں کو دسترخوان بنا کر ان ہی کاغذوں پر بیٹھ کر کھا لیتے ہیں اور کاغذ تو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کاغذوں پر سوتے ہیں اور ایسے ہی لوگ تھے جو لٹوں کے نام کا صدقہ کھایا بھی کرتے تھے۔ اور آپ سے بس اتنی درخواست ہے کہ آپ ان کے نام نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔

اب اپنی بات کا رخ واپس موڑتے ہیں اس خوبصورت کتاب کی طرف جس کا نام ہے؛ لٹ خانہ۔ یہ تحریر جناب پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی کی ہے۔ جس کو وہ قسطوں میں رسالہ سنگت

کے لیے لکھتے رہتے ہیں۔ اسی تحریر کی اقساط اب آپ کے ہاتھ میں کتاب کی صورت میں موجود ہیں۔ اس کتاب کے لکھنے والے کی حیثیت سے یا کسی بھی حیثیت سے عبداللہ جان کا نام ذہن میں آتا ہے تو ذہن کے پردے پر ایک نہایت ہی خوبصورت لہجہ ابھر آتا ہے جس کو فطرت کے فنکار نے بڑے غور اور اپنی پوری صلاحیتوں کی بھرپور مہارت سے چاغی کے پہاڑوں کے سنگِ مرمر کی ایک خوبصورت چٹان کا انتخاب کر کے اس میں محبت اور خلوص و رفاقت کے حسین نقش تراش دیے ہیں۔ عبداللہ جان کی محبت اور خلوص ہمارے حصے میں صرف لٹ خانے کے وجود میں آنے کے وقت سے نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے تقریباً ساٹھ سال کے طویل عرصے سے ہے۔ جب عبداللہ جان نے بڑے زلزلے کی تباہی کے بعد سنڈیمن ہائی سکول کے پشین منتقل ہونے کے بعد نوشکی سے آ کر داخلہ لیا تھا۔ آنے کے چند دن بعد عبداللہ جان کی جس کسی سے واقفیت ہوئی، ایک دو ملاقاتوں میں ہی اس کا گرویدہ بن گیا۔ سنڈیمنیز میں ایک بہت اچھی بات اس طرح سے پائی جاتی تھی کہ وہ مختلف گروپ بناتے تھے؛ کھیلوں سے دلچسپی رکھنے والوں کا اپنا گروپ تھا۔ سیر سپاٹے اور تفریحات سے دلچسپی رکھنے والے سٹوڈنٹس کا اپنا گروپ تھا۔ اس طرح کتابیں مطالعہ کرنے والوں کا اپنا گروپ۔ خوش قسمتی سے عبداللہ جان کی دلچسپی بھی اسی گروپ کے ساتھ ہوئی اور اس گروپ میں اٹھنے بیٹھنے لگے۔ اس گروپ کا چلانے والا عبدالصمد اخونزادہ؛ مشہور شاعر اور حکیم عبدالعلی اخونزادہ کا بھتیجا تھا۔ جو ایک تیز یادداشت کا مالک تھا۔

ظاہر ہے اُنیس سو اُنتیس کے بعد اس گروپ کے زیر مطالعہ اور مباحثہ علامہ اقبال کا کلام رہتا تھا۔ صمد کو اقبال کا کلام پورے کا پورا یاد تھا۔ کسی بھی شعر کا کوئی بھی مصرع کسی کو یاد ہوتا، صمد ساری نظم سنا دیا کرتا تھا۔ اقبال کے ایسے اشعار زیادہ دلکش لگے؛ یہ تھے...... اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو/ کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو...... یا یہ کہ...... دیہہ خدایا یہ زمین تیری نہیں، میری نہیں۔ علامہ اقبال کے کلام کے مطالعہ کی روشنی میں مارکس، لینن، ہیگل، اسٹالن، نطشے اور گوئٹے وغیرہ کے ناموں سے واقفیت ہوئی جو بعد میں ان کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے تجسس کا سبب بنے۔ اور اسی تجسس میں کافی وقت گزر جانے کے بعد سوشلزم کے نظریہ کی طرف خیالات گئے اور

بات مختصر یہ کہ لٹ خانے میں لٹوں کے سنگت بننے کا اصل سبب بھی یہاں اسی نظریہ پر کام کرنے اور بنیاد رکھنے کا مقصد تھا۔ ہر طرف سے مختلف سازشوں کی وجہ سے اس مقصد کا کیا حشر ہوا...... یہ ایک الگ داستان ہے۔ غالباً اس کی ایک جھلک *لٹ خانہ* پڑھنے والے کو مل ہی جائے گی۔ کے سنگت عمدہ طور پر جاری رکھنے میں بھی عبداللہ جان کی فعال رہبری کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ اور آج تک اپنی جگہ پر قائم اور مستحکم۔ بقول رحمان بابا؛''میں وقت کی طرح اپنے مقام پر مستقیم ہوں، خزاں آئے یا بہار آئے۔''

لٹوں کی سنگت میں عبداللہ جان کی مرکزی حیثیت لٹ خانہ کے مختلف ادوار میں وقت کے نوجوانوں کے لیے ایک مثالی حیثیت سے رہی۔ اور آج کے زیادہ تر سیاسی اور سماجی لحاظ سے باشعور لوگ اس کی یاد دہانی کرتے رہتے ہیں اور تمام لٹوں کو اپنے اس رہبر ساتھی پر ہمیشہ فخر رہا ہے اور رہے گا۔ مگر ایک آخر بات رہ نہ جائے؛ یہ بھی کہ اب تک تو صرف عبداللہ جان کی خوبیوں کا ذکر ہوتا رہا۔ ان کی شخصیت میں خامی کا بھی ہونا تو ضروری ہے۔ کیونکہ خیام نے کہا تھا؛''آنکس کرنکرد گناہ چوں زیست بگر؟۔''اس سکا واضح مطلب یہ ہے کہ خامی کے بغیر جینا ممکن ہی نہیں ہے۔ یا یہ کہ زندگی کا کوئی لطف ہی نہیں۔ عبداللہ جان کی خامیوں میں سے ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اس نے اپنے ملنے والوں کی شرافت معلوم کرنے کی کوشش کبھی بھی نہیں کی۔ اور یہ کام ہمارے ایک بہت پیارے سنگت اکبر جان کے سپرد رہا کہ لٹ خانے میں آنے جانے والوں پر نظر رکھا کرتا تھا اور ان کی شرافت معلوم کرتا رہتا تھا۔ اکبر جان چند سال قبل ہم سے جدا ہو گیا۔ مگر اس کی یاد دلوں سے کبھی دور نہیں ہو گی۔

ڈاکٹر خدائیداد

ا

لٹ خانہ داستان ہے بلوچستان میں ترقی پسندی اور روشن خیالی کی تحریک کی۔ جس کا آغاز 1950 میں ہوا تھا۔ جہاں سے یہ چشمہ پھوٹا، اس کا نام *لٹ خانہ* پڑ گیا۔ برسوں سے یہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ اس داستان کو تحریری صورت میں بیان کیا جائے جس کا ذکر بیشتر مقالوں اور سیمیناروں میں ہوتا رہا ہے۔ مگر اسے کون تحریر کرے؟ یہ سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔ سب سے پہلا مطالبہ کمال خان شیرانی سے ہوا جو اس فکری مرکز کے سب سے اہم بنیاد گزار تھے مگر انہوں نے معذرت کی اور انہوں نے مجھے اس کام کو انجام دینے کے لیے کہا۔ ازاں بعد *لٹ خانہ* کی تحریک کو شہہ دینے والے اور اس کے روحِ رواں انجم قزلباش تھے۔ ان کی جانب نگاہیں اٹھیں مگر بلوچستان میں اردو کے یہ نامور ادیب اور صحافی، جس کی تحریر میں قوت و زور کے علاوہ دلکشی تھی غربت اور کسمپرسی کے سبب ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوئے جس نے ان سے قلم چھیننے کے علاوہ قوت گویائی بھی چھین لی ہے۔ انجم قزلباش کے بعد اس کام کو بہتر سرانجام دینے والے ڈاکٹر خدائیداد خان ہیں۔ میری خواہش تھی کہ ان کے قلم سے یہ داستان تحریر ہو مگر انہوں نے بھی معذرت کی۔ رہ گیا میں اور سب احباب کا مطالبہ

بھی یہی رہا ہے کہ میں ہی اس کام کو صورت دوں ۔ میں نے بھی معذرت بہت کی مگر میری کون سنے؟ بہر کیف اب قرعہِ فال میرے نام نکلا ہے۔ میں جو ہر لحاظ سے اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ ایک دو سال سے عذر لنگ کرتا چلا آ رہا ہوں مگر اب مجھے مجبور کرنے کے لیے ڈاکٹر شاہ محمد مری جیسے جابر کمدار کو مقرر کیا گیا ہے جو خود تو مشینی صفات کا مالک ہے، بھلا میں کیونکر اس کی گرفت سے نکل سکتا ہوں۔

تو قارئین! بالآخر میں ''لٹ خانہ'' کی داستان لکھنے پر آمادہ ہوا ہوں۔ ''لٹ خانہ'' جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، ایک تحریک کا نام ہے؛ فکری اور شعوری تحریک ۔ بہت عرصہ گزرا جب اس کی بنیاد پڑی یعنی 1950 کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ گویا اب اسے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہے۔ اس وقت میری عمر 28 سال تھی۔ میری یادداشت تو اس وقت بھی بہت اچھی نہ تھی ۔ بھلا اب کیونکر اس قابل ہوگی کہ میں سب کچھ از سر نو یاد کر کے اسے بیان کرسکوں۔ تاریخ کی ترتیب میں (In Chronological Order) حالات کو بیان کرنا میرے بس میں نہیں۔ بہر کیف نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔

دوسری اہم بات اس تحریک کا پس منظر ہے۔ اس عالمِ اسباب میں تو علل ومعلول کا قانون ابدی معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً کچھ ایسے اسباب تھے جن کا نتیجہ ''لٹ خانہ'' کی تحریک کی صورت میں نکلا اور پھر اسے جنم دینے والی شخصیت کمال خان شیرانی اس پس منظر میں سب سے نمایاں ہے۔

1939 کا سال میرے لیے اس لیے اہم ہے کہ اس سال پہلی مرتبہ میری ملاقات کمال خان شیرانی سے ہوئی۔ اسے میں اپنی زندگی میں ایک حادثہ کہوں گا کیونکہ کمال خان سے ملنے کا تو میرا کوئی منصوبہ نہ تھا اور زندگی میں ایسے حوادث ہی واقعات اور حالات کا رخ بدل دیتے ہیں۔ مارچ کا مبارک مہینہ جس میں جشن نوروز منایا جاتا ہے، میرے لیے یقیناً ''نوروز'' ثابت ہوا۔ مارچ کا مہینہ میرے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ 1950 کو اسی مہینہ ''لٹ خانہ'' کی بنیاد پڑی۔

بات ہو رہی تھی میری ملاقات کی، کمال خان شیرانی سے...... تو جائے ملاقات تھی سنڈیمن ہائی سکول پشین............ایک (یعنی کمال خان) نمودار ہوا شمال مشرق سے کیسہ غر (کوہ

سلیمان) یعنی تخت سلیمان کے دامن سے............سبزہ زاروں اور دیو مالائی ماحول سے۔ اور دوسرا (یعنی میں) جنوب مغرب سے ۔ چاغی کے دشت بیابان اور ریگ زاروں کی سرزمین سے۔ اس سرزمین سے جہاں ریگستانوں اور کوہستانوں کا سنگم ہے۔ سرزمین بے آب وگیاہ مگر میرے لیے ایک مخصوص دلکشی اور حوصلے کا باعث............سنڈیمن ہائی سکول پشین واحد سرکاری ہائی سکول جہاں وظیفہ یافتہ طلبا کو داخلہ ملتا تھا۔ وہ سال کثرتِ باران کا سال تھا۔ ژوب اور چاغی کی راہیں سیلاب کی وجہ سے آب برد ہو چکی تھیں۔ ہم دونوں نے داخلہ لینے میں تاخیر کی۔ لہٰذا ہم دونوں کے لیے جنہیں سرکاری وظیفہ ملتا تھا، داخلہ مسئلہ بنا۔ کسی نہ کسی طرح یہ مسئلہ حل ہوا اور ہم دونوں ایک ہی کلاس میں بیٹھنے لگے۔ دونوں انتہائی دیہی اور قبائلی ماحول سے آئے تھے۔ تنہا پسندی اور شہری طلبا کی موجودگی میں احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ ان مسائل نے ہمیں قربت بخشی اور ہم دوست ہو گئے۔ اور ایسے دوست ہو گئے کہ ایک کا دوسرے کے بغیر گزارہ ناممکن ہو گیا۔ اسی رفاقت نے ہمیں خوش قسمتی سے اسلامیہ کالج پہنچایا، جس میں داخلہ لینے کا مشورہ ہمارے مہربان استاد محمد ہاشم خان غلزئی نے دیا تھا۔ کس قدر صحیح مشورہ دیا تھا۔ جس سے ہمارے مستقبل کی راہیں صحیح سمت متعین ہوگئیں۔ اسلامیہ کالج پشاور میں تو ہم دونوں اتنے قریب ہوئے کہ ساتھ ساتھ دو کمرے ہاسٹل میں ملنے کے باوجود ہم ایک ہی کمرے میں رہنے لگے اور دوسرے کمرے کو سٹور بنا دیا۔ ہماری اس ذہنی رفاقت نے کالج کے طلبا اور اساتذہ دونوں کو حیران کر دیا۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر کہیں بھی نہیں دیکھے جا سکتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے آئیڈیل ماحول اور دانشمندانہ اور پدرانہ شفقت سے پیش آنے والے اساتذہ نے ہمیں زندگی کا صحیح راستہ بتایا اور اس سے ہماری ذہنی پرورش خوش بختانہ نہایت خوبصورتی سے ہوئی ۔ گریجویشن ایک ساتھ کیا۔ اکٹھے سڑک کے راستے کوہ سلیمان کے دامن میں پہنچے۔ دیوتاؤں کی حسین وادی میں کمال خان کے گاؤں شنہ پونگہ میں رہے۔ میں کبھی کمال خان کو دیکھتا اور کبھی ان چٹانوں کو دیکھتا اور کبھی انسانوں کے اس سماج کو دیکھتا جو ہنوز بربریت کے سٹیج سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

ہمیں ملازمتیں بھی ایک ساتھ ملیں ۔ ہم دونوں نائب تحصیلدار ہوئے۔ ملازمت کے

دوران بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارہ مشکل تھا۔کمال خان مقناطیس کی مانند مجھے اپنے قریب کھینچ لیتا۔ پانچ سال کی ملازمت کے دوران دونوں نے محسوس کیا کہ ملازمت کو جاری رکھنا دونوں کے بس میں نہ تھا۔کمال خان کی آزاد منشی نے اسے ملازمت سے علیحدگی میں پہل کرنے کو آمادہ کیا۔ چنانچہ ملازمت سے علیحدگی کا منصوبہ تیار ہونے لگا۔اسی دوران مارچ کا مہینہ جو آغاز بہار کا مہینہ ہے،کوئٹہ میں جا بجا رنگ بہ رنگ بے پناہ کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ہم دیگر ہم خیال نائب تحصیلدار احباب کے ساتھ کوئٹہ میں اکٹھے ہوئے۔ جائے رہائش کی ضرورت پڑی۔ پہلے ہی ایک دوست نائب تحصیلدار نے بلوچی سٹریٹ میں ایک خوبصورت Hut (ایک ہی کمرے کا مکان) کرایہ پر لیا تھا۔کرایہ بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔شاید ماہانہ دس روپیہ۔ہم نے وہاں ڈیرہ ڈال دیا اور سوچنے لگے مستقبل کے بارے میں،اوراس طرح سے یہ جگہ مستقبل میں ''لٹ خانہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

قارئین! مجھے حکم ہوا کہ اس داستان کو قلمبند کروں تو سنیئے لٹ خانہ کی داستان......

ماہنامہ ''نوکیں دور'' کوئٹہ۔مارچ 1991

۲

مارچ کا مہینہ تھا۔ میں اور کمال خان ایک مرتبہ پھر وادیِ شال کے پر رونق شہر کوئٹہ میں اکٹھے ہوئے۔حسب دستور بلوچی سٹریٹ میں اپنے نہایت ہی مخلص دوست ملک غلام حیدر خان کے مہمان خانہ میں ہم نے ڈیرہ ڈال دیا۔غلام حیدر خان نہایت ہی باوقار، وسیع القلب اور پُر مہر انسان تھے۔میر بہادر خان بنگلزئی کی وجہ سے ہمارا ان سے تعلق پیدا ہوا تھا اور ہمیشہ یہ تعلق برقرار رہا۔قارئین، اب اگر میں تفصیل سے ہر دوست، ہر واقعہ اور ہر شے کے بارے میں لکھوں تو داستان نہایت ہی طویل ہوگی۔البتہ اپنا ارادہ ہے کہ اگر زندگی نے موقع دیا تو طوالت کی پرواہ نہ کر کے سب کچھ یا جہاں تک ممکن ہوا اپنی یادداشتیں قلم بند کروں گا۔مگر یہ کام بھی پھر علیحدہ کروں گا۔اردو میں نہیں بلوچی میں۔تاکہ بلوچی پڑھنے والوں کا قرضہ چکا سکوں۔ بعد میں اگر لوگوں کو میری یادداشتوں سے دلچسپی ہوئی اور کسی دوست نے ہمت کی تو اسے اردو میں منتقل کر دے گا۔شاید یہ کام شاہ محمد ہی کو کرنا پڑے۔بہر کیف، سر دست اس داستان کا تعلق لٹ خانہ سے ہے۔کوئٹہ آنے سے قبل میں نصیر آباد میں تھا۔وہاں حیر دین منڈی میں سپلائی کا نائب تحصیلدار تھا۔سرکار کے محکمہ سپلائی کے

لیے اناج کی خریداری کی یعنی شال کی فصل کی پیداوار کاشت کاروں سے حاصل کر کے اور سرکاری ٹھیکیدار کے حوالے کرتے رہے۔ نصیر آباد کے علاقے میں کئی ایسی منڈیاں تھیں جنہیں انگریزی میں Procurement Centers کا نام دیا گیا تھا۔ میرے جیسے کئی نائب تحصیلدار اور دیگر محکمہ سپلائی کے اعلیٰ افسران ان مراکز میں کام کر رہے تھے۔ مارچ 1950 میں اس عمل کا خاتمہ ہوا اور ہم سب نے محکمہ سپلائی کے صدر دفتر واقعہ کوئٹہ میں رپورٹ کی۔ کمال خان ان دنوں (میرے خیال میں) گلستان کے نائب تحصیلدار تھے۔ انہوں نے جب ہماری واپسی کی خبر سنی تو کوئٹہ پہنچے۔

یہ یک وقت کئی نائب تحصیلدار کوئٹہ میں اکٹھے ہوئے۔ ویسے بھی ان نائب تحصیلداروں کے لیے کرنے کو کچھ نہ تھا۔ بس محکمہ سپلائی میں اپنی موجودگی کی اطلاع کرنی تھی۔ وہ بھی کئی دنوں بعد، ہر روز نہیں۔ صبح اکثر جناح روڈ کے قریب سٹینلے کیفے میں گپ شپ ہوتی اور کوئٹہ کی خوبصورت شاموں میں جناح روڈ کی سیر کرتے۔ یہ تھا ہمارا معمول۔ چونکہ کوئٹہ میں قیام نے طوالت اختیار کی۔ کب تک ہم ملک غلام حیدر خان کے مہمان خانہ میں رہتے۔ ہمیں قرب وجوار میں ایک رہائش گاہ کی تلاش تھی۔ ملک غلام حیدر کے گھر کے قریب بلوچی سٹریٹ کی کسی گلی میں ایک گھر کرایہ پر ملا۔ کرایہ بھی بہت کم تھا۔ میرے خیال میں دس پندرہ روپیہ ماہانہ۔ یہ ایک چھوٹے سے صحن میں باہر کی گلی اور سڑک کی زمین کی سطح سے کافی اوپر ایک Hut تھا۔ جسے بیوہ کا جھونپڑا یا انگریزی میں Widows-Hut کہا جاتا تھا۔ کوئٹہ میں ایسے کئی ہٹ کوئٹہ کے مشہور اور تباہ کن زلزلے کے بعد انگریزی دور تسلط میں جا بجا کھڑے کر دیے گئے تھے۔ کمال خان بھی اکثر و پیشتر گلستان سے آتے اور ہم سب اسی ہٹ میں رہنے لگے۔

کسے خبر تھی کہ یہ ہٹ ہماری مستقل رہائش گاہ بنے گی اور ہم، یعنی میں اور کمال خان اپنے مستقبل کے کیریئر کو جس کے لیے لوگوں کو کئی جتن کرنے پڑتے ہیں، یک لخت الوداع کہیں گے اور ہماری پیروی میں کئی نوجوان، نائب تحصیلداریاں اور دیگر ملازمتیں چھوڑ کر ہماری فکری تحریک میں شامل ہوں گے اور بلوچی سٹریٹ کے اس وڈو ہٹ کی بلوچستان کی فکری جدوجہد میں تاریخی حیثیت ہوگی جسے ''لٹ خانہ'' کی فکری تحریک سے یاد کیا جائے گا۔

ابھی ہم نے ملازمتوں کو الوداع کہنے اور مستقل طور پر اس ہٹ میں رہنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ مگر حالات ہمیں اسی جانب پہنچا رہے تھے۔ اس سے قبل کہ یہ بیان کیا جائے کہ کیسے ہم نے استعفے دیے اور نئی زندگی شروع کی۔ بہتر یہ ہوگا کہ مختصراً اس کا تمام پس منظر بیان کیا جائے۔

جیسا کہ تمہید میں کہا گیا، میرا کمال خان سے ابدی رشتہ تو جڑ چکا تھا۔ ہماری اس فکری اور شعوری رفاقت کی بنیاد اگرچہ سنڈیمن ہائی سکول پشین میں پڑی تھی۔ مگر اسے مستحکم کرنے میں اسلامیہ کالج کے علمی اور فکری ماحول اور وہاں کے مہربان اور انسان دوست اساتذہ نے ہم میں نئے خیالات اور شعور کو جنم دے کر اہم رول ادا کیا تھا۔ اسلامیہ کالج ہی میں ہم نے نئی دنیا کی فکری جدوجہد کے بارے میں سنا اور پڑھا۔ علم اور سائنس کی ترقی اور اس کے اثرات انسانی سماج پر کیسے پڑے ہیں، پڑھا تھا۔ اگر علمی درس گاہ کا مقصد نوجوانوں کو شعور دینا اور ان کے مستقبل اور ان کو آنے والی ذمہ داریوں کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے تو اسلامیہ کالج پشاور ان مقاصد کے لیے ہمارے لیے بہترین تربیت گاہ ثابت ہوا۔ کمال خان میں جو ذہنی استعداد اور قابلیت موجود تھی، اسلامیہ کالج کے ماحول اور اس کے قابل اور مہربان استادوں کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہوا، وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس طرح کمال خان ذہنی طور پر ابھرنے لگے اور کالج میں انہیں شہرت حاصل ہونے لگی۔ میں جو کمال خان کا اٹوٹ انگ بن چکا تھا۔ یقیناً اس ذہنی نشوونما سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

میرے لیے یہاں اس تمام ذہنی تبدیلی اور اس پر اثر انداز اسباب کے لیے تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔ البتہ اتنا میں ضرور کہوں گا کہ آنے والے حالات اور واقعات کے اسباب میں اس سب کچھ کا بڑا دخل ہے اور لٹ خانہ کی فکری تحریک کو رخ اور سمت دینے میں اس کا بڑا اثر اور عمل تھا۔

ماہنامہ ''نوکیں دور'' کوئٹہ۔ جنوری/فروری 1992

۳

نوٹ: لٹ خانہ پر لکھنے کا خیال برسوں سے تھا۔ اکثر احباب بزرگ اور روشن خیال احباب بلوچستان میں روشن خیالی اور ترقی پسندی کے فروغ کے لیے اس نوخیز مکتبہ فکر کی کہانی لکھنے کے لیے مجھے آمادہ کرتے رہے ہیں۔ مگر میری بے ہمتی ہمیشہ اس کام میں آڑے آتی رہی ہے۔ ''نوکیں دور'' اور ڈاکٹر شاہ محمد مری نے مجھے مجبور کر کے قلم ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ مگر اب تو بے ہمتی کے علاوہ ذہنی اور جسمانی ناکامی اور بے مائیگی نے مجھے اور بھی ناکارہ بنا دیا ہے۔ نہ یادداشت میں ربط ہے اور نہ ہی خیالات میں روانی۔ ڈاکٹر شاہ محمد ہیں کہ مجھے کارآمد بنانے کے لیے مصر ہیں۔ مختلف طریقوں سے مجھے اس کہانی کو تحریر کی صورت دینے کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔ پیار اور محبت کے جواب میں انکار کرنا میرے بس میں نہیں۔ میری زندگی کا فلسفہ ہی جب محبت ہے تو اسے کیونکہ خلل پذیر ہونے دوں۔ اچھا تو ایسا ہی سہی۔ بہ امر مجبوری لکھوں گا جس طرح بھی ہو جیسا بھی ہو اور جس قدر بھی ہو۔

1950 کی بہار کا موسم تھا۔ مارچ اور اپریل کے مہینے وادی شال (کوئٹہ) کے خوبصورت ترین مہینے ہوتے ہیں۔ کوئٹہ ہر صبح رنگ بدلتا رہتا ہے؛ کبھی سرخ رنگ کا لبادہ پہنتا ہے تو کبھی ارغوانی اور کبھی سفید درختوں کی کونپلیں نکلنے کے ساتھ ساتھ شہر کے رنگ میں تغیر رونما ہوتا ہے۔

گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو سے بادِ نسیم عطر بیز ہو جاتی ہے اور کوئٹہ کی گلیوں کو معطر بناتی رہتی ہے اور جب درختوں کے پتے نکل آتے ہیں تو شہر اور گردونواح سبز پوش ہو جاتے ہیں۔ سبز، ارغوانی نرم و نازک پتے کوئٹہ کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

کمال خان نے لٹ خانہ کو خوبصورت بنانے کی ٹھان لی تھی۔ بیلچہ اور گینتی ہاتھ میں لیے ہمیں مکان سے باہر بوریوں میں مٹی اور سبز گھاس ڈھونے کے لیے آمادہ کیا۔ مکان کے آنگن میں انگور کی دو بیلیں تھیں۔ ان دو بیلیں کے بیچوں بیچ کافی جگہ تھی۔ اب تو انگور کی بیلوں کے سبز، نازک اور چوڑے پتے بھی نمودار ہو گئے تھے۔ کمال خان نے دونوں بیلوں کے درمیان میں نصف دائرہ کی صورت میں آنگن کی دیوار کے ساتھ دو کانچہ بنایا اور نصف دائرہ کے کناروں میں پھول لگانے کی جگہ کی تجویز پیش کی۔ اس طرح آنگن کی باقی دیواروں کے ساتھ ساتھ پھولوں کی کیاریاں بنانے کا مشورہ دیا۔

صبح ہم شہر جاتے اور شام کو لٹ خانہ کو خوبصورت بنانے کے لیے کمال خان کے منصوبوں پر کام کرتے۔ گلی میں آس پاس کے لوگ نائب تحصیلداروں اور تحصیلداروں کی ان غیر معمولی اور غیر منصبی مصروفیات کو دیکھ کر حیران ہونے لگے۔ صبح تو ٹائی لگا کر تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہو کر نکلتے اور سہ پہر اور شام کو بوریوں میں گھاس اور مٹی ڈھوتے۔ یہ عجیب مخلوق بلوچی سٹریٹ میں کہاں سے آ کر بسی۔ کمال خان تو نہایت ہی مغربی تھے۔ تھری پیس سوٹ کے ساتھ پائپ کا بھی شوق فرماتے تھے۔ نہایت ہی قیمتی تمبا کو استعمال کرتے جس کی خوشبو ہی پاس کے لوگوں کو متاثر کرتی۔ یوں تو سینٹ اور خوشبودار کریم بھی استعمال کرتے۔ ہم سب نہایت ہی خوش پوش اور خوش خوراک اور خوش باش لوگ تھے۔ جب بھی موقع میسر آتا؛ ساتھ رہتے، پکنک کے لیے شہر سے باہر جاتے اور پہاڑوں میں شکار کھیلنے کے پروگرام بناتے۔ غرض پوری جوانی تھی اور اس سے لطف اندوز ہوتے۔ مگر ذہن میں کچھ مستقبل کے بارے میں سوچنے کا سودا تھا۔ کالج ہی کے زمانے میں کمال خان، بہادر خان اور میں نے اپنے لوگوں کے بارے میں اپنے سماج کو سدھارنے کے بارے میں سوچا تھا۔ ادب، فلسفہ، تاریخ اور سوشلزم نے فکری جہت دی تھی۔ برناڈ شا، برٹرینڈ رسل، تھامسن نے

فکری بنیادیں فراہم کی تھیں۔ ملک اور عالمی حالات نے ان بنیادوں پر عملی ڈھانچہ کھڑا کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ سیاست، ادب اور فلسفہ نے ایسی فکر دی کہ سرکاری ملازمت سے بیزاری پیدا ہوئی۔ نصیر آباد میں کچھ عرصہ رہنے کا یہ اثر ہوا کہ جاگیرداری استحصال، جس کے بارے میں کتابوں میں جو پڑھا تھا عملی صورت میں دیکھا۔ کسانوں کی تباہ حالی، سرکاری ملازمین کی رشوت ستانی، جاگیردار طبقہ کی من مانیوں کو بڑھاوا دینا اور غریب طبقہ کو پامال کرنا وہاں روزمرہ کا کام تھا۔ اُدھر چین میں انقلاب آیا، عالمی سیاسی صورت حال نے کروٹ لی۔ ہم جیسے فکری نوجوان ان حالات سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ابھی ''لٹ خانہ'' کا نام وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس ٹھکانے میں جس میں ہمارا بسیرا تھا۔ اس میں میرے اور کمال خان کے علاوہ عبدالرحمان سمالانی اور نوشیروان خان بھی رہا کرتے تھے۔ بعض اوقات محمد خان باروزئی بھی آتے۔ سب کے سب نائب تحصیلدار تھے اور بعد میں ملک عثمان کاسی بھی آنے لگے۔ ویسے ان کے علاوہ اور کئی نائب تحصیلدار ہمارے ہمراہ تھے؛ سردار خیر محمد ترین وغیرہ وغیرہ۔

اس دور میں بلوچستان کے ملازمین میں احساس محرومی کا جذبہ شدید تھا۔ ان کے برعکس بلوچستان کے باہر کے ملازمین کی یلغار تھی۔ پنجابی، سرحد کے پشتون اور ہندوستانی شامل تھے جنہیں مہاجر نہیں کہا جاسکتا تھا کیونکہ یہ تقسیم سے پہلے ہی ملازمتوں میں موجود تھے۔ بلوچستان سیکرٹریٹ میں ان لوگوں کا راج تھا اور انہیں بلوچستان کے ملازمین، غیر ملکی کہہ کر ان کی زیادتیوں کی داستانیں بیان کرتے تھے۔ مقامی لوگ اپنے آپ کو ''ملکی'' کہتے تھے۔ اور اس روزگار کی تفریق نے کوئٹہ شہر کیا بلوچستان بھر میں ملکی اور غیر ملکی دھڑوں میں لوگوں کو بانٹا تھا۔ سرکاری ملازمین اس مناسبت سے اپنے فریق کے دیگر شعبوں کے افراد کی پذیرائی کرتے تھے اور اس صورت حال نے بلوچستان کی سیاست کو جنم دیا تھا۔ بلوچستان کے ملازمین نے اپنے آپ کو ''لوکل ایسوسی ایشن'' گویا ''ملکی ملازمین کی انجمن'' سے منظم کرنا شروع کیا تھا۔ اس وقت تک بلوچستان میں نسلی تفریق کا وجود نہ تھا۔ سب کے منہ سے پنجابیوں کی زیادتیوں کی باتیں سنی جاتی تھیں۔ بلوچستان کے لوگوں کا خیال تھا کہ تمام

ملازمتوں اور معاشی وسائل پر پنجابیوں اور غیر ملکیوں کا قبضہ تھا اور ملازمتوں میں ملکی نوجوانوں کو ہر طرح سے پست حوصلہ کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ غیر ملکیوں (پنجابی ملازمین) کے اس طرزِ عمل کا ہر ملکی نوجوان کو تلخ تجربہ ہوا تھا۔ تقسیم سے پہلے جب ہندو اور سکھ بلوچستان میں موجود تھے تب بھی ملازمتوں کے حوالے سے یہ گروہ بندی موجود تھی اور پنجابی، ہندو، سکھ اور مسلمان ایک گروہ میں تھے اور ملکی مسلمان اور ہندو دوسرے گروہ میں۔

کمال خان اور اس کے رفقا کے خیالات اگرچہ اب تک واضح نہیں تھے مگر اس طرح کے معاشی اور ملازمتی فکروں سے بہت مختلف تھے۔ ایک طرف تو وہ نئی دنیا کے علمی اور سائنسی نظریات کی پرکشش بلندیوں میں چکر کاٹ رہے تھے اور دوسری طرف انہیں بلوچستان بھر کے عوام کی ذہنی پستی، ناخواندگی اور غربت پریشان کر رہی تھی۔ پھر انہیں سرداروں، ملکوں، خوانین کی خود غرضیوں کا پتہ تھا۔ کیونکہ وہ سرکاری ملازمت میں رہ کر اس طبقہ کے رویوں سے بخوبی آگاہ ہو چکے تھے اور جانتے تھے کہ اس طبقہ اور بلوچستان کے مفلوک الحال عوام کے مفادات میں بہت تضاد ہے۔

زندگی کا نیا موڑ

بالآخر میں نے اور کمال خان نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم ملازمتوں سے علیحدگی اختیار کریں گے اور اپنے نئے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد شروع کریں گے۔ ہمارے اس فیصلہ میں بہادر خان بنگلزئی نے بھی شرکت کا اظہار کیا۔ سردار بہادر خان بنگلزئی جو اُس وقت میر بہادر خان کے نام سے معروف تھے، ہمارے اسلامیہ کالج پشاور کے سب سے گہرے دوست تھے۔ وہ ہر طرح سے ہماری فکر کے ساتھ تھے۔

کمال خان کی تجویز تھی کہ سب سے پہلے وہ احتجاج کے طور پر استعفٰی دیں گے۔ اس وقت تک میں اور بہادر خان بدستور ملازمت میں رہیں۔ اس کے بعد میری باری آئے گی اور بعد ازاں میر بہادر خان کی۔ اگرچہ ہم دو کو کمال خان کا یہ فیصلہ پسند نہیں تھا، ہم ان کے ساتھی تھے ہمیں ان کا بہر صورت ساتھ دینا چاہیے تھا۔ چونکہ ہم نے اسے رہبر تسلیم کر لیا تھا اور وہ اپنی رائے

منوانے کی خوب اہلیت رکھتے ، ہم نے ان کی تجویز مان لی۔ اس اہم فیصلہ کے بعد ہم پھر منتشر ہوئے۔ کمال خان ان دنوں گلستان میں نائب تحصیلدار تھے۔ وہ وہاں چلے گئے۔ میر بہادر خان تحصیلدار کوہلو تھے، وہ کوہلو چلے گئے اور میری نئی پوسٹنگ بطور نائب تحصیلدار جھٹ پٹ ہوئی تھی۔ کوئٹہ کا پر رونق شہر، پرفضا ماحول اور احباب کی دلکش محفلوں کو چھوڑ کر بادلِ ناخواستہ میں جھٹ پٹ کی جھلسا دینے والی گرمی کی جانب روانہ ہوا۔

اب ملازمت میں میرا جی نہیں لگ رہا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ کب کمال خان مجھے ملازمت کے عذاب سے نجات کے لیے حکم جاری کرے گا۔ ویسے میں نے اپنے محسن اور مہربان چچا، خان صاحب فقیر جان کو لکھا اور انہیں بتایا کہ میں نے ملازمت سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر دیا تھا اور ایسا کیوں کر رہا تھا، اس کے اسباب گنوائے تھے۔

شاید جولائی کا مہینہ تھا۔ اچانک کمال خان جھٹ پٹ آئے۔ ان کے ہمراہ ہمارے پرانے دوست خدائیداد خان تھے۔ خدائیداد جو بعد میں خدائیداد صاحبی کے نام سے مشہور ہوئے، پشین سکول میں میرے اور کمال خان کے سینئر سکول فیلو اور دوست تھے۔ وہ میٹرک کے بعد جنگ کے زمانے میں سگنل فورس میں بھرتی ہوئے تھے۔ جنگ کے دوران ہندوستان اور ایران کے کئی شہروں میں رہ چکے تھے۔ جنگ کے اختتام پر ان کی فورس فارغ کر دی گئی تھی اور وہ کوئٹہ میں ٹیلیفون اور ٹیلیگراف T&T میں دفتری کاموں میں لگے تھے۔ کوئٹہ میں پھر ہماری اس سے ملاقات ہوئی اور ہم خیال ہونے کے سبب کمال خان اور مجھ سے دوبارہ ان کا تعلق وواسطہ ہوا۔

خدائیداد سکول ہی کے زمانے میں بہت ذہین اور سنجیدہ طبعیت کے مالک تھے۔ جنگ کے دوران ان کو مختلف شعبوں میں کام کرنے کے سبب بڑا تجربہ ہو چکا تھا۔ ان کا ادب وفن سے گہرا لگاؤ تھا۔ کمال خان کو دیکھ کر ہی میں سوالیہ نشان بنا۔ ''بھائی اب میرا کیا بنا؟ میں کب تک ملازمت کی قید میں رہوں گا؟''۔ ان کے پاس مجھے سنانے کے لیے خوشخبری تھی۔

کمال خان نے ملازمت سے استعفیٰ دیا تھا۔ ساتھ ہی خدائیداد صاحبی نے بھی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ مگر کمال خان نے احتجاجاً ملازمت سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ ان کی ملازمت سے

علیحدگی کی خبر جب ''ملکی'' ملازمین کو ہوئی اور یہ پتہ چلا کہ وہ حکومت کو تفصیل سے اپنی ملازمت سے بیزاری کی وجہ تحریراً پیش کریں گے تو انجمن ملکی ملازمین کے اراکین ان کے اس ارادہ سے متفق ہوئے اور کمال خان نے سنایا کہ سب نے مل کر ان کے استعفیٰ کا مسودہ بنایا۔ اور اسے مرحوم محمد اکبر خان کاکڑ جو اس زمانہ میں جج تھے، نے انگریزی میں تحریر کیا۔ کمال خان خود انگریزی میں باکمال تھے اور ان کی تحریر نہایت زوردار اور رواں تھی۔ اس مسودہ کی انہوں نے کئی کاپیاں بنائی تھیں۔ حکومت کو استعفیٰ کے طور پر پیش کرنے کے علاوہ اس کی کاپیاں اس وقت کی مشاورتی کونسل کے چیئرمین جناب نواب محمد خان جوگیزئی اور صوبہ کے مشہور سیاسی مسلم لیگی شخصیت جو کونسل کے شاید سیکرٹری تھے، جناب قاضی محمد عیسیٰ خان کو بھیجی تھیں۔ یہ تاریخی دستاویز تھی۔ کاش کہ اس کی کاپی ہاتھ آتی۔ میں نے آج تک اسے نہیں پڑھا اور نہ ہی دیکھا ہے۔

چنانچہ اب فیصلہ یہ ہوا کہ میں ایک ماہ کی چھٹی لوں اور کوئٹہ جاؤں۔ وہاں چھٹی ختم ہونے کے بعد استعفیٰ دوں۔

کمال خان اور خدائیداد واپس کوئٹہ چلے گئے اور میں نے ایک ماہ کی چھٹی کے لیے درخواست دی۔ اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ نصیر آباد میرے افسر اعلیٰ تھے۔ ویسے بھی میرے طور طریقے ملازمین جیسے نہ تھے۔ وہ مجھ سے خوش نہ تھے۔ انہوں نے فوراً چھٹی منظور کر لی۔ خس کم جہاں پاک کے مصداق میں نے جھٹ پٹ چھوڑ دیا اور اس طرح ملازمت بھی چھوڑ دی۔

ماہنامہ ''نوکیں دوز'' کوئٹہ مئی 1992

۴

کوئٹہ پہنچا اور رفیقوں سے ملا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ نوشکی ہو کر آؤں۔ نوشکی میں میرے اہل خانہ موجود نہ تھے، وہ میرے سسرال گئے ہوئے تھے۔ اپنی اکلوتی ہمشیرہ سے ملا۔ ان سے اپنے پروگرام کے بارے میں بات کی۔ انہیں میری باتیں اچھی نہیں لگیں، نوکری چھوڑنے سے خوش نہ تھیں۔ بہرکیف انہیں خوش کرنے کی کوشش کی اور اپنے بلند عزائم کی خوبیوں کو بیان کیا۔ ان کے ذہن میں میری ایک بات بھی نہ آئی۔

چند روز والدہ محترمہ کے ہمراہ گزار کر واپس کوئٹہ پہنچا۔ میری چھٹیوں کا اختتام جب قریب ہوا تو استعفیٰ تحریر کرنے کا سوچا۔ کمال خان نے زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت کو رد کیا۔ کہا وہ تو سب کچھ ان کے استعفیٰ نامہ میں درج کیا گیا تھا۔ چنانچہ میرا استعفیٰ بھی کمال خان ہی نے چند سطروں میں تحریر کیا۔ اس میں بھی احتجاج تھا مگر مختصراً۔ اس طرح میں نے بھی سرکاری ملازمت سے چھٹی کی۔

ہماری قیام گاہ میں ہم تینوں کمال خان، خدائیداد اور میرے علاوہ میرے اور کمال خان

کے دو سرکاری اردلی بھی موجود تھے۔ کمال خان کے ساتھ محمد نور شیرانی میرے ساتھ فتح محمد منسلک تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ کیا کریں۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنی نوکری جاری رکھیں چنانچہ ان دونوں کو سرکار کے حوالہ کیا گیا۔

اب ہم تھے اور امورِ خانہ داری کی ذمہ داریاں تھیں۔ نائب تحصیلدار صاحبان نے گھر کا سب کام سنبھال لیا۔ کھانا پکانا، جھاڑو دینا وغیرہ۔ اچھا تو اب زندگی کو کیسی صورت دی جائے اور روزگار کیا ہو؟ خدائیداد خان کے گاؤں گلستان کے ایک دوست عبدالحلیم صاحب تھے، جس کی ایک دکان مسجد روڈ پر تھی۔ عبدالحلیم نہایت ہی شائستہ اور سنجیدہ انسان تھے۔ انہوں نے ہمارے پروگرام کی طرف غور سے دھیان دیا اور ہماری مدد کی۔ مسجد روڈ پر قیام پاکستان سے پہلے بہت بڑا بازار تھا۔ اس میں کاروباری تمام تر ہندو اور سکھ تھے۔ ان کے جانے سے دکانیں خالی ہوگئی تھیں۔ پنجابی اور پشتون کاروباری لوگوں نے ان دکانوں پر قبضہ جمایا تھا۔ عبدالحلیم جنہیں ہم اکثر سیٹھ کے لقب سے یاد کرتے تھے، ہمیں اپنی قریب کی دو دکانوں پر قبضہ کرنے کے لیے کہا۔ چنانچہ ہم نے آسانی سے محکمہ متروک جائیداد سے انہیں الاٹ کروایا۔ دن بھر ہم ان دو میں سے ایک دکان کو سنوارنے میں مصروف رہتے۔ رات کو اپنے ٹھکانے پہنچ جاتے اور رات گئے تک مکان کے اکیلے کمرے میں ایک کونے میں جہاں آتش دان تھا (کیونکہ کوئٹہ کی سردیاں ان دنوں جلد شروع ہو جاتیں اور ستمبر کے اواخر میں راتیں سرد ہو جاتیں) تینوں بیٹھ کر نئی زندگی کے بارے میں پروگرام بناتے۔

ایک رات یہ فیصلہ ہوا کہ ایک دکان میں سردست یعنی ''فی الحال'' سٹیشنری کی دکان لگائیں گے۔ ''فی الحال'' سٹیشنری خرید کر رکھیں گے۔ ''فی الحال'' سکول کی کاپیاں، تختیاں، قلم، پنسل وغیرہ وغیرہ۔ بار بار ''فی الحال'' کا لفظ دہراتے رہے۔ پھر سوچتے رہے کہ آخر اس اسٹیشنری مارٹ کا کوئی نام بھی تو ہو۔ کچھ طے نہ کر سکے۔ بالآخر کمال خان نے تجویز کی کہ اس کا نام ہی ''فی الحال'' سٹیشنری مارٹ رکھا جائے۔ مجھے اور خدائیداد کو بھی یہ نام پسند آیا۔ اس میں کمال خان کی ظریفانہ طبیعت کی چاشنی تھی اور جدت بدرجہ اتم موجود تھی۔ ہمارے دور کے بلوچستانیوں اور کوئٹہ کے باسیوں کی طبیعت کے عین مطابق نام تجویز ہوا۔

مگر ہمارے پاس پیسوں کی قلت پہلے ہی دن سے ہماری ہم سفر بنی۔ آخر ''فی الحال'' صاحب کو سٹیشنری مارٹ کی صورت کیسے دی جائے۔ کمال خان نے ذمہ لیا اور دو تین روز میں سات سو روپے لا کر ہمیں دے دیے۔ اس زمانے میں سات سو روپے میں کاروبار شروع کرنا ممکنات میں سے تھا۔ یہ رقم انہوں نے نصیب اللہ خان شیرانی سے حاصل کی تھی۔ میں نے شروع میں لکھا تھا کہ خدائیداد صاحب ہر فن مولا تھے۔ اب سب کچھ ان کے مزاج کے عین مطابق طے ہوا۔ ایک روز علی الصبح وہ ایک سرخ کپڑا اور ساتھ ہی سلور پینٹ خرید کر لائے۔ وہ مصور تھے اور خوشنویس بھی۔ فوراً دکان کا بینر تیار کیا اور ایک بورڈ بھی، جس پر تحریر تھا: ''فی الحال سٹیشنری مارٹ، مسجد روڈ''۔ مجھے یاد نہیں کہ اس بورڈ پر کسی پروپرائٹر کا نام بھی تھا کہ نہیں۔ بہت تیزی سے دوکان کو سجانے کا کام جاری تھا۔ خدائیداد بے حد سرگرم تھے۔ دوکان کے لیے شیلف بنوائے گئے۔ دروازے کے پاس ایک تختہ سا لگوایا گیا۔ تاکہ خریداروں کو چیزیں پیش کی جاسکیں اس تختے پر رکھ کر، اور ایک جگہ چھوٹا سا دخل کا بکسہ بھی بنایا۔ دو تین کرسیاں خرید لی گئیں اور پھر ہم دونوں نے جا کر سٹیشنری کا کچھ سامان خریدا۔ کاروبارِ حیات کو اس طرح سے صورت دی اور کام کا آغاز ہوا۔

نوجوانی تھی۔ طبیعت میں شوخی تھی اور کچھ بغاوت۔ خدائیداد صاحب نے سرخ کپڑے پر دکان کا نام لکھا اور سرخ جھنڈا گاڑ دیا۔ اس کے علاوہ اندر کہیں بہت خوبصورت تحریر میں نظیری نیشا پوری کا یہ شعر لکھ ڈالے:

گریزد از صف ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہِ ما نیست

جو بھی سڑک پہ گزرتا سرخ جھنڈے پر ''فی الحال'' سٹیشنری مارٹ پڑھ کر چونک جاتا اور اسے دوبارہ گھور گھور کر مسکرا دیتا۔ اگر دیکھنے والا اور پڑھنے والا واقف ہوتا تو وہ فوراً ہمیں پا کر دکان آ جاتا، حیرانی کا اظہار کرتا، کہ کل کے یہ بڑے فیشن ایبل لوگ آج یہاں کیا کر رہے ہیں۔ ہماری زندگی کے طریقے بالکل بدلتے جا رہے تھے۔ یہاں ہماری گلی میں آس پاس کے لوگ بیشتر غریب طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بھی ہمیں دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ ہماری گلی میں ایک باغیچہ میں ایک

مزدور پیشہ رہتا تھا۔ وہ دن بھر جا کر روزانہ پر کام ڈھونڈتا اور شام کو لوٹتا۔ اس سے ہماری شناسائی ہوئی، کمال خان کو اس کی اور اسے کمال خان کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ رات کو ہمارے یہاں آتا اور اپنی دلچسپ سرگزشت سناتا۔ وہ اصل میں کچلاغ کا سنٹیا کاکڑ تھا۔ کچھ 'دم وم' (نشہ) بھی لگاتا تھا۔ رات کو انتہائی رواں پشتو میں اپنے حالاتِ زندگی بیان کرتا۔ اس کی باتیں سن کر ہم محو ہو جاتے۔ غریب، مزدور اور ایک عام انسان کی زندگی اس قدر قریب سے ہمیں کبھی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ ہمارے لوگ تلاش روزگار کے لیے عموماً سندھ کا رخ کیا کرتے ہیں۔ مذکور کا نام محمد غوث تھا (لیکن اب وہ بھی فوت ہو چکا ہے)۔ سندھ میں جس طرح وہ خرکاروں کے دام میں پھنس گیا تھا اور جو مظالم سہے تھے اور مکر (خرکاروں کا کیمپ) میں مزدوروں سے جس طرح ٹھیکیدار اور اس کے ایجنٹ سلوک کرتے تھے، محمد غوث ان تمام واقعات اور حالات کو اس طرح تفصیل سے بیان کرتا تھا کہ ہم اس کی ذہانت اور فن کارانہ صلاحیت پہ حیران رہ جاتے۔ یہ سلسلہ کئی راتوں تک جاری رہتا۔ کمال خان نے محمد غوث کے اس طرح کے بیان کا نام رکھا: ''بنڈل بیان''۔ بالآخر وہ دن بھی آیا جب ''فی الحال'' سٹیشنری کی طرح ہماری اس وڈو ہٹ Widow Hut کا بھی نام پڑا۔

اور وہ یوں کہ خدائیداد صاحب کے گاؤں کے ایک اور دوست نے ان سے ملنے کے لیے ہمارے ہٹ کا رخ کیا تھا۔ ان کا نام غنی خان تھا۔ وہ بہت دلچسپ اور خوش مزاج اور آزاد منش انسان تھا۔ تھا تو وہ گلستان کے اچکزئی خوانین طبقہ سے مگر وہ سب کچھ تیاگ چکا تھا۔ اپنے طبقہ کے بارے میں اس کی رائے اچھی نہ تھی اور اس پہ پرزور تنقید کرتا۔ غنی خان اچکزئی اکثر علی الصبح ہمارے یہاں آتا، ہم میں سے بیشتر بستروں میں پڑے رہتے۔ کم از کم خدائیداد تو دیر تک بستر میں دراز رہتے اور وہ ہمیشہ پیٹھ کے بل لیٹے رہتے۔ غنی خان جب بھی آنگن میں وارد ہوتے تو ہمیں بستروں میں لیٹے دیکھ کر زور سے کہتے ''سہ کواست لٹانو؟ چہ تر اوسہ لا پراتہ یاست'' یعنی ''بے غمو کیا کر رہے ہو جواب تک لیٹے ہوئے ہو''۔ اس لفظ ''لٹ'' جو پشتو کا ہے، کے معنی بے غم اور بے کار کے ہیں۔ وہ شخص جسے کسی ذمہ داری کا احساس نہ ہو، اسے لٹ کہا جاتا ہے۔ ہمارا تو ایسا کوئی پروگرام نہ تھا کہ ہم بے غم اور بے کار کہے جاتے، حالانکہ ہم نے ایک طرح اپنی آرام دہ زندگی ترک کر کے غموں کی

زندگی اختیار کی تھی۔ جب ایک گھر میں بہت سارے لٹ رہتے ہوں تو اسے ''لٹ خانہ'' ہی کہا جاتا ہے۔ خان غنی خان اچکزئی نے ہمارے گھروندے کو ''لٹ خانہ'' کا نام دیا۔ یہ نام بلوچستان کی ادبی اور سیاسی تاریخ میں یاد کیا جاتا رہے گا؛ جس کا قصہ راقم آپ کے لیے تحریر کر رہا ہے۔

ماہنامہ ''نوکین دور'' کوئٹہ، جولائی/اگست 1992

۵

نئی زندگی سے اب ہم آہستہ آہستہ مانوس ہوتے جا رہے تھے۔ جاڑے کا موسم شروع ہونے لگا۔ کوئٹہ کی خزاں بھی خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ لٹ خانہ میں انگور کی جو بیلیں تھیں، اس کے بڑے بڑے پتوں نے رنگ بدلنا شروع کیا۔ شہر بھر میں درختوں کے زرد لباس پہننے کی وجہ سے زردی اور سرخی مائل رنگت نے خوبصورت فضا کو جنم دیا۔ خصوصاً لٹن روڈ (جسے عام لوگ ٹھنڈی سڑک کے نام سے یاد کیا کرتے تھے) پر چناروں کے اونچے اونچے پیڑ نہایت ہی حسین لگ رہے تھے۔

میں اور خدائیداد روزانہ صبح فی الحال سٹیشنری مارٹ جاتے اور سورج ڈھلے واپس لٹ خانہ پہنچتے۔ نہ لٹ خانہ میں بجلی تھی اور نہ ہی فی الحال سٹیشنری مارٹ میں۔ اب تو لٹ خانہ ہمارا گھر تھا۔ گھر پہنچتے ہی امورِ خانگی میں مصروف ہوتے۔ برتن مانجھتے، سالن پکاتے اور داش سے روٹی لے آتے۔ ایک لیمپ تھا، اس میں مٹی کا تیل ڈال کر اسے روشن کرتے اور کھانے کے بعد پڑھنے میں مشغول ہو جاتے۔ مستری محمد غوث اور مسٹر عبدالرزاق میڈ راسی آ جاتے تو گپ شپ ہوتی۔ مسٹر عبدالرزاق بعد میں محمد غوث کی وجہ سے راجہ صاحب کے لقب سے معروف ہوئے۔

بعض اوقات جب کمال خان اور بہادر خان بنگلزئی موجود ہوتے تو محفل کا خوب مزہ آتا۔ اگر یہ سب نہ ہوتے تو لٹ خانہ میں خاموشی چھائی رہتی کیونکہ میں اور خدائیداد دونوں کم گو ہیں، اس لیے باتیں کم اور آہستہ ہوتیں۔

ان دنوں بہادر خان جواب تک میر بہادر خان بنگلزئی کے نام سے مشہور تھے، کوہلو کے تحصیلدار تھے۔ کمال خان کچھ مدت کے لیے ان کے پاس جا کر رہے۔

سردیوں کے شروع ہوتے ہی کوئٹہ کی آبادی گھٹنی شروع ہوتی۔ راتیں لمبی ہوتیں اور شہر بھر میں خاموشی چھا جاتی۔ نہ کوئٹہ اتنا پرہجوم تھا اور نہ اس میں اتنی کاریں، موٹر سائیکل اور رکشے ہوتے تھے۔ فی الحال سٹیشنری مارٹ میں ہمارا کاروبار کیا تھا؛ بس چند کاپیاں، تختیاں، سلیٹیں اور قلم کاغذ۔ ہم گھر آ کے بھی پڑھتے اور دکان میں بھی اکثر پڑھتے رہتے۔ اگر کوئی دوست راہ گزرتے ہمیں دیکھ کر گپ شپ کے لیے دوکان میں آ جاتا تو کتابیں بند کرتے اور ان سے گپ شپ میں لگ جاتے۔

ہمیں مطالعہ کا تو سکول کے زمانہ سے شوق تھا۔ تعلیم کے دوران یہ شوق اچھے استادوں کی بدولت اور بڑھا اور پھر ملازمت کے دوران بھی یہ شوق جاری رہا۔ انگریزی اور اردو میں مطالعہ کرتے۔ اب تو خدائیداد صاحب کے پاس پشتو کی کتابیں تھیں۔ ان کا بھی مطالعہ کرتے۔ ویسے میں تو اسلامیہ کالج پشاور میں بھی کمال خان کی وجہ سے اکثر پشتو پڑھتا۔ مگر اس وقت پشتو میں صرف چند کتابیں دستیاب تھیں۔ اب خدائیداد صاحب کے پاس بڑی اچھی کتابیں تھیں جو افغانستان میں شائع ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو تو مجھے بہت پسند آئیں۔ ایک کتاب تھی ''پشتانہ شعراء'' پروفیسر عبدالحئی حبیبی صاحب کی تالیف۔ یہ کتاب پشتو کلاسیکی شاعری اور شعراء سے متعلق تھی۔ پشتو تو مجھے بچپن ہی سے آتی تھی۔ پشین اور پشاور میں تعلیم کے لیے رہ کر اور پھر کمال خان کی رفاقت میں میں نے اس میں اچھی دسترس حاصل کی۔ اب خوب پڑھنے لگا۔ حبیبی صاحب کی کتاب کے علاوہ ایک اور اچھی کتاب گل محمد نوری کی ''ملی ھیندارہ'' تھی۔ اس میں پشتو کے فوک لور سے داستانیں یکجا کی گئی تھیں۔ یہ میری پسندیدہ پشتو کی کتاب ہے۔ پشتو کی یہ کتاب واقعی پشتون عوام کی زندگی اور مزاج کا آئینہ ہے۔

پشتو کی ان گراں مایہ کتابوں نے اور پھر کمال خان اور خدائیداد کے پشتو سے لگاؤ نے مجھ میں ایک جذبہ پیدا کیا اور وہ جذبہ تھا اپنی مادری زبان سے لگن کا جذبہ۔ مجھے خیال آیا کیوں نہ میں بلوچی اشعار کو یکجا کروں اور خود بلوچی میں لکھنا شروع کروں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

پہلی مرتبہ میں نے اس کام کا آغاز اُس وقت کیا جب میں تین چار روز کے لیے گاؤں گیا۔ وہاں میرا ایک غریب رشتہ دار تھا جو اکثر بلوچی کی قدیم شاعری سے اشعار سنایا کرتا تھا۔ اس کا نام تھا ''ناکو (چچا) غوث بخش''۔ میں نے ناکو سے گزارش کی کہ میں بلوچی اشعار کو اکٹھا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت خوش ہوا اور فوراً میری مدد کے لیے آمادہ ہوا۔ اس طرح میں نے بلوچی اشعار کو تحریری صورت دینے کا کام شروع کیا۔ پہلی نظم جو میں نے ناکو غوث بخش سے حاصل کی وہ حانی شے مرید سے متعلق ایک نظم تھی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اپنی کلاسیکی شاعری کا پتہ چلا اور اس کی خوبصورتی کا اندازہ ہوا۔ ناکو غوث بخش سے چند ایک اور نظمیں تحریر کیں اور واپس کوئٹہ لٹ خانہ پہنچا۔ اب میرے ذہن پر بلوچی قدیم شاعری کی دھن سوار ہوئی۔

لٹ خانہ میں ان دنوں پشتو اور اردو ادب کی دیگر کتابوں کے مطالعہ کے علاوہ میرے پاس ماکسم گورکی کی چند کتابیں تھیں۔ میں نے ان کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ کتابیں انگریزی میں تھیں۔ اردو کے توسط سے ترقی پسند ادب سے رابطہ پہلے ہی ہوا تھا۔ ماکسم گورکی کی، ترقی پسند ادب میں اہمیت کا پتہ چلا تھا۔ اب جب خود میں نے ان کی تخلیقات کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے گورکی کی تحریر نے بہت متاثر کیا۔ خود میرے ساتھی کمال خان اور خدائیداد بھی ترقی پسند ادب سے متاثر تھے اور ہم سب گورکی کی کتابوں کا مطالعہ کرتے۔

میں نے ارادہ کیا کہ گورکی کو اردو میں ترجمہ کروں کیونکہ اب تک میں بلوچی کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ نہ تھا۔ چنانچہ گورکی کا ایک کتابچہ My Interviews سے ایک انٹرویو کا ترجمہ کیا جو وہ امریکہ میں تیل کے ایک بادشاہ سے لیتے ہیں۔ یہ انٹرویو بہت ہی دلچسپ ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ کیا جو بعد میں روزنامہ امروز لاہور میں ''تیل کا بادشاہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

لٹ خانہ مطالعہ کے لیے بہترین جگہ تھی اور ہم اب اس سے پوری طرح استفادہ کر رہے تھے۔

گورکی کے مطالعہ نے زندگی کے بارے میں میرے رویہ میں بہت تبدیلی پیدا کرنی شروع کی۔ مجھے اپنا سماج طبقوں میں بٹا ہوا نظر آنے لگا۔ اب تو میں نے اپنے ماحول کو بھی اسی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا تھا، نصیر آباد میں منڈی کے کام کے دوران مجھے وڈیرہ اور کسان کی زندگی میں بے پناہ فرق کا تو اندازہ ہوا تھا۔ گورکی اب اپنی تحریروں میں میرے لیے اس کی تشریح کر رہا تھا۔

خیر دین منڈی میں ایک منشی، خالو تھے۔ اس سے میری بڑی دوستی ہوئی اور وہ میرے ہم خیال ہوئے۔ اب جب ملازمت چھوڑ دی تو ایک روز وہ فی الحال سٹیشنری میں آئے۔ ان کا تعارف میں نے خدائیداد سے کیا۔ خالو جن کا پورا نام عبدالخالق ہے اور ان کا تعلق کاسی قبیلہ سے ہے اور رہائش قلعہ کاسی کوئٹہ میں ہے۔ وہ ہمارے بہت ہی اچھے دوست ثابت ہوئے۔ ان کے ایک اور دوست ارباب جانو تھے (جواب وفات پا گئے ہیں) وہ بھی اکثر ان کے ہمراہ ہوتے۔ ان کا لٹ خانہ میں بھی آنا جانا شروع ہوا اور کمال خان سے بھی ملے۔ اتوار کو جب ہم فی الحال سے چھٹی کرتے تو وہ اکثر لٹ خانہ ہمارے پاس آ جاتے۔ اب محمد غوث مستری، راجہ عبدالرزاق میڈ راسی کے علاوہ خالو اور ارباب جانو کاسی ہمارے ہم نشین اور ہم خیال ہوئے۔ ارباب جانو ہم پر بہت مہربان تھے۔ اکثر ہمیں اپنے گھر واقع میکانگی روڈ جو لٹ خانہ کے قریب تھا، مدعو کرتے۔ وہ اچھے زمیندار تھے۔ ان کا گھر سکندر ہاؤس ان کے بڑے بیٹے کے نام سے منسوب تھا۔ ان کا بیٹا سکندر اس وقت چھوٹا تھا اور پڑھتا تھا۔ وہ ہم سب سے ملتے۔ اب ڈاکٹر سکندر بولان میڈیکل کالج کے محترم استادوں اور ڈاکٹروں میں سے ہیں۔ ان کی طبیعت اور مزاج میں لٹ خانہ کی چھاپ اب بھی نمایاں ہے۔

ارباب جانو ہمیں اپنے باغ بھی لے جاتے۔ غرض وہ لٹ خانہ کے اب بہترین مخلص احباب میں شمار ہوئے۔

لٹ خانہ کے قریب جام میر خان صاحب کا گھر تھا اور ان کے قریب جام نور اللہ خان کی فیملی تھی۔ میرا چونکہ بچپن سے ان دو گھرانوں سے تعلق رہا تھا اور نوشیروانیوں سے رشتہ تھا، اس لیے

ان سے تعلق لازمی تھا۔ پھر جام صاحب کی والدہ بی بی شاہ بی بی حیات تھیں۔ ان کی بہت ہی اہم شخصیت تھی۔ جام نور اللہ خان کی تو بلوچستان کی سیاسی دنیا میں جانی پہچانی شخصیت تھی۔ مجھ پہ مہربان تھے۔ یوسف علی خان، عبدالصمد خان کے معتمد ساتھیوں میں سے تھے۔ اگرچہ وہ سول سروس میں رہے، بڑا مقام پایا مگر بلوچستان میں پڑھے لکھے طبقہ میں بہت مقبول تھے۔

جام نور اللہ خان کی والدہ بی بی شاہ بی بی کی وجہ سے خاران کے غربا، ان کے مکان کے اردگرد ان کی خالی زمین پر جھگیوں میں رہائش پذیر تھے اور دن بھر محنت مزدوری کرتے اور بی بی شاہ بی بی کے زیر سایہ وقت گزارتے تھے۔ بی بی شاہ بی بی ہر لحاظ سے ان کا خیال رکھتی تھیں۔ بی بی شاہ بی بی بہت عمر رسیدہ اور نابینا تھیں مگر ان کی شخصیت بے حد متاثر کن تھی اور وہ خود بے حد باہمت خاتون تھیں۔

بی بی شاہ بی بی کے قریبی رشتہ داروں میں ایک نوجوان محمد اکبر نوشیروانی تھے۔ وہ زیادہ لکھ پڑھ نہ سکے اس لیے انہیں محکمہ سپلائی میں چپراسی کی ملازمت ملی تھی۔ انہیں بھی ہم سے بڑا انس ہوا۔ وہ بھی اکثر لٹ خانہ آتے۔ کمال خان کی پرکشش شخصیت سب کو متاثر کرتی۔ جو ایک مرتبہ لٹ خانہ آتا تو ذہنی اور جذباتی طور پر اس سے منسلک ہو جاتا۔

کمال خان، خدائیداد، بہادر خان سب ایسے انسان تھے کہ جن سے جو بھی لٹ خانہ میں ملا ان سے پیار کرنے لگتا۔

وہاں فی الحال سٹیشنری مارٹ میں اب کالج کے طلبا کے علاوہ دیگر دانشوروں کا آنا جانا شروع ہوا۔ ویسے ہم نے اپنی ترقی پسندانہ رجحانات کا شروع ہی سے اظہار کیا تھا۔ اس سے طلبا اور دانشوروں کا ہماری جانب متوجہ ہونا لازمی امر تھا۔ خدائیداد صاحب تو برملا اپنے نئے خیالات کا اظہار کرتے اور بعض اوقات خوب گرما گرم بحث بھی ہو جاتی۔

ایک روز خالو کاسی نے لٹ خانہ آ کر ہمیں بتایا کہ ایک ترقی پسند نوجوان کراچی سے آیا تھا، جن سے ہماری ملاقات ضروری تھی۔ کمال خان صاحب ان دنوں ہیڈ کوارٹر (لٹ خانہ) میں موجود تھے۔ عبدالخالق کاسی نے ہمیں اس نوجوان سے ملانے کے لیے سٹار ہوٹل میں بلایا تھا۔

سٹار ہوٹل موجودہ میزان چوک کے قریب قندھاری بازار کے شروع ہوتے ہی دائیں

جانب ہوا کرتا تھا۔ سٹار ہوٹل کے مشہور اور معروف مالک سید گل محمد شاہ آغا نوجوانی میں ہی فوت ہوئے تھے۔ اور اب ان کے کم سن فرزند فاروق ستار شاہ آغا نے ہوٹل کا کاروبار سنبھالا تھا۔ فاروق شاہ آغا نہایت ہی مخلص، مرنجان مرنج اور حساس انسان ہیں۔ ہم اکثر شام کو یا پھر چھٹی کے روز یعنی اتوار کو ان کے ہوٹل جاتے اور دیر تک وہاں بیٹھتے۔ ان سے ہم سب کی بڑی دوستی ہوگئی۔ یہ دوستی انہیں لٹ خانہ تک کھینچ لائی۔ اور وہ لٹ خانہ کے پرخلوص احباب میں شمار ہونے لگے۔ وقت مقررہ پر ہم تینوں (کمال خان، خدائیداد اور میں) سٹار ہوٹل پہنچے۔ عبدالخالق کاسی وہاں موجود تھے اور ان کے ساتھ ایک اور نوخیز جوان بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔ عبدالخالق نے ہمارا تعارف کرایا اور ان کا نام ہم سے متعارف کرتے وقت سید کامل القادری بتایا۔

سید کامل القادری صاحب تو پہلی ملاقات ہی میں ہم سے ایسے گھل مل گئے گویا برسوں سے ہم ایک دوسرے سے آشنا تھے۔ عمر میں تو بہت ہی کم تھے مگر فکر و خیال میں کافی عمر رسیدہ معلوم ہوئے۔ بس کمال خان ہی کا ان سے مقابلہ تھا اور ویسے بھی ہمارے مردِ گفتگو (Spokesman) کمال خان ہی ہوتے تھے۔

ایک دو روز ہی میں کامل القادری صاحب لٹ خانہ منتقل ہوئے اور ہمارے ساتھ رہنے لگے۔

کچھ روز رہنے کے بعد پھر شاید کراچی چلے گئے۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ ان کے لیے حرکت کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی اور ان کے طور طریقوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خدا کی اس بستی میں وہ تن تنہا وارد ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کے کسی رشتے دار کا ہمیں آج تک پتہ نہ چلا، سوائے ان کے احباب کے۔ وہ انتہائی سیماب صفت انسان تھے۔

کامل القادری کی لٹ خانہ میں اس ناگہانی ورود نے اسے نیا رخ دیا۔ جسے میں اب آپ کے لیے تفصیل سے تحریر کروں گا۔

ماہنامہ ''نوکیں دور'' کوئٹہ، ستمبر، اکتوبر 1992

۶

سردیوں کا موسم پہلے وقتوں میں کوئٹہ میں عجیب طور پر بسر ہوتا تھا۔ شہر کی آبادی بہت کم ہو جاتی۔ شہر میں چہل پہل بہت کم رہتا اور بازار بہت جلدی بند ہوا کرتا۔ جب چلہ تر (گیلا سرما) شروع ہوتا تو لوگ یا تو کپڑوں کے لیے کباڑی مارکیٹ میں کہنہ فروشوں کے پاس نظر آتے یا پھر بوری بغل میں دبا کر کول ڈپوؤں کی تلاش میں مارے پھرتے۔ کیونکہ کول ڈپوؤں کے پاس بھی کوئلہ نایاب ہو جاتا بارش اور برف باری کی وجہ سے کول مائنز کے راستے بند ہو جاتے۔ گویا کوئٹہ کی سردی بہت ہی دشوار ہوتی۔ بیشتر لوگ سبی، ڈھاڈر، کچھی اور جیکب آباد کا رخ کرتے۔ یہاں تک کہ تانگے والے بھی آپ کو درہ بولان میں انہی علاقوں کا رخ کرتے دکھائی دیتے۔ کوئٹہ کا مشہور اور مقبول تانگے والا مہربان بھی نامہربان ہو جاتا اور کوئٹہ کو داغِ فراق دے کر سبی چلا جاتا۔

میں اور خدائیداد صبح دیر سے 'فی الحال' چلے جاتے۔ ویسے بھی خدائیداد بہت دیر سے اٹھتا کمرے میں آگ کا تو کوئی بندوبست نہ ہوتا۔ بس چائے باورچی خانہ میں بنا کر پی لیتے اور چلے جاتے۔ ان دنوں میرا چچا زاد بھائی عبدالقیوم جان بھی ہمارے ساتھ لٹ خانہ میں رہتا تھا۔ وہ سکول

میں پڑھتا تھا۔ امور خانہ داری میں وہ ہمارا بہت ہی مددگار تھا۔ ''فی الحال'' میں خدائیداد نے چھوٹا سا منگالہ کا بندوبست کیا تھا۔ اس میں یا تو لکڑی جلاتے، جسے جلا کر باہر رکھ دیا جاتا۔ جب چارکول جل کر انگارہ ہو جاتا تو اسے اندر لاتے۔ دو سٹولوں پر علیحدہ علیحدہ کتاب ہاتھ میں تھام کر سر لٹکائے ہوئے بیٹھ جاتے اور مطالعہ کرتے۔ ہمارے ہمسائے بھی بہت اچھے تھے۔ ان سے ہمیں بہت انس ہو گیا تھا، اور انہیں ہم سے۔ خدائیداد خان بہت نیک دل اور پرکشش انسان ہیں۔ آس پاس کے دوکاندار اُن کے بہت دوست ہو گئے۔ وہ بہت ہی خاموشی سے مذاق کر جاتے ہیں، جسے عوام الناس بہت پسند کرتے۔

ہمارے قریب میں ایک ترکھان کی دوکان تھی۔ اس کا مولا بخش نام تھا۔ وہ شکارپوری تھا اور اپنے کام میں بہت ہی ماہر تھا۔ بہت ہی خوبصورت فرنیچر بناتا۔ وہ تھوڑا تھوڑا افیون شاید کھایا کرتا۔ اس کا انداز گفتگو بڑا دلفریب تھا۔ خدائیداد سے بہت ہی پیار سے باتیں کرتا۔ ایک روز کہا، ''سائیں، ایک بڑا سیٹھ صاحب میرے پاس موٹر میں آیا بہت ہی پُرغرور انداز میں مجھے کہا میں ایک خاص قسم کا فرنیچر بنانا چاہتا ہوں تمہاری تعریف سنی ہے۔ کیا بنا سکو گے؟ مجھے اس سیٹھ صاحب کی بات بری لگی کیونکہ اس نے غرور کے انداز میں بات کی اور اس کا طریقۂ گفتگو غیر انسانی تھا۔ میں نے جل کر جواب دیا سیٹھ صاحب فرنیچر تو فرنیچر رہا میں آپ کو بھی لکڑی سے بنا سکتا ہوں۔ سیٹھ صاحب ناراض ہو کر چلا گیا۔ سائیں دیکھو تو سیٹھ کیسے لوگ ہوتے ہیں۔''

کوئٹہ کی رونق اجڑ رہی تھی۔ کیونکہ سال بھر کوئٹہ کی گلیاں علی الصبح سکول کے خوبصورت بچوں سے بھر جاتیں۔ رنگ برنگی وردیوں میں ملبوس یہ پھول جیسے بچے بچیاں خوش خوش سکول جاتے اور چھٹی کے وقت پھر شہر کو پر رونق بنا کر گھروں کو لوٹتے............ اب یہ رونق ختم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کیونکہ سردیوں میں سکول بند ہو جاتے۔ اس سے بھی کوئٹہ کی اداسی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ''فی الحال سٹیشنری مارٹ'' کو سجانے میں خدائیداد نے بڑی کوشش کی تھی۔ ''سرخ جھنڈے'' پر فی الحال سٹیشنری مارٹ سلور (silver) میں لکھ کر لٹکانے اور گاہکوں سے کاروبار کرنے کے سٹینڈ کے پیچھے خدائیداد نے بہت ہی خوبصورت خط میں نظیری نیشاپوری کا مشہور فارسی شعر لکھ دیا تھا، جس سے

ہماری باغیانہ فکر کی غمازی ہو جاتی؛

گریز داز صف ماہر کہ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شداز قبیلہ ما نیست

انہی اشعار سے علامہ اقبال نے متاثر ہو کر کہا تھا؛

بہ ملک جم نہ دہم مصرعہ نظیری را
''کسے کہ کشتہ نہ شداز قبیلہ ما نیست''

بلوچی کے نامور شاعر اور ادیب اور سیاسی شخصیت گل خان نصیر ان دنوں کوئٹہ میں مقیم تھے۔ گل خان نصیر کی شہرت سیاست کی وجہ سے تھی۔ اور اردو شاعری نے انہیں شاعر کی حیثیت سے متعارف و معروف کیا تھا۔ اب تک وہ بلوچی کے شاعر کی صورت میں نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ ان دنوں انہوں نے ایک اخبار کی ادارت و اشاعت سنبھال لی تھی۔ اخبار کا نام تھا ''نوائے بلوچستان''۔ یقیناً یہ نام گل خان نصیر نے رکھا ہوگا مگر اخبار مشہور بلوچ سرمایہ کار میر نبی بخش زہری کی ملکیت میں تھا، جو مسلم لیگی لیڈر تھا۔ گل خان نصیر اور میر صاحب کی رفاقت لوگوں کو کچھ عجیب لگ رہی تھی۔ ظاہر ہے مالک اور ایڈیٹر میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی حکمت عملی کے تحت یکجا رہنے کو گوارا کیا تھا۔ گل خان نصیر کا ٹھکانہ اور دفتر سٹینڈرڈ ہوٹل مشن روڈ میں تھا۔ چونکہ میرا اور نصیر صاحب کا تعلق ایک ہی علاقہ نوشکی سے تھا اور ملازمت سے علیحدگی نے میرے لیے ان کی دلچسپی پیدا کر دی۔ ملازمت کے دوران جب میں سبی میں تھا، ایک مرتبہ شاہی بازار سبی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ میر غوث بخش بزنجو، گل خان نصیر کے ہمراہ تھے۔ گل خان نے دیکھتے ہی مجھ سے پوچھا ''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے کہا ''محکمہ جنگلات میں ملازم ہوں''۔ ''افسوس ہے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان چند ہی تو ہیں اور وہ بھی سرکاری ملازمت میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ بھائی تمہیں قوم اور عوام کی خدمت کرنی چاہیے''۔ میر غوث بخش نے فوراً کہا ''نہیں بھائی ملازمت میں بھی خدمت ہو سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ سب نوکریاں چھوڑ دیں''۔

اب گل خان نصیر کو دیکھ کر مجھے وہ سب باتیں یاد آ گئیں۔ آخر کار ان کی بات پر میں نے

عمل کیا۔ ملازمت سے علیحدگی اختیار کی ۔ خدائیداد نے دوکان کے دروازے پر ایک بہت خوبصورت اور دلچسپ تصویر فریم کر کے آویزاں کی تھی۔ وہ ایک نہایت ہی حسین، صحت مند اور نیم برہنہ روسی خاتون کی تصویر تھی۔ اسے ہمارے پاس آنے والے ''سوویت یونین'' نامی ایک مجلّہ سے خدائیداد نے کاٹ کر فریم کروایا تھا۔ خاتون تصویر میں ڈسکس تھرو کر رہی تھی۔ یعنی ایک تھالی نما شے کو گھوم کر دور پھینک رہی تھی۔ خاتون کی تمام جسمانی حرکات بہت واضح تھیں۔ گل خان نصیر نے اعتراض کیا ''خواتین کو تمام مردانہ کھیل نہیں کھیلنے چاہئیں۔ صنف نازک اور مرد میں امتیاز فطری ہے، اس کا خیال رہنا چاہیے''۔ خدائیداد نے ان کے اس خیال کو رد کرتے ہوئے بحث کی۔

اسی دوران غلام محمد شاہوانی بھی ''فی الحال'' پہنچے۔ ان سے ہماری جان پہچان کافی پہلے سے تھی۔ گل خان نصیر نے انہیں دیکھ کر گلہ دیا۔ ''یہ دیکھئے، یہ نوجوان صحافی میرے ساتھ کام نہیں کرتا ہفت روزہ ''میزان'' میں کام کر رہا ہے۔ ،اسے چاہیے کہ ''نوائے بلوچستان'' میں میری مدد کرے''۔ غلام محمد شاہوانی نے جیسا کہ اس کی عادت تھی مسکرا کر بات ٹال دی۔ بالآخر کچھ عرصہ بعد غلام محمد شاہوانی ''نوائے بلوچستان'' کے نائب مدیر ہوئے اور گل خان کے رفیق کار بنے۔

سردیوں میں ایک تو عبدالقیوم کی خاطر اور پھر دکان میں کچھ کام نہ ہوتا، اس لیے میں اور خدائیداد جلدی لٹ خانہ لوٹتے۔ اب لٹ خانہ آنے جانے والے بہت ہوگئے۔ گلی کی مشرقی جانب نکڑ پر بلوچی سٹریٹ میں ''نگار پرویژن سٹور'' کے نام کی، پرچون کی دکان تھی۔ ضروریات کی خرید کے لیے اکثر ہم وہاں جاتے۔ دوکاندار انتہائی شریف اور ملنسار شخص تھا۔ نام اس کا ولی محمد رئیسانی تھا۔ اس سے ہماری بڑی اچھی دوستی ہوگئی۔ نہ صرف دوستی بلکہ وہ بھی اکثر لٹ خانہ آتا جاتا اور اس کی وجہ سے اس کے احباب اور دکان میں آنے والوں سے بھی جان پہچان ہوئی۔ ان سے بھی کافی دوستی ہوئی۔ عبدالکریم صاحب پوسٹ ماسٹر کے عہدے تک پہنچے اور ریٹائر ہوئے۔ ولی محمد صاحب آج کل چچا ولی محمد کے نام سے یونیورسٹی میں مصروف ہیں اور یونیورسٹی کے کیش برانچ میں کام کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ جام میر خان صاحب کے ملازمین بھی اکثر لٹ خانہ آتے۔ ان سے بھی بہت دوستی ہوگئی۔ محمد امین، مجید اور بچہ در (در محمد) ان سب کو لٹ خانہ نے اپنی جانب متوجہ کیا۔

ہماری گلی میں محمد عثمان ''کتا والا'' رہتا تھا۔ اسے اس لیے کتا والا کہا جاتا تھا کہ اس کا ایک کمرہ تھا جس میں وہ اور اس کا کتا رہتے تھے۔ وہ کتے کی بڑی خدمت کرتا تھا۔ بہت ہی صاف ستھرا کتا تھا محمد عثمان کا۔ وہ اس سے اکثر انگریزی میں بات کرتا۔ جو بھی اس کمرے کے سامنے سے گذرتا، محمد عثمان کو اپنے کتے سے باتیں کرتے سُنتا۔ محمد عثمان کوئٹہ میونسپلٹی میں ڈرائیور تھا۔ اور اس کا کام تھا شہر کے کچرہ کو میونسپلٹی کے ٹرک میں باہر لے جانا تھا۔ اس سے بھی لٹ خانہ والوں کی دوستی ہوئی۔ وہ کوٹ پینٹ پہنا کرتا تھا۔ انگریزی خوب بولتا۔ ویسے اس کا تعلق کرد قبیلہ سے تھا۔ مگر اسے براہوئی بولتے ہم نے بہت کم سنا۔ اکثر پشتو بولتا۔ معلوم ہوا کہ اس کی کچھ زمینات ہنہ میں تھیں، وہ اس سے چھن گئیں۔ رشتہ داروں نے چھینی ہوں گی۔ اب سوائے ملازمت کے اس کا ذریعہ معاش کچھ بھی نہ تھا۔ نہ ہی وہ شادی کر سکا۔ بس محمد عثمان تھا اور اس کا کتا۔ جب ڈیوٹی سے آتا تو کتے ہی سے باتیں کر کے وقت گزارتا۔ لٹ خانہ کے ساتھ ایک گھر تھا، جس میں شروع میں اے پی پی کے نمائندہ حسن اختر صاحب رہتے تھے۔ فیملی ساتھ تھی۔ جب ان کا تبادلہ ہوا تو اس مکان میں ایک اینگلو انڈین فیملی آئی۔ بوڑھے شوہر اور بیوی کے نوجوان بیٹے بیٹیاں تھیں۔ مگر بیوی کو بچوں سے زیادہ اپنے کتوں، مرغوں اور مرغیوں سے دلچسپی تھی۔ اکثر انہی کے ساتھ مصروف رہتی اور ان کے مسائل حل کرتی۔ بوڑھا مرد شراب نوشی میں مگن رہتا۔

اس تمام ماحول کے ساتھ لٹ خانہ اور لٹ خانے والوں کا رشتہ جڑ گیا اور رفتہ رفتہ تعلقات وابستہ ہوئے ہمسائیوں کے ساتھ۔ ان میں سے اکثر کی عقیدت مندی لٹ خانہ والوں سے ہوتی۔ اور وہ اپنے آپ کو لٹ خانہ سے وابستہ بتلا کر فخر کیا کرتے۔ کھانا پکانے کا کام اکثر خدائیداد کرتا۔ سودا لانا اور داش یا تنور سے روٹی لانا میرے ذمہ تھا۔ خدائیداد سالن بہت لگن سے تیار کرتا۔ اور ہم مزے لے لے کر کھاتے۔ خدائیداد بھی کیا خوب انسان ہے۔ ساتھ ہی ہر فن مولا ہے۔ مصور اور منور ہر کام سلیقے سے کرتا ہے۔ مگر نہایت ہی خاموشی سے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود، اسے کبھی بھی خودستائی میں مبتلا نہیں پایا۔ نہایت ہی ذہین اور مہربان انسان۔ ایسے محبوب کو کون بھول سکتا ہے۔ میرے لیے تو وہ عظیم ہے۔

ہمارے احباب میں دو اور نایاب شخصیتیں لٹ خانہ میں اکثر موجود ہوتیں؛ یہ شخصیتیں میر نوشیروان خان اور میر عبدالرحمان سمالانی کی تھیں۔ وہ ہر لحاظ سے ہمارے ساتھی تھے۔ اگرچہ انہوں نے ملازمتوں سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ دونوں نے بہت بڑے عہدوں پر ترقی کی اور ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ تمام دوران ملازمت میں ان کا نامہ اعمال بے داغ رہا۔

میر نوشیروان یا میر عبدالرحمان جب بھی کوئٹہ میں ہوتے تو ان کا ٹھکانہ لٹ خانہ ہوتا۔ میں شادی شدہ تھا۔ اور میرا ایک بچہ تھا۔ خدائیداد تو تمام عمر بنا شادی کے رہا۔ شادی کے بعد میرا پہلا بچہ بیٹا تھا۔ اس کا نام میں نے اپنے محبوب استاد کا نام مستعار لے کر رکھا۔ میرا اور کمال خان کا سب سے مہربان استاد، صاحب زادہ ادریس۔ وہ اسلامیہ کالج پشاور کے شعبہ اقتصادیات کے پروفیسر تھے۔ ہم دونوں کے ٹیوٹر بھی ادریس صاحب تھے جو ہمارے والدوں سے بھی زیادہ مہربان تھے۔ انہیں ہماری ہر بات کی فکر دامن گیر رہتی۔ پڑھائی کے علاوہ ہماری صحت کا بھی انہیں خیال تھا، تو اس سے بہتر نام میرے لیے کیا ہوسکتا تھا۔ اگست 1949 میں میرا بیٹا ادریس کا تولد ہوا۔ میں اور میری بیوی بے حد خوش ہوئے۔ بہت ہی خوبصورت، پیارا اور صحت مند بچہ تھا۔ بلوچی میں ایسے بچے کو کہتے ہیں تنگویں بچ (طلائی بچہ)۔ کیوں نہ ہوتا کہ میاں بیوی دونوں جوان اور صحت مند تھے۔ میری ملازمت سے علیحدگی کا میری بیوی کو بے حد ملال تھا۔ مگر ہماری عورتیں سب کچھ جی ہی جی میں سہہ لیتی ہیں۔ میری بیوی اپنے والدین کے پاس کچو، گئی تھی۔ کچو، ایران بارڈر پر زاہدان سے اٹھارہ میل اِس طرف ایک سرحدی پوسٹ ہے۔ بہت ہی خوبصورت جگہ ہے۔ میری بیوی اور میرا بیٹا ادریس اب گاؤں یعنی نوشکی پہنچ گئے تھے۔ مجھے اطلاع ملی تو خدائیداد سے اجازت لی اور نوشکی چلا گیا۔ بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ پھول کی طرح کھلا ہوا بچہ۔ سال ڈیڑھ سال کا بچہ۔ تین چار روز خوب اس سے جی بہلاتا رہا۔ اچانک بچہ بیمار ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مکھن یا موم کی طرح پگھلنے لگا۔ جوانی تھی اور مہم جویانہ خیالات۔ نوشکی زیادہ نہیں رُک سکا۔ لٹ خانہ اور ساتھیوں کے پاس پہنچنے کو فرض سمجھا۔ بیوی کو غم واندوہ میں چھوڑا اور لٹ خانہ لوٹ آیا۔

خیال تھا کہ بچہ ہے، یہ چھوٹی بیماریاں تو روزمرہ کی باتیں ہیں، ٹھیک ہو جائے گا۔

کسی نے بھی پھر مجھے بچے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ آخر خبر آئی کہ ادریس نے اپنی ماں کی پُر مہر گود کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہا ہے۔ جب گھر پہنچا تو بیوی سے آنکھیں چار نہ کرسکا۔ اس کی تو دنیا ہی تباہ ہو چکی تھی۔

ماہنامہ ''نوکیں دور'' کوئٹہ، نومبر 1992

۷

اب روزمرہ کی زندگی میں یکسانیت تھی۔صبح مسجد روڈ پر واقع فی الحال اسٹیشنری مارٹ چلے جاتے اور شام کوجلدی واپس ہوتے اور اکثر دوپہر کولٹ خانہ آ کر واپس دکان نہ جاتے۔دوپہر کو جب دھوپ ہوتی تو اکثر صحن کے دروازے کے قریب ایک طرف خدائیداد اور دوسری طرف میں کرسیاں لگا کر بیٹھتے اور دھوپ سینکتے۔گلی سے گزرنے والے ہمیں گھورتے اور ہم بیٹھے ہوئے انہیں دیکھتے۔''لٹ خانہ'' ان لوگوں میں اب تک معروف نہ تھا اور وہ اکثر اسے تحصیلداروں کے گھر کے نام سے یاد کرتے۔دوپہر کو خارانی بچے اور عورتیں شہر سے لوٹ کر آتے اور ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے سلام کرتے۔میرے ہم زبان ہونے کے ناطے اور میری جان پہچان کی وجہ سے وہ ہم سے بہت مانوس ہوئے۔ان میں ہر ایک کی بغل میں کچھ لکڑیاں ہوتیں جو وہ میکانگی روڈ کے نمبر ڈپوؤں اور آرامشینوں سے مانگ کر جلانے کے لیے لاتے۔کچھ بھیک مانگنے کے لیے شہر جاتے۔ان میں سے اَتو (عطا محمد) مشہور تھا۔اَتو نابینا تھا۔کبھی تو اس کی بیوی امبراتون (عمبر خاتون) یا کوئی بچی اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتی اور واپس لاتی۔وہ بھیک کا عادی تھا۔جمعرات کو تو یہ

لوگ جم غفیر کی صورت میں شہر جاتے کیونکہ بھیک مانگنے کا جائز اور قانونی دن یہی ہوتا ہے۔اتو کو کبھی بھی خاموش گزرتے نہیں دیکھا۔وہ متواتر بولتا جاتا۔اور دور سے اس کی آواز سنائی دیتی۔پتہ چلتا کہ اتو اور اس کے بھکاریوں کا کاروان آ رہا ہے۔

ایک دن ایسے ہی بیٹھے تھے کہ لٹ خانہ کے آگے ایک تانگہ آ کر رکا۔دیکھا تو ایک باریش صاحب اترے۔دو چھوٹے لڑکے ان کے ہمراہ تھے۔غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کمال خان ہیں۔سامان اتارنے میں، میں نے اور خدائیداد نے بڑھ کر ان کی مدد کی اور سامان اندر لے آئے۔ پتہ چلا کہ چھوٹا لڑکا میر بہادر خان کا صاحبزادہ ہے اور بڑا ان کا بھائی۔وہ ایک بہت بڑا کنستر (مٹی کے تیل والا) ساتھ لائے تھے۔مگر اس میں مٹی کے تیل کے بجائے بہت ہی مزیدار چیز تھی۔اور وہ بھی کھانے کی چیز۔کمال خان اور ان کے چھوٹے ہمراہ مری علاقہ سے آ رہے تھے۔یعنی سجیوں کی سرزمین سے۔سردار بہادر خان بنگلزئی اُن دنوں وہاں تحصیلدار تھے۔کمال خان نے وہاں جا کر ان کے پاس کافی دن گزارے۔اب ساتھ اس کنستر میں پورا دمبہ یا برہ قورمہ بنوا کر اس میں ڈلوایا تھا۔اب میرا اور خدائیداد کا کام آسان ہوا۔یعنی تیار سالن بس نکال کر گرم کرنے کی دیری تھی...... پھر ایسا لذیذ سالن اور کھانا کہاں میسر ہوتا ہے۔

کمال خان نے کوہلو کی اپنی سرگذشت بیان کی۔وہ مریوں سے بہت متاثر نظر آئے۔ خصوصاً مست توکلی سے جو بلوچی کے بے مثال عاشق شاعر اور مریوں کے بزرگ اور ولی تھے۔ میرے خیال میں شے مرید کے بعد بلوچی زبان کا دوسرا بڑا سچا عاشق اور مسحور کرنے والا شاعر مست توکلی ہے۔توکلی کا مریوں کے شیرانی قبیلہ سے تعلق ہے۔اس طرح کمال خان شیرانی کا رشتہ جڑ گیا تھا۔کمال خان نے لٹ خانہ اور فی الحال اسٹیشنری مارٹ کا جائزہ لیا۔ہماری حالت کا پتہ چلایا۔ ملاقات کی اور پھر عازم ژوب یعنی اپنی نگری ہوا۔چونکہ ابھی تک سردیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے سکول بند تھے۔سردار بہادر خان کے بھجوائے گئے بچے بھی واپس بھجوائے گئے۔ان کے نام عبدالسلام (بہادر خان صاحب کے بیٹے) اور ہدایت اللہ جو، اب حاجی بنگل خان کے نام سے پہچانے جاتے ہیں، سردار صاحب کے بھائی ہیں۔

اب پھر میں اور خدائیداد اور لٹ خانہ کے شب و روز۔ خوب مطالعہ ہو رہا تھا۔ میں ان دنوں میخائل شولوف کے مشہور عالم ناول Quite Flows The Don کا اردو ترجمہ پڑھ رہا تھا۔ اس ناول کا ایک ترجمہ اردو میں سید مطلّبی فرید آبادی نے ''بہتا دریا'' کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب گل خان نصیر سے ملی۔ اس کا مطالعہ کیا لیکن کتاب دو جلدوں میں علیحدہ علیحدہ چھپی تھی۔ اور مجھے صرف ایک جلد ملی۔ ناول بے حد پسند آیا۔ پھر کوشش کی تو اس کا دوسرا ترجمہ............'' اور ڈان بہتا رہا'' ملا۔ اس میں دونوں جلدیں یکجا تھیں۔ بس اس ناول میں کھو گیا۔ زندگی دلکش اور پرلطف معلوم ہونے لگی۔

روسی ادیبوں کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ زندگی کی حقیقی صورت پیش کرتے رہے ہیں۔ جتنا ان کا ملک وسیع و عریض ہے، اسی طرح ان کے ناول بڑے ہوا کرتے ہیں اور زندگی کو تفصیل سے بیان کر جاتے ہیں۔ منظر نگاری اور حسن کو بیان کرنے میں وہ لاجواب ہیں۔ ناول میں بیان کردہ ہر منظر آج تک آنکھوں کے سامنے ہے۔

کامل القادری پھر ڈبکی لگا کر دوبارہ کوئٹہ میں نمودار ہوئے تھے۔ کراچی سے آئے، چند روز رہ کر لاہور چلے گئے۔ ہمارے شب و روز میں کچھ تبدیلی آئی اور ان کے چلے جانے کے بعد ہم دوبارہ دو ہی رہے۔ رات کو مستری محمد غوث اور اس کے دوست راجہ مڈراسی آتے۔ وہ اپنے دن کے کارنامے بیان کرتے۔ ہمیں خوب خوب ہنسا کر چلے جاتے۔ ہم لٹ خانہ کا بڑا دروازہ یعنی صحن کا دروازہ بند کرتے۔ پھر اس واحد لمبے کمرے کا دروازہ بند ہو جاتا۔ اور ہم فرش پر اپنے بستر جو دن کو اسی فرش پر لپٹے ہوئے ایک کونے میں پڑے رہتے، بچھاتے اور بستروں پر لیٹ کر یا بیٹھ کر کتابوں پر سر جھکا لیتے۔ جب میں تھک جاتا تو سر اٹھا کر کمرے میں چاروں طرف دیکھتا۔ کونے میں انگیٹھی کی طرف نگاہیں اٹھ جاتیں تو خدائیداد کے کارنامے نظر آتے۔ انگیٹھی کے اوپر انہوں نے جون آف آرک کی نہایت خوبصورت تصویر آویزاں کی تھی۔ جون آف آرک فرانس کی ہیروئن اور آزادی کی دیوی بے حد خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس تصویر میں اس نے ہاتھ میں ایک علم بلند کیا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک اور تصویر چیکوسلواکیہ کے ہیرو جولیئس فیوچک کی تھی۔ وہ اپنی کال کوٹھڑی میں دیوار کے

ساتھ ایستادہ تھا اور نگاہیں روزنِ زندان کی طرف کی تھیں جو باقی دنیا سے رابطے کا واحد راستہ تھا۔ اسی روزن سے سلاخوں کے پیچھے اسے باقی جیل خانے کی کیفیت کا پتہ چلتا اور اسی روزن کے راستے وہ اپنی ذہنی کیفیات کاغذ کے پرزوں پر لکھ کر سمگل کرواتا۔ جو آخر میں ایک کتاب کی صورت میں نمودار ہوئے۔ اردو میں اس کتاب کا ترجمہ لٹ خانہ میں موجود تھا؛ ''پھانسی کے سائے تلے''۔ اسے ہم پڑھ چکے تھے۔ اور جب نگاہیں ان دو تصویروں پر پڑتیں تو زندگی کا حوصلہ توانا ہو جاتا اور ہم اس ڈگر پر چلنے کی تمنا کرتے جس پر جون آف آرک اور جولیئس فیوچک چلے تھے۔

رات ہر چند طویل ہو بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔ اب تو جنوری کا بھی خاتمہ ہو رہا تھا۔ ایک سال تو کب کا گذشتہ ہوا تھا۔ نئے سال نے نئے انداز سے جنم لینا شروع کیا تھا۔ یعنی 1950ء گذشتہ ہوا اور 1951 کی آمد ہوئی۔ کوئٹہ کے سرما کی طویل اور سیاہ راتیں اب چھوٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ ان میں زندگی کی نمو آشکار ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پوری کائنات نے جاگنا شروع کیا ہو۔ ہمارے جوان تن بدن میں بھی زندگی کی حرکت میں سرعت نمودار ہو رہی تھی۔ اور ہم نے نئے سال کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ یعنی فی الحال سٹیشنری کو سامان فراہم کرنے کا خیال آیا۔ مارچ میں کوئٹہ کے تمام سکول کھل جاتے ہیں۔ کتاب فروش کتابیں کاپیاں وغیرہ وغیرہ منگوا منگوا کر اپنی دکانیں بھر دیتے ہیں۔

فی الحال اسٹیشنری مارٹ کا کل سرمایہ ہی 700 سات روپے تھا اور اسی سے کاروبار شروع کیا تھا۔ اس سرمایہ کی آمدن کیا ہوئی ہوگی، اور اس میں سے کیا کچھ ہم نے کھانے میں خرچ کیا ہوگا؟ البتہ جو کچھ تھا، اس میں سے فروری کے وسط تک کچھ کاپیاں، سلیٹیں، تختیاں، ایسی ہی اور چیزیں سکول کے بچوں کے لیے بڑی دکانوں سے خرید کر فی الحال میں سجا لیں۔

اب فی الحال اسٹیشنری مارٹ میں آنے جانے میں بھی باقاعدگی شروع کی۔ پورا دن وہاں رہتے۔ سیٹھ حلیم، استاد مولا بخش اور کئی ہمسایہ دوکاندار کبھی کبھی آ کر ہماری خبر گیری کرتے اور گپ شپ ہوتی۔

غلام محمد شاہوانی صاحب نے تو ہم سے پوری دوستی شروع کی تھی۔ بالآخر گل خان انہیں

اپنے اخبار میں شامل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ غلام محمد شاہوانی اب ''نوائے بلوچستان'' کے معاون مدیر تھے۔ انہیں جب فرصت ملتی فی الحال اسٹیشنری مارٹ آ جاتے، خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتے اور فضا میں اپنے پرکشش اور مخصوص قہقہے بکھیرتے۔

ماہنامہ نوکیں دور کوئٹہ۔ جنوری/فروری 1993

۸

1951 کی پیش رفت کا سال ثابت ہوا۔ فکری، نظری، عملی اور ادبی پیش رفت کا سال۔ یوں تو لٹ خانہ کو ہمارے تصرف میں آنے کا ایک سال پورا ہوا تھا۔ کمال خان آتا اور پھر گھر چلا جاتا۔ خدائیداد کی رہائش کی مدت زیادہ تھی اور میں تو کوئی چھ ماہ سے لٹ خانہ میں رہ رہا تھا۔ اس دوران میں بھی گھر آتا جارہا مگر دنوں کے حساب سے گھر میں رہتا، مہینوں کے نہیں۔ گویا خدائیداد کے بعد میرا نمبر تھا لٹ خانے کے باسیوں میں۔ میر بہادر خان بھی جو اَب تک ملازمت میں تھے، لٹ خانہ کے عملہ میں شامل ہونے کے باوجود غیر حاضر تھے۔

فروری کا مہینہ تھا۔ بہار کی آمد تھی۔ پیڑوں کی ٹہنیوں میں تو اب کونپلوں کے آثار نظر آنے لگے۔ کوئٹہ میں ان دنوں اکثر لوگ نہال دکھائی دیتے ہیں۔ عام لوگ مشکلات اور مصائب کے باوجود زندگی سے کس قدر دلچسپی رکھتے تھے۔ کوئٹہ کے ہر گھر میں کوئی نہ کوئی پودا لگایا جاتا ہے۔ فروری کے آخر میں تو بادام کے شگوفے نظر آنے لگے۔ ویسے کوئٹہ والے کہتے ہیں کہ بادام کی کونپلوں کے پھوٹنے میں بڑی عجلت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اکثر بادام کی فصل مار کھاتی ہے۔ ذرا

گرمی ہوئی بادام کے شگوفے نظر آنے لگتے ہیں۔اور پھر ایک سردی کی لہر آئی تو یہ سب مرجھا جاتے ہیں۔کوئٹہ کی سردی کا کوئی اعتبار نہیں، جاتے جاتے لوٹ آتی ہے۔

ہمیں اب خیال آنے لگا کہ سردیاں تو گزر گئیں۔اب موسم کھل رہا ہے، آخر ہم نے تو کسی مقصد کی خاطر نوکریوں کو خیر باد کہا تھا۔اپنے بیوروکریٹک مستقبل کو چھوڑ دیا تھا۔لوگوں کی خدمت کرنی ہے۔سرکار کی غلامی سے بہتر ہے کہ اپنے عوام کی خاطر دکھ سہیں۔ان کا مستقبل سنوارنے کے لیے جدوجہد کریں۔سب ہمیں یہی کہتے تھے کہ یہ تو عقل مندی نہیں، بچپنا ہے۔زندگی کے نشیب وفراز سے ناواقفی ہے۔اللہ جانے؟ ہم تو کشتیاں جلا بیٹھے تھے۔اب چپ ہوکر بیٹھنے سے کیا فائدہ ہو۔

ویسے ہم نے جو کچھ پڑھا تھا، جو اچھے اور نیک دل استادوں سے سیکھا تھا، اس تمام کی ہمیں ہدایت تھی کہ اپنے لوگوں کی خدمت کریں، انہیں ترقی کی راہ سمجھائیں اور ترقی کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں۔کمال خان تو انہی خیالات میں مگن رہتا تھا۔وہ کبھی گھر جاتا رہتا، ماحول دیکھتا۔اپنے لوگوں کی جہالت، غربت اور بے بسی سے پریشان ہوکر لُٹ خانہ واپس لوٹتا۔میں اور خدائیداد بس کتابوں کی دنیا میں محو رہتے۔گورکی، کرشن چندر، نہ جانے کیسے کیسے ادیبوں کے ناول، افسانے اور شاعروں کے شعر پڑھتے اور زندگی کے بارے میں زیادہ پُر امید ہو جاتے۔اُدھر میر بہادر خان بار بار ملازمت سے علیحدہ ہونے کے لیے تیار ہوتے تو کمال خان منع کرتا؛ ’’ابھی نہیں، ابھی کچھ اور انتظار کیجیے......‘‘

مارچ کا رنگین، پُرفریب اور حسین مہینہ آ پہنچا۔کوئٹہ دلہن کی طرح خوبصورت ہوتا جارہا تھا۔ہر دوسرے تیسرے دن فضا نیا روپ دھار لیتی۔کبھی ارغوانی کبھی سبزی مائل، کبھی سفید اور پھر ایک دم سرخ۔سینٹ روزے، آڑو، خوبانی اور سیب کی بے پناہ کونپلیں نکل جانے سے فطرت رنگ بدل رہی تھی۔

پھر اچانک کوئٹہ کے کوچہ وخیابان پھول جیسے بچوں سے اور زیادہ حسین ہوگئے۔سکول ایک دم سے کھل گئے۔حسین و پیارے بچوں کے غول کے غول فی الحال اسٹیشنری مارٹ کے سامنے

سے گزرتے۔کیوں کہ آس پاس سکول تھے۔کوئٹہ کی سردیوں کی خاموشی کا خاتمہ ہوا۔پھول جیسے بچے اور بچیوں کے سرخ اور گلابی گال زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کی امنگ کو ان ننھے منے فرشتوں کے لیے حسین تر بنانے کے لیے ابھارتے۔بچے جو مستقبل کے لیے زندہ رہنے کا جواز ہیں۔یہ سب کچھ اب تک ہم نے سیکھ لیا تھا اور اس مقصد کے لیے ہم رفیقوں نے عجیب وغریب اور مشکل زندگی اختیار کر لی تھی۔

ہمیں خبر نہیں تھی کہ سید کامل القادری نے چپکے سے لُٹ خانہ کی سفارت کا کام سرانجام دینے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔انہوں نے پہلے کراچی جا کر اپنے ہم فکر لوگوں میں لُٹ خانہ اور اہلِ لُٹ خانہ کے حالات بیان کئے تھے اور پھر لاہور جا کر بھی یہی کچھ کیا تھا۔

اچانک ایک روز کامل القادری صاحب لاہور سے واپس لوٹے اور ان کے پاس ہمارے لیے بہت قیمتی تحائف تھے۔بڑی دلچسپ اور نایاب کتابیں۔یہ کتابیں اب تک ہماری نظر سے نہیں گزری تھیں۔اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ فی الحال اسٹیشنری مارٹ کے پتہ پر ایسی بہت ساری کتابیں آئیں گی۔انہیں آپ ریلوے سے جا کر چھڑوالیں۔یہ کتابیں زیادہ تر تو اردو میں تھیں مگر انگریزی میں بھی بہت ساری کتابیں تھیں۔ان کتابوں کو بھیجنے والا ملک کا مشہور دارالاشاعت پیپلز پبلشنگ ہاؤس لاہور تھا۔ان کتابوں کی بلٹی ہم نے چھڑوانی تھی۔

ہم جو علم کے پیاسے تھے، فوراً کتابوں کی طرف لپکے اور خوش ہوکر انہیں دیکھتے رہے۔اور باقی کتابوں کا بے چینی سے انتظار شروع کیا۔موسم اچھا ہوتا جارہا تھا۔کامل القادری بھی اب لُٹ خانہ میں رہنے لگے۔اور ہمارا وقت اب دکان اور مکان دونوں جگہ میں بہت ہی اچھا گزرنے لگا۔

دکان میں تو اب بچوں کا خوب آنا جانا شروع ہوا۔ان کی ضرورت کا سامان تو ہمارے پاس وافر نہ تھا، جو تھا وہ دے دیتے۔خدائیداد بہت ہی پیار اور عجیب انداز سے ان ننھے منے خریداروں سے بزنس کررہا تھا۔بزنس کیا کرتا تھا، جی بہلا رہا تھا۔

آخر کار ریلوے بلٹی ملی۔میں اور خدائیداد نے ریلوے سٹیشن جا کر پارسل حاصل کیے اور فی الحال اسٹیشنری میں پارسل کھول کر ان کتابوں کو ریکس میں سجا دیا۔

چند ہی دنوں میں اہلِ ذوق نے دکان کے اندر داخل ہو کر ان کتابوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ شروع شروع میں جب ریکس میں کتابوں کو دیکھتے اور ان کی پشت پر لینن، سٹالن، مارکس اور اینگلز کے نام دیکھ لیتے تو چونک جاتے۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے دلچسپی لینی شروع کی۔ اور ہمارے شہر میں یہ ایک اہم اور بڑی خبر بنی کہ فی الحال اسٹیشنری مارٹ میں مارکسسٹ لٹریچر فروخت ہو رہا تھا۔ حالانکہ ان کے ساتھ اردو ادب پر، اردو میں کئی کتابیں تھیں۔ ان کے خریداروں میں میں کوئٹہ کالج کیا کادکا اساتذہ کے علاوہ کالج کے طلبا شامل تھے۔

بالآخر سی آئی ڈی جو کمال خان کے احتجاجی استعفیٰ کے پلندہ کے بعد پہلے ہی ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھتی اور کمال خان کے بارے میں مشہور کر دیا تھا کہ کمیونسٹ تھا، اب باقاعدگی سے ہماری دکان لُٹ خانہ اور ہمارے سوا ہم سے ملنے جلنے والوں کو بھی واچ کرنے لگی تھی۔

لُٹ خانہ میں جو کتابیں ہم نے پڑھنے کے لیے علیحدہ کیں وہ نادر کتابیں ہمارے لیے نویدِ فکر ثابت ہوئیں؛ گناہ اور سائنس، انسان کا عروج، سماج کا ارتقا، خاندان ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز...... ان کتابوں کے مطالعہ نے تو ہماری فکر کی کایا پلٹ دی، زندگی کی حقیقتوں سے آگاہی دی...... اور سماج اور زندگی کچھ اور طرح سے نظر آنے لگے۔ 'انسان کا عروج' یہ کسی ایک کتاب کا ترجمہ تھا جسے سید سجاد ظہیر کی بیگم رضیہ سجاد نے کیا تھا۔ چند سال بعد سجاد ظہیر سے ملاقات ہوئی، جب وہ رہا ہو کر چند روز کوئٹہ میں رہے۔ یہ حصہ بعد میں کبھی بیان ہوگا۔ 'سماج کا ارتقا' بھی ترجمہ تھا جسے کلیم اللہ نے کیا تھا۔ خاندان ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز اینگلز کی شہرۂ آفاق علمی کتاب کا اردو ترجمہ تھا۔ یہ ترجمہ ماسکو میں کیا گیا تھا اور یہ وہیں کی اشاعت تھی۔ ان سائنسی کتابوں نے ذہن میں ایسا انقلاب پیدا کیا کہ اب تک یہ حقائق ذہن سے پیوست ہیں اور زندگی میں جو بچپن سے توہمات اور زندگی کے بارے میں غیر علمی فرض کی گئی توجیہیں موجود تھیں، انہیں نکال باہر کر دیا۔ غرض زندگی سے ہماری دلچسپی بڑھتی گئی۔ علم سے وابستگی میں اضافہ ہوا۔ اور ہم ایک خوبصورت اور روشن مستقبل کے بارے میں دن بہ دن پر امید ہوتے جا رہے تھے۔ جن لوگوں نے ہمیں تنقید کا نشانہ بنایا تھا یعنی ایسے لوگ جو محض اپنے لیے جیتے ہیں، وہ لوگ جن کا تصور اچھی زندگی کے بارے

میں یہ ہے کہ خوب پیسہ کمایا جائے، چاہے جیسے بھی ہو۔ ملازمت میں رشوت کے ذریعہ یا اوروں کا حق مار کر ترقی کر کے یا پھر کاروبار میں ناجائز طریقوں سے اور عوام الناس کو مشکل میں ڈال کر ان کو تباہی کی طرف دھکیل کر ناجائز دولت کما کر زندگی گزاری جائے۔ ان کی نگاہ میں اچھی زندگی کا تصور یہی تھا۔ وہ ہمیں ناکارہ انسان سمجھتے تھے۔

کامل القادری نے فی الحال اسٹیشنری مارٹ کا پتہ اپنے کئی ہم خیال لوگوں کو دیا تھا۔ چند روز بعد ہمارے لیے ایک اور بلٹی آئی۔ پتہ چلا یہ ایک ہفت روزہ اخبار کے پارسل کی بلٹی تھی۔ اب ہمیں ایسی بلٹیوں کو چھڑوانے میں کوئی تامل نہ تھا۔ بلکہ یہ تجسس تھا۔ ضرور کوئی اور کارآمد شے ہوگی۔ پارسل کھل جانے پر معلوم ہوا، اخبار کا نام ''اپنا وطن'' تھا جسے لاہور میں مزدوروں کا ایک اتحاد یہ شائع کرتا تھا۔ اس میں بڑی اچھی اچھی باتیں درج تھیں۔ عوام اور مزدوروں کی تنظیموں کی جدوجہد کے بارے میں جو ایسی ہی زندگی کی تلاش میں ہیں، جس کا تصور ہم نے قائم کیا تھا۔ پارسل کا مقصد ہمیں معلوم تھا۔ اسے اچھے لوگوں میں تقسیم کرنا جو ایک اچھے سماج کے آرزومند ہوں۔ تاکہ اسے پڑھ کر ان کے حوصلے بلند ہوں اور اچھی زندگی کی جدوجہد کو تیز کرنے میں ہم خیال ہو کر مددگار ثابت ہوں۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ کیسے اور کہاں اس اخبار کو بانٹا جاتا۔ کچھ کاپیاں تو کامل صاحب لے گئے اور کچھ خدائیداد نے اپنے احباب میں بانٹیں۔ اس کے توسط میں بھی ان سے متعارف ہوا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ خدائیداد ان لوگوں کو کب سے اور کیسے جانتا تھا۔ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ چند سال پہلے خدائیداد اور انجم قزلباش اور ان کے کچھ اور ساتھی ایسے کاموں میں ہمکاری کیا کرتے تھے۔ ان میں کچھ چھوٹے چھوٹے دکاندار، سکول ٹیچر اور کلرک شامل تھے۔

مجھے اب بہت خوشی محسوس ہونے لگی۔ اور کچھ اطمینان ہونے لگا کہ زندگی اب کارآمد ہوتی جا رہی تھی۔

ماہنامہ ''نوکیں دور'' کوئٹہ۔ مارچ/اپریل 1993

۹

بلوچستان اور قحط الرجال بہت زمانے کے ساتھی ہیں۔ دشوار اور بھیانک طرزِ زندگی انتہا پسند رجحانات کو جنم دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خانہ بدوش معاشرے میں موت زندگی کے پیچھے شکاری کتے کی طرح ناترس انداز میں بھاگتی ہے۔ پانی کی کمیابی خشک مزاجی کو جنم دیتی ہے۔ اٹھی ہوئی تلوار پشتوں تک نیام میں نہیں جاتی۔ خیر خواہی بزدلی تصور ہوتی ہے، علم حلم اور بردباری پنچ رجحانات تصور کیے جاتے ہیں۔ قبائلی شاؤنزم ایک امتیاز کی صورت جلوہ گر ہوتی ہے۔

ایسے میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو اگر مری قبیلے میں بس جائے تو مری کی خوش بختی ہو۔ مینگل میں ضم ہوجائے تو مینگلوں کا اعزاز ہو۔ پنجابی ہوجائے تو پنجاب کے پگ کا شملہ اونچا ہو، پشتون ہوجائے تو ان کی اونچی شخصیات میں اضافہ ہوجائے۔ میر عبداللہ جان جمالدینی مایوسی کے انھی گھپ اندھیروں میں امید کی مشعل ہیں۔ تعصّبات و ذہنی تحفظات سے پاک، ہر شخص کے ذاتی دوست ہیں۔ غیر جذباتی انداز میں باتوں کی چھان پھٹک کرتے ہیں۔ بچوں، بڑوں کے شفیق ساتھی ہیں۔ جمالدینی صاحب عورتوں کے طرفدار ہیں۔ ادیبوں کی صف کے ممتاز ممبر ہیں۔ وہ کئی

زبانیں جانتے ہیں۔ ہر زبان سے محبت کرتے ہیں۔ کلاسیکل ادب پہ عاشق ہیں۔ بلوچی زبان کے استاد ہیں۔ بہت اچھے لکھاری ہیں۔ وہ سیاست میں جمہوریت کے حامی ہیں اور مارکسزم کو مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔

میر عبداللہ جان جمالدینی نوکیں دور میں ''لٹ خانہ'' نامی سلسلہ لکھتے ہیں۔ یہ بہت مقبول عام سلسلہ ہے۔ اب تک اس کی آٹھ قسطیں چھپ چکی ہیں۔ اگلی قسط چند دنوں میں دینے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ میں نے ایک آدھ بار یاد دلایا کہ ''لٹ خانہ'' لیٹ ہو رہا ہے۔ جلدی دے دیں۔ وہ کسی بھی روز بیٹھ کر اسے لکھ ڈالنے کا مصمم ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔

مگر ایسا ہو نہ سکا۔ ایک روز خبر ملی کہ میر صاحب ہسپتال میں داخل ہیں۔ میں خوفزدگی کے عالم میں سپیشل وارڈ کے کمرہ نمبر 7 میں داخل ہوا اور کھڑے ہوئے لوگوں کو دھکیل کر اپنا راستہ بناتا ہوا عبداللہ جان جمالدینی کے پاس پہنچا تو انہوں نے اشکبار آنکھوں اور سخت ذہنی کرب کے ساتھ جو پہلا جملہ کہا وہ یہ تھا......

''تئ لٹ خانہ تہ بس...........سراتکہ''

(''تمہارا لٹ خانہ تو بس...........رہ گیا'')

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کا بایاں حصہ مفلوج ہو چکا تھا۔ منہ ٹیڑھا ہوگیا تھا، ایک آنکھ اچھی طرح بند نہیں ہوسکتی تھی۔ بات بہت چبا چبا کر نکل سکتی تھی۔ لعاب بغیر اختیار کے منہ کے بائیں کنارے سے رواں تھا۔ انتہائی بے بسی کی حالت تھی۔ سراپا اطاعت بنے ہوئے ان کے بڑے بیٹے جیئند خان نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے پوچھا ''اسے پہچان رہے ہیں؟''۔ ماما نے روتے ہوئے جواب دیا ''اشی، تہ بوءَ ہم پجھہ کاراں'' (اس کی تو خوشبو کو بھی پہچانتا ہوں)۔

میر عبداللہ جان جمالدینی کافی عرصہ سے بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔ ڈاکٹروں سے ہمیشہ علاج کراتے رہتے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے کبھی لاپرواہی نہیں کی۔ انہوں نے ایک ادبی وفد کے ہمراہ عوامی جمہوریہ چین جانا تھا۔ (وہ بلوچی اکیڈمی کے چیئرمین ہیں، پروگریسو رائٹرز

ایسوسی ایشن کے سرپرست ہیں، اکیڈمی ادبیات کے بزرگ ہیں اور ادبی تنظیم‘‘ ’’لوز چیدغ‘‘ کے سرپرست اعلیٰ ہیں)۔ان کا ارادہ تھا کہ وہ چین میں اپنے بلڈ پریشر کا علاج بھی کرائیں گے۔’’میں نے پوری زندگی سوویت یونین کو دیکھنے کے خواب دیکھے۔ چونکہ میں بہت عرصہ روسی رسالہ ’’طلوع‘‘ میں کام کرتا رہا اس لیے سوویت یونین کے ہر حصے کے بارے میں مجھے بہت معلومات تھیں۔ سوویت یونین تو غرق ہوگیا۔ اب چین ہی دیکھنے پر اکتفا کیا تھا مگر اب تو شاید کچھ بھی نہ دیکھ سکوں گا‘‘۔

میر عبداللہ جان کی بیماری نے ان کے احباب کے سارے پروگرام تتر بتر کردیے۔ ’’حبیب جالب کی فن اور شخصیت‘‘ پر ایک سیمینار منعقد ہونا تھا جو غیر معینہ مدت تک کے لیے ملتوی ہوا۔ کچھ دوستوں نے فیصل آباد جا کر معروف انقلابی راہنما جناب محمود احمد میاں کی ہمشیرہ کی وفات پر تعزیت کرنا تھا مگر کوئی بھی ہل نہیں سکتا تھا۔ میر صاحب کے دوستوں کی طرح خود انہیں بھی یقین تھا کہ فالج کا یہ حملہ جان لیوا ہے۔ لہٰذا ان کی یہ خواہش فطری تھی کہ جس قدر ممکن ہو زیادہ سے زیادہ دوستوں سے آخری ملاقات کرلیں۔ اور یوں ڈاکٹروں کی آرام کرنے کی ساری ہدایات بے سود رہیں۔ جس کی بھی آواز سنائی دی ماما نے اسے پاس بلانے کی فرمائش کرڈالی۔ ان کے دوستوں، عزیزوں، عقیدت مندوں کے گروہ آ جا رہے تھے۔ جسے خبر ہوئی دوڑا ہوا آیا۔ سارا شہر جیسے ہل کر رہ گیا۔ حالانکہ انہیں آرام اور سکون سے رکھنے کے لالچ میں ان کی بیماری کی خبر اخباروں کو نہ دی گئی۔ بیٹوں نے عیادت کے لیے آنے والوں کی لسٹ بنانے کی کوشش کی مگر کتنے لوگوں کے نام لکھے جاسکتے تھے۔ عبداللہ جان کے احباب کی لسٹ بنانا تو ان کے باپ کے بس میں بھی نہیں۔ لہٰذا دو چار صفحے لکھنے کے بعد انہیں عبداللہ جان کے احباب شماری کی مہم کو ترک کرنا پڑا۔

کوئٹہ میں مقیم میر صاحب کے دوستوں میں ڈاکٹر خدائیداد ان کے سب سے گہرے دوست ہیں۔ جب انہیں میر صاحب کی بیماری کی اطلاع دی تو ان کا سانولا سا چہرہ کولتار کی طرح کالا پڑ گیا۔ میں جب انہیں ہسپتال لایا تو انہیں دیکھ کر عبداللہ جان جتنی خوشی ظاہر کرسکتے تھے، ظاہر کرلی۔ کمرے میں موجود لوگ اپنے محبوب دوست کو اس بے بسی کی کیفیت میں دیکھ کر چوری چھپے، کونوں

میں جا کر آنسو بہاتے رہے اور ان کے سامنے سب نے خود کو بہت جبر کے ساتھ قابو میں رکھا ہوا تھا۔ مگر وہ سارے بند جناب عابد شاہ عابد نے توڑ دیے۔ شاہ صاحب پشتو زبان کے بلند پایہ ادیب ہیں، عبداللہ جان کے رفیق اور بہت شفیق انسان ہیں۔ سفید ریش اس لیے نہیں کہ ریش نہیں رکھتے۔ البتہ سفید سر ہیں، باڈی میں بھی ماشا اللہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ وہ خود کو روک نہ سکے اور جب دھاڑ مار کر رو دیے تو پھر کوئی آنکھ سلامت نہ رہی۔ بلوچستان میں مرد کے آنسو آنکھ کی سُبکی تصور کی جاتی ہے مگر شاید عبداللہ جان کے بستر کے قریب خشک آنکھ بے حسی اور پتھر دلی کا نشان ہوتی۔ اس شخص کی بیماری پر آنسو بہانا نیک دلی اور انسانی شرف کی نشانی ہے۔ محبتوں کا محور اور دوستیوں کا مرکز عبداللہ جان رو رہے تھے تو پھر کون چپ رہ سکتا تھا۔

میر صاحب کی شدید بیماری کا محض ایک فائدہ ہوا۔ خدائیداد خان کی سخت دلی اور درشت مزاجی کا بھانڈا پھوٹ چکا۔ حالانکہ وہ گپ شپ بہت اچھی کرتے ہیں، کھلکھلا کر ہنستے بھی ہیں۔ رنگین انداز اور رنگین مزاج ہیں، تقریر بھی اچھی کرتے ہیں مگر وہ ہر وقت غصے میں رہتے ہیں۔ باوضو ہو کر ان سے بات کرنا پڑتی ہے کہ نہ جانے کس بات پہ خفا ہو جائیں۔ آج کے دور میں دوستی نبھانی مشکل ہے۔ دوستی کی پرورش تو اور کٹھن کام ہے، خدائیداد کے ساتھ دوستی تو برداشت کرنی پڑتی ہے۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بلوچستان کی زبان میں ’’کسی کا چُرت نہیں مارتے‘‘۔ گذشتہ برس ان کا اپنا بھتیجا انتقال کر گیا تب بھی اس شخص کے چہرے پر آنسو نہ تھے۔ مگر یہاں عبداللہ جان کے سرہانے کھڑے اس کے آنسو بھی بغیر کسی فل سٹاپ کے رواں تھے۔ ساری درشتی، سخت مزاجی اور اکھڑ پن دھڑام سے زمین بوس ہوگئے اور ایک نارمل انسان، محبت کرنے والا آرٹسٹ ہسپتال کے کمرہ نمبر 7 میں کھڑا احباب کے ساتھ رو رہا تھا۔

ہم سب کی حماقت دیکھئے؛ بجائے تیمار داری کے اور مریض کا حوصلہ بڑھانے کے ہم مریض کے سنگ سنگ رو رہے تھے۔ جیسے وہ عزیز میاں قوال ہوں اور ہم ان کے ساتھی۔ ہر نئے آنے والے دوست کی معیت میں ہم پھر یہ محفلِ سماع شروع کرتے۔ رونا شاید صحت کے لیے بہت ضروری ہو! پھر شاید گریہ بسیار کی ایک وجہ پچھلے سالوں سے پے در پے ’’مجسموں‘‘ کا منہدم ہونا بھی

ہو۔اب اس پس منظر میں ہم ایک اور قیمتی زندگی کا زندہ مجسمہ کھو جانے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اور اس طرح اپنے دل کے گوشوں میں موجود سارے مجسموں کا پیار مل کر اس ایک مجسمے کے زندہ رہنے کی خواہش میں ڈھل گئے۔ بساط عالم میں فرد کی بے بسی کا اظہار آنسو ہی تو ہوتے ہیں۔ ماما کے آنسو تو ان کے بہتے لعاب کی طرح بے قابو لگتے تھے۔ہم بھی نامعلوم مسابقت کی حالت میں تھے۔ مارشل لا ختم ہوئے مہینے گزر گئے۔ وال چاکنگ ، پمفلٹ اور پوسٹر بازی ، سٹڈی سرکل ، دورے، قید اور ٹارچر کی ساری فضا میں رفیقانہ مسابقت کے عادی لوگ اب رونے کے ٹورنامنٹ میں شریک ہونے اکھاڑے میں اتر چکنے تھے۔ یہاں کوئی ریفری نہ تھا اور تماشائی بھی کوئی نہ تھا۔ یہ ایک انوکھی گیم تھی۔

عبداللہ جان کا پرزور اصرار تھا کہ ان کے یار کمال خان کو ژوب سے بلایا جائے۔ کمال خان شیرانی ان کے کلاس فیلو بھی تھے۔ طالب علموں کی مترقی تحریک میں ساتھی بھی تھے۔ ملازمت بھی ایک جیسی رہی تھی اور دونوں لٹ خانہ تحریک کے بانی اور راہنما تھے۔تحریک کب کی معدوم ہوگئی، ساتھی کب کے منتشر ہو چکے مگر دوستیاں اور دوستی کے لطیف احساسات ابھی تک استوار تھے۔ زیست وموت کی کشمکش میں پڑے ہوئے نوشکی کے لعل نے جس شخصیت کو سب سے زیادہ یاد کیا، وہ سائیں کمال خان شیرانی تھے۔ غیاث الدین ژوب میں میرے سیاہ پوست دوست ہیں۔ سائیں کا ان کے ہاں آنا جانا ہوتا ہے۔ ان کا بیٹا عزیزی رشتیامل انہی کے گھر میں رہ کر اپنی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ مگر غیاث کے پاس فون نہیں ہے، اس کے پڑوس میں بھی کوئی فون نمبر نہ تھا۔ لہٰذا میں اور ڈاکٹر خدائیداد جناح روڈ پر واقعہ سائیں کمال خان کی پارٹی (پشتونخواہ ملی عوامی پارٹی) کے دفتر سے کوئی رابطہ نمبر حاصل کرنے چلے گئے۔ میں طالب علمی کے زمانے میں اس پارٹی کے دفتر بہت جایا کرتا تھا۔ بعد میں بھی سائیں جب کوئٹہ آجاتے ہیں تو دفتر ان کے ساتھ یا ان کی تلاش میں اکثر آنا جاتا ہوتا ہے۔ آج بھی سائیں کی تلاش میں یہاں آئے مگر آج سائیں کو میں تلاش نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنے محترم بزرگ دوست کی خواہش کی تکمیل کر رہا تھا۔ دفتر میں سفیدی ہو رہی تھی اور اس دوپہر کے وقت بھی یہاں کافی چہل پہل تھی۔ پارٹی کی طالب علم ونگ کا کنونشن قریب تھا۔ ایک میز پہ ایک

نوجوان سے ژوب میں سائیں کا رابطہ نمبر لیا اور سیڑھیاں اترے۔ سائیں کو ماما کی شدید بیماری کے متعلق اطلاع بھجوائی اور انہیں کوئٹہ پہنچنے کی تاکید کی۔

اس دوران محبانِ جمالدینی نے اپنی ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ میں طے کرلیا کہ رونا دھونا یک دم بند۔ہم سب ماما کی ہمت بڑھائیں گے، ملاقاتیوں سے یہی درخواست کریں کہ وہ نہ صرف ماما کے رونے کی دھن کے ساتھ ان کا ساتھ نہ دیں بلکہ انہیں زیادہ سے زیادہ تشفی دیں، یہاں وہاں کی باتیں سنائیں اور ان کی توجہ بیماری سے ہٹائیں۔ اس طرح پُرعزم ہو کر ہم ان کی تیمارداری میں لگ گئے۔

ماما کی یادداشت بلا کی ہے۔ جس سے ملتے ہیں، اس کے والدین کا نام لے کر اس کی خیریت معلوم کرتے ہیں۔ وہ ہر جاننے والے شخص کا شجرۂ نسب جانتے ہیں، پیشہ اور عادات سے باخبر ہیں اور اس علاقے کے مشہور لوگوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ اس حالت میں بھی ہم نے دیکھا کہ وہ عیادت کے لیے آنے والوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرواتے ہیں۔ بیماری نے جیسے ان کی یادداشت کو مزید تیز کر دیا ہو۔

سردار بہادر خان بنگلزئی اپنے قبیلے کے سردار ہیں۔ شفیق اور مہربان انسان ہیں۔ سرکار دولتمند میں مقتدر ہونے کے باوجود اپنے دوستوں سے ملتے جلتے ہیں۔ چونکہ لٹ خانہ میں رہ چکے ہیں، اس لیے ان کے یار دوست یہی ''لٹ نما'' لوگ ہیں۔ لٹِ اعظم حبیب اللہ انہی کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ سردار صاحب عبداللہ جان کے جگری یار ہیں۔ میں نے فون کر کے جب انہیں ماما پر فالج گرنے کے بارے میں بتایا تو ان الفاظ میں ان کی چیخ سی نکلی: ''اللہ رحم''۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہسپتال پہنچے اور بتانے والوں نے بتایا کہ ماما کے بستر پر جھک کر انہوں نے صرف اتنا کہا، ''عبداللہ جان آپ میرے دوست نہیں آپ تو میرے بھائی ہیں'' اور پھر بنگلزئی قبیلے کا یہ سفید ریش سردار زار و قطار رونے لگا۔ ظاہر ہے کہ عبداللہ جان نے اس عملِ صالح میں ان کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا۔ کسی دوسرے کو روتے کو دیکھ کر دل بھر آنا شاید عالمگیر انسانی خصلت ہو۔ سردار بہادر خان روزانہ ہسپتال آتے، خیریت معلوم کرتے، کچھ گپ شپ کر کے چلے جاتے۔

ڈاکٹر خدائیداد کو روزانہ ہسپتال تک پہنچانے کا فریضہ میرا تھا۔ اگلے روز مقررہ وقت پہ انہیں لینے ان کے گھر چلا گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ باہر نکلے۔ میں نے انہیں ماما کے پاس چلنے کا کہا تو کہنے لگے'' چلیں گے، ذرا اندر تو آؤ''۔ ایک شخص اپنے گنجے سر کے ساتھ بہت انفارمل انداز میں پھولوں کو پانی دے رہا تھا۔ واسکٹ اتارا ہوا، ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس یہ چھوٹے قد والے شخص سائیں کمال خان شیرانی تھے۔ ہم پر جوش طور پر گلے ملے اس لیے کہ وہ the most wanted person تھے۔ ان کے لیے دوستوں نے جہاز کا ٹکٹ کیا تھا اور وہ دل میں خدانخواستہ نوشکی تک کا سفر کرنے کا طے کر کے ژوب سے چلے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ وہ اپنے یار کے آخری دیدار تک پہنچ نہیں پائیں گے۔ دور کی خبر کس قدر وحشت ناک اور اندیشے کس قدر مہیب ہوتے ہیں!۔ انہیں کوئٹہ آ کر معلوم ہوا کہ ماما بفضلِ خدا زندہ ہیں، یہیں کوئٹہ میں ہیں، لہٰذا سائیں کو ہسپتال جانے کی اب چنداں جلدی نہ تھی۔ خدائیداد نے بتایا کہ وہ گذشتہ روز دوپہر کا کھانا نہیں کھا سکے تھے۔'' دل کا فر نہیں کرتا تھا، مگر رات کو دیر سے گھر لوٹا تو چونکہ عبداللہ جان کی زندگی خطرے سے باہر پائی تو پھر میں نے دوپہر کے لیے پکائے ہوئے ٹماٹروں کی .... (موٹی سی گالی)''۔

بہرحال ہم سائیں کے ہمراہ ہسپتال پہنچے۔ سائیں سے راستے میں درخواست کی کہ اندر رونا نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے دبلے پتلے سے سینے کو تان کر پشتو زبان میں کہا کہ'' نہ بابا میں کہاں روؤں گا''۔ دو پیارے دوست چاہت سے ملے۔ ایک مفلوج تھا، بے بس تھا اور خواہش رکھتا تھا کہ اس کا محبوب دوست اس موقع پر موجود رہے۔ دوسرے کو یقین تھا کہ جب تک وہ کوئٹہ پہنچے گا اس کا عزیز ترین دوست اس دنیا میں موجود نہ ہوگا۔ اب دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر گویا جواں ہو گئے ہوں۔ ماما نے رونے کا ایک دور چلایا۔ سائیں بھی اشک کبار تھے مگر آنسو چھلکنے نہ دیے۔ (قبائلیت، منافقت کا دوسرا نام ہے۔ اس کی غیرت دکھاوے والی سرخی پاؤڈر کی دبیز تہوں کی لیپائی کا نام ہے)۔ سائیں کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ دُور سے دکھائی دیتی تھی۔ ان کا رواں رواں مسرت کے مناظر پیش کر رہا تھا۔ دونوں دوست نان سٹاپ گفتگو کرنے لگے۔ عبداللہ جان نے کہا'' سائیں

اب بس ہے، ٹھیک ہو جاؤں تو پھر لٹ خانہ چلائیں گے۔ وہی زندگانی اپنائیں گے''۔ یہ گفتگو عجیب گفتگو تھی۔ سائیں کمال خان بہرے ہیں اور عبداللہ جان کی بات بہت گڑبڑ، سوال گندم کا ہوتا تھا تو جواب میں برسات کی باتیں ہوتیں۔ جب سائیں کو اندازہ ہوا کہ وہ عبداللہ جان کی باتیں ٹھیک طریقے سے سن اور سمجھ نہیں پا رہے ہیں اور ان کے جوابات پہ ہم کھلکھلا کے ہنس رہے ہیں تو وہ اپنے روایتی ہاں ہوں سے کام لینے لگے، مگر عبداللہ جان کو تو باتیں کرنے کا گویا دورہ پڑ گیا تھا۔ لہٰذا سائیں کو ان کے قریب بیٹھنا پڑا۔ اُن دو قریبی دوستوں کی قربت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ عبداللہ جان فرطِ جذبات میں مجھ سے کہنے لگے،'' آج بھی میری عید ہے اور کل بھی۔ کل میری سالگرہ کا دن ہے۔ آج میری عید اس لیے ہے کہ میرا کمال خان آ گیا۔ آج کی عید تمہاری بدولت نصیب ہوئی''۔

تمکین عباسی لٹ خانہ کے پرانے ساتھی ہیں۔ مگر وہ کوئٹہ میں موجود نہیں تھے۔ اپنی آنکھ کے علاج کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر امیر الدین اپنی غیر مستحسن بیماری سے قبل کراچی میں تھے۔ البتہ پروفیسر برکت علی شہر میں موجود تھے اور ہر وقت ماما کے بستر کے آس پاس موجود رہتے۔ برکت ملتان کے رہنے والے ہیں، بلوچستان یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں اس صوبے کے پس منظر میں عبداللہ جان کی بڑائی کا مکمل احساس اور ادراک ہے۔ اسی لیے وہ حد سے زیادہ دکھی ہیں۔ وہ سائیں کمال خان کو عبداللہ جان کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو بہت فرحت محسوس کرتے ہیں۔ اسی اثنا میں سردار بہادر خان بنگلزئی آئے۔ ان کے ساتھ لٹِ اعظم حبیب اللہ بھی تھے۔ اس طرح یہ محفل لٹ خانہ کی پولٹ بیورو کی میٹنگ میں بدل جاتی ہے۔ کمال خان بلوچی سمجھتے ہیں مگر بولنے میں اس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ مگر اس محفل میں گرائمر کا کسی کو غم ہے بھی نہیں۔ گزرے ہوئے دنوں کا مقبول اردو ٹکڑا بھی پھینک دیا جاتا ہے۔ کسی کے ہاتھ بلوچی کا جملہ چڑھ جائے تو بھی دے مارتا ہے۔ ایک غیر مصنوعی محفل میں بغیر بناوٹ اور بے ساختہ باتیں۔ حبیب اللہ کمال خان کو میر کمال خان کہتے ہیں۔ نفرتوں کے اکھاڑے میں کسی پشتون کے نام کے ساتھ بلوچی سابقہ (یعنی میر) اگر جچتا ہے تو وہ پشتون، سائیں کمال خان ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔

اگلے دن نواب خیر بخش مری کے صاحبزادے چنگیز خان ماما کی عیادت کے لیے آئے۔

میر صاحب ان کے والد کے دوست ہیں۔ ملاقاتیوں کا رش بہت بڑھ گیا تھا۔ دروازے پر No visitors کی تحریر کو کوئی نہیں مانتا تھا۔کوئی بھی خود کو visitors کے زمرے میں تصور نہیں کرتا تھا۔ سب لوگ عبداللہ جان کے فیملی ممبر تو تھے۔اسی روز ماما کی سالگرہ تھی۔ میں ان کی درازی عمر کی تمنا کی تحریر والا ایک کیک خرید لایا۔کہیں سے ایک چھری حاصل کی گئی اور دوستوں کی تالیوں میں ماما نے 8 مئی کو اپنی 70 ویں سالگرہ کا کیک کاٹا۔ایک اور کیک برکت اپنی اور میری طرف سے پہلے لا چکے تھے۔ جسے میر صاحب نے اپنی خدمت پر مامور ''اپنی بچیوں'' (یعنی نرسوں) میں تقسیم کروادیا۔ پروفیسر برکت نے سالگرہ کارڈ پر یہ جملے لکھے۔

Dearest Abdullah Jan Jamaldini

You gave so much of yourself to others, you gave your time, your understanding and your warmth. It is no wonder so many people think so much of you and it is no wonder that one of them is me.

May you live long

to celebrate many brithdays more!

بیماری والے دو تین ایام میں ماما کا شیو اچھا خاصا بڑھ چکا تھا۔ان سے شیو بنوانے کی بات ہوئی تو انھوں نے آرڈیننس کے ذریعے یہ محکمہ سائیں کمال خان شیرانی کو سونپ دیا۔''اس سے کہو کہ نائی کا بندوبست کرے''۔ ماما کی کمال خان پر اس فیاضی کا پس منظر یہ تھا کہ عبداللہ جان طالب علمی کے زمانے میں ملاّ ہوگئے تھے۔ان کی مبارک ریش پانچ، چھ انچ لمبی تھی۔ وہ معدے کی تیزابیت اور بے خوابی کا شکار ہوگئے تھے۔ جب وہ اسلامیہ کالج پشاور سے ژوب کے راستے چھٹیوں پر گھر آرہے تھے تو ڈیرہ اسماعیل خان میں ان کے کلاس فیلو اور دوست کمال خان شیرانی ایک نائی کو پکڑ لائے اور یوں ماما کو ''انسان'' بنا دیا گیا۔لہٰذا اب اس واقعے کی یاد میں عبداللہ جان نے انہیں دوبارہ نائی لانے کی خدمات سرانجام دینے کو کہا۔ سائیں تراشِ ریشِ عبداللہ جان کا اعادہ کرنے ہنسی خوشی تیار ہوگئے۔

ماما کی مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کی ورائٹی بہت بڑی تھی۔صوبائی اسمبلی میں حبیب جالب کی خدمات کے اعتراف میں قرارداد منظور کروانے والے اسلم بزنجو اور ڈاکٹر مالک بہت بار آئے۔ سینٹ کے رکن منظور گچکی، بزن بزنجو ایم این اے اور حاصل بزنجو ایم این اے بھی میر صاحب کی عیادت کرنے موجود ہوئے۔فرنٹیئر سے جناب شیر علی باچا آئے۔ انہیں دم کرنے والے ابا بکی، کبوتر کا گوشت کھانے کا مشورہ دینے والے طبیب، تعویز دینے والا ملاّ، قبائلی سربراہ، سفید ریش طالب علم، مزدور الغرض ہزاروں لوگ ان کے پاس آئے۔ وہ ہندوؤں سے بھی خود کو دم کرنے کی فرمائش کر دیتے۔ ملک بھر سے بے شمار لوگوں کے ٹیلیگرام، فون اور خطوط آئے۔ کئی دوستوں نے علاج کے لیے کراچی میں ان کو مہمان بنانے کی دعوت دیدی۔لالا غلام محمد شاہوانی مرحوم کے بھائی نے انہیں کراچی لے جانے اور وہاں پہ سارے اخراجات برداشت کرنے کے انتظامات کیے۔ لالا کے بھانجے روزانہ پھولوں کا گلدستہ ان کے کمرے میں لاتے۔نواب خیر بخش مری اپنی علالت کے باوجود ماما کی عیادت کو آئے۔ حکیم لہڑی کی حاضری بہت دفعہ لگتی رہی۔ صحافیوں ادیبوں اور دانشوروں کا ذکر تو ممکن ہی نہیں۔ نائلہ قادری اپنے ''بابا'' کے لیے سبزیوں کا سوپ بنا کر لاتیں۔ میرے بڑے بھائی میرو خان کئی بار ان کی مزاج پرسی کے لیے گئے۔ اسد ابڑو اپنی اہلیہ اور اپنے ننھے بیٹے کے ہمراہ کئی بار عقیدت کے جذبات نچھاور کرنے آئے۔ پروفیسر بانو آئیں۔ سید امیر الدین کراچی سے واپس ہوئے تو ہر شام ماما کا پوچھنے آجاتے۔ ان کے اہل خانہ بھی ماما کی عیادت کے لیے آتے رہے۔ پروفیسر اکرم دوست اپنی ڈاکٹرنی بیگم کے ساتھ آتے رہے۔ اکرم دوست نے ماما کی کتاب کے لیے جو ٹائٹل بنایا تھا وہ وہاں انگیٹھی پر سجا دیا گیا تھا۔ ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق اپنے رنگ ڈھنگ میں وہاں گیا۔ایک نوجوان نے ایک مزاح نگار کی کتاب ان کے سرہانے رکھ دی۔ ملا نصیر الدین کے بارے میں ایک کتاب بھی وہاں دیکھی گئی۔ہم انہیں گذشتہ تین سالوں سے شائع ہونے والے نوکیں دور کی کاپیوں کی ایک جلد دے آئے۔ایک اور عقیدت مند پشتو زبان کے قدیم شاعر بیٹ نیکہ کا دعائیہ کلام خوش خط لکھ کر اور اسے فریم کروا کر ان کی انگیٹھی پہ سجا گئے۔ عطا شاد کبھی شاد ماں حالت میں اور کبھی سلامت صورت میں تقریباً ہر شام

موجود ہوتے۔ جسٹس امیر مینگل آتے رہے۔ سلطان قیصرانی کے بلند آہنگ وطویل دورانیہ والے قہقہے مشہور تھے۔ ان کا بہت ہی بڑا پیٹ ان کی بسیار خوری کا غماز ہے۔ ان کی بینائی کی عینکیں اور سر کے بڑے بڑے بال ان کی دانشوری کی چغلی کھاتے ہیں مگر اس بار اندازہ ہوا کہ وہ بہت اچھے فزیوتھر پیسٹ بھی ہیں۔ وہ جب بھی آتے ہیں ماما کی ٹانگیں دابنے لگتے ہیں۔ دو منٹ کے اندر پسینے سے شرابور ہو جاتے ہیں اور ان کی چڑھی ہوئی سانسوں کی پھنکار 1760 گز تک سنائی دینے لگتی ہے۔ شیام کمار لطیفوں کی بوری کاندھے پہ لیے ہر شام آن دھمکتے۔ درمیان میں لقمہ دینے والے بہادر خان رودینی بھی لازمی آئیٹم تصور ہوتے تھے۔ برکت اور خدائیداد کی جوڑی بھی انہی شاموں میں پروان چڑھی۔ پروفیسر عبدالرحمٰن فکر اور ان کی شتر سواری کے تذکرے روز کا معمول بن گئے تھے۔ خان گل مستنگی کے ساتھ پروفیسر نادر قمبرانی کی نوک جھونک یہیں اول الذکر کی ناراضگی کا سبب بنی۔ عزیز آرٹسٹ اپنی بے ہنگم باتوں، ڈاکٹر نعمت گچکی غیر فلسفیانہ قہقہوں، صورت خان مری اپنی بے بنیاد تسبیح خوانی اور غوث بخش صابر اپنی رنگت سے میچ کرتا ہوا سیاہ ہینڈ بیگ لیے ماما کی محفل میں اکثر رونق افروز ہوتے۔ صبا دشتیاری اپنی گوشہ نشینی اور احباب گریزی کے باوجود سنجیدہ سنجیدہ انداز میں ماما کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوئے۔ مریوں میں عطا اللہ، محمد خان، انجینئر عبدالحمید اور سید ہان خان بہت دیکھے گئے۔ محترم ملک عثمان کاسی مرحوم کے بھائی اور بیٹھے عرفان بھی ملک صاحب کے اِس یارِ غار کی عیادت کے لیے آئے۔ بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایک دو بار آئے۔ ڈاکٹروں میں حمید اللہ بزدار اور افتخار کاسی ان کے معالج تھے۔ اس کے علاوہ سرجن اسلم، ڈاکٹر اسحاق بلوچ آ جاتے۔ سول ہسپتال کے ایم ایس ڈاکٹر شفیع زہری اپنے لاؤ لشکر سمیت ان کی عیادت کرنے اور ان کی دیکھ بھال کے انتظامات دیکھنے تقریباً ہر روز آ جاتے۔ ڈاکٹر ثنا، حمید اختر، غلام سرور پرکانی، صوفی اکبر، ڈاکٹر ضیاء، سرفراز اور ارباب یوسف نے ان کی عیادت کی۔ ارباب سکندر کو جب بتایا کہ ماما انہیں یاد کرتے رہتے ہیں تو انہوں نے کہا "وہ تو میرے مجازی والد ہیں، میں ضرور جاؤں گا"۔

لٹ خانہ کے ایک پرانے ممبر مستری محمد غوث ہیں۔ ایک زمانے میں مستری گیری کرتے

تھے مگر اب حکیم بن گئے ہیں۔ حکمت کیا ہے بس لٹھ ماری ہے۔ جب ان کو ماما کی بیماری کی خبر دینے، میں اور سائیں کمال خان ان کی رہائش گاہ پہنچے تو وہ اپنے مریضوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ان کو کسی صورت ان کی "او پی ڈی" سے نکال کر ان کے دوست کی بیماری کا حال سنایا۔ مستری سخت ناراض ہو گیا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ خدانخواستہ واقعی بہت بڑے ڈاکٹر بن گئے ہیں۔ سیکڑوں فالج زدہ ان کے علاج سے ٹھیک ہو کر گئے مگر اس کے باوجود عبداللہ جان کو ان کے زیر علاج کیوں نہ لایا گیا۔ مجھے مشہور ادیب کی بات یاد آئی جس نے لکھا کہ "مجھے اس بات پہ غصہ نہیں آتا کہ سیکڑوں لوگ ناخواندہ حکیموں عطائیوں کے پاس کیوں جاتے ہیں بلکہ مجھے غصہ اس بات کا ہے کہ ان میں کئی مریض ٹھیک ہو جاتے ہیں"۔ مستری غوث جیسے باتونی بوڑھے کو طب کے میدان میں اس کے حیرت انگیز کارناموں کی تفصیل بیانی سے روکا۔ میں نے بات بدل دی کہ "مستری اس بار ذرا زیادہ بوڑھے لگ رہے ہو"۔ مستری نے آناً فاناً اپنی جوانی ثابت کرنے کے لیے اٹھک بیٹھک لگانا شروع کر دی۔ یہ عمل جوانی دکھانے سے زیادہ اپنے تیار کردہ کشتہ جات کے کمالات دکھانا تھا۔ خدا خدا کر کے اس وعدے کے ساتھ روانہ ہوئے کہ مستری اپنے مریضوں کا رش ختم کر کے ماما کے پاس جائے گا۔ دنیا دلچسپیوں کی آماجگاہ ہے!

عبداللہ جان اور سائیں کمال خان اس دفعہ بہت مصالحتی گفتگو کرتے رہے۔ پہلے تو وہ جب بھی ملتے تو سیاسی بحث میں ہمیشہ دلیل بازی کرتے کرتے جھگڑ پڑتے، ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے اور بالکل آخر میں جا کر اپنی پرانی دوستی کے قائم رہنے کے ایک دو ڈپلومیٹک فقروں کا تبادلہ کر لیتے۔ مگر آج ایسا نہ تھا۔ اس بار گویا دو مست اور لاابالی نوجوان اکھڑ انداز میں ایک دوسرے کو گھسیٹے بغیر گفتگو کر رہے تھے۔ مزاح، شگفتگی اور جذبات سے بھرپور باتیں تھیں۔ انہیں کسی کی موجودگی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ کوئٹہ کے سارے سلینگ (Slang) جملے دے مار رہے تھے۔ ڈاکٹر خدائیداد ایسے موقع پر جب آن ملتے ہیں تو محفل ذرا زیادہ 'سلینگ زدہ' ہو جاتی ہے۔ ایسی محفلیں ہم جیسے لوگوں کے لیے غنیمت ہوتی ہیں جنہیں ماضی میں لغوبات کرنے اور سننے پر پیٹی بورژوا رجحانات کا شکار سمجھا جاتا تھا۔ اس انجمنِ بزرگاں میں بے ضرر گالیوں کی کوئی ممانعت نہ تھی۔ یہاں علم کی

باتیں سننے کے قابل ہوتی ہیں۔ وہ زرتشت اور اس کے خلیفہ مانی کے متعلق بولتے ہیں، بدھا اور گاندھی پر بحث چلتی ہے، کتابوں اور تحریکوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ حافظ اور سعدی کے اقوال دہرائے جاتے ہیں۔ عبداللہ جان شیخ سعدی کا یہ مصرع بار بار سناتے ہیں؛ 'بنی آدم اعضائے یک دیگراند!'

اس بیماری کے دوران ماما عبداللہ جان اپنی روایتی لکھنویت میں ایک اضافہ اور بھی کر لیتے ہیں۔ وہ مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کا ہاتھ چومنا بھی شروع کرتے ہیں اور اگر کوئی نر کا بچہ جواباً ان کا ہاتھ بھی چوم لیتا تو ماما پھر جواب آں غزل اس کا منہ چومنے کی کوشش کرتے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اکثر ناکام ہو جاتے مگر کوشش کرنا تو گویا ان کا فرض تھا۔ ان کا ہاتھ چومنے کا عمل ہم سب کو اضافی لگا۔ سائیں نے ان سے احتجاج بھی کیا کہ بابا خیر سگالی میں یہ انکریمنٹ کیسا، وہی کافی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ آپ پیار کے سمندر ہیں۔ مگر ماما نے جواب دے کر گویا سب کو خاموش کر دیا۔ "I Cannot resist it"

عبداللہ جان کو ایک روز انگریزی کا بھی دورہ پڑا۔ یک طرفہ طور پر بغیر کسی اشتعال کے وہ انگریزی مارنے لگے۔ عام طور پر بلوچی کے مقابلے میں انگریزی گندم کی روٹی سمجھی جاتی ہے۔ ہر شخص ٹرائی مارتا ہے کہ انگریزی کے جتنے مبلغ الفاظ اُسے آتے ہیں استعمال کرے۔ پہاڑ میں ہم نے دیکھا کہ مری ماما انگریزی استعمال کرتے ہیں۔ وہ ''باڈی گارڈ'' کو'' گاڈی باڈ'' بولتے ہیں، کسی چیز کے'' شفٹ'' کرنے کو'' فشٹ'' کرنا کہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر عبداللہ جان تو ایسے نہیں ہیں کہ محض نمبر بنانے کے لیے ہم پہ انگریزی مسلط کریں۔ جب انہیں احساس ہو جاتا کہ وہ پٹڑی سے اتر چکے ہیں تو وہ سنبھل جاتے اور اپنی میٹھی بلوچی زبان کی کھٹارہ گاڑی کا سٹیرنگ سنبھال لیتے۔ بلوچی زبان ان کی ملکیت بھی تھی، جاگیر بھی اور معمول بھی، وہ اپنے ہمزاد کو کہاں ترک کر سکتے ہیں۔

ماما کی بیگم نے ماما کی تیمارداری میں بہت سخت محنت کی۔ مامی بڑی کھری عورت ہیں۔ خود بھی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ انہیں دمہ کا مرض بھی ہے۔ بڑی ثابت قدم اور صبر وشکر والی خاتون ہیں۔ جب بھی دیکھو وہ کونے میں بیٹھی نظر آتی ہیں۔ اگر ملنے والوں کا ہجوم بہت بڑھ جاتا تو ہماری بوڑھی مامی باہر نکل جاتیں۔ ماما کے بیٹے نہ صرف باپ کی خدمت میں لگے ہوتے بلکہ ملنے والوں

سے بڑی پبلک ڈیلنگ بھی انہیں کرنی پڑی۔ ماما کی بچیاں بھی ملاقاتیوں کے ہجوم والے اوقات کے بعد اپنے والد کی خدمت کے لیے آجاتیں، ان کے داماد بھی بہت سرگرمی سے خدمت پہ مامور تھے۔ بالخصوص ڈاکٹر خان جان اور عزیز رند۔ ان کے تینوں بیٹے بالترتیب جنید خان، دوستین اور بالاچ خان نے انسانی ہمت سے بڑھ کر ان کی خدمت کی۔ عبیداللہ اور شاہ بیگ شیدا بھی بیٹوں کی طرح ان کی تیمارداری میں جتے ہوئے تھے۔ یہیں معلوم ہوا کہ شاہ بیگ کے کان میں ایک لال بیگ گھسا۔ بلوچوں کو اگر معلوم ہوتا کہ لال بیگ نامی ایک کیڑا ہے اردو میں، تو وہ اپنے بیٹوں کے نام شاہ بیگ اور لال بیگ نہ رکھتے۔ شاہ بیگ بے چارہ کیا کرتا، لال بیگ نامی کیڑا اُس کے کان میں گھسا اور لوگ یہ سمجھے کہ وہ اپنے بھائی لال بیگ کی شکایت کر رہا ہوگا، جس طرح کمال خان شیرانی اپنے بھائیوں کی شکایت کرتے ہیں جو ان کے ساتھ برادرانِ یوسف کا سا سلوک کرتے ہیں۔

ماما عبداللہ جان جمالدینی کو ڈاکٹروں کی محنت، احباب کی نیک تمناؤں، اہل خانہ کی خدمت اور خود اُن کی اپنی قوت ارادی نے موت سے چھین لیا۔ بالکل اسی طرح جیسے چرواہے اپنی بکری کو بھیڑیے کے جبڑوں سے چھین لیتے ہیں۔ ماما مفلوج ہے مگر ان کا زندہ بچنا ہی نعمت ہے۔ وہ ہسپتال سے گھر جا چکے ہیں۔ ان کا بایاں پیر اور بازو کام نہیں کرتے مگر فعال دایاں دھڑا چاک و چوبند ہے اور ان کا دماغ چست اور جاگا ہوا ہے۔ ماما نے سرخ سگنل دکھا کر اپنے دوستوں کی جان نکال دی تھی۔ محض بیماری نے سائیں کمال خان کے بقول ''صوبے کے کونے کونے کو ہلا کر رکھ دیا تھا''۔ خدا ہمیں ان کے مزید دکھ نہ دکھائے۔

ماہنامہ ''نوکیں دور'' کوئٹہ۔ مئی جون 1993

۱۰

قارئین، ''نوکیں دور'' کا گذشتہ شمارہ میری تحریر لٹ خانہ سے خالی تھا۔ اس کی وجہ، اس عنوان کے تحت جناب ڈاکٹر شاہ محمد مری نے ایک طویل افسانہ کی صورت میں تحریر کی، جس سے قارئین کو لٹ خانہ کی اس قسط کے ناغہ کرنے کا سبب تو معلوم ہوگیا ہوگا۔

6 مئی 1993 کو رات کے دس بجے مجھ پر فالج کا حملہ ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ حملہ شدید نہ تھا۔ نہ میرا ذہن، نہ میری آنکھ، نہ گویائی اس سے زیادہ متاثر ہوئے۔ بس چہرے پر اس کا اثر رہا اور بایاں حصہ بالخصوص بایاں ہاتھ اور پاؤں زیادہ متاثر ہوئے۔ اور اب تک ہیں۔

میرے مہربان ڈاکٹر جناب سرفراز خان جمالدینی نے اطلاع پاتے ہی بروقت میرا علاج شروع کیا۔ اور صبح مجھے سول ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ اور میں کمرہ نمبر 6 نیو سپیشل وارڈ (وی۔ آئی۔ پی) میں نہایت ہی قابل اور مہربان ڈاکٹروں جناب افتخار کاسی صاحب جناب حمید اللہ بزدار اور جناب محبوب زہری اور جناب ارشاد کھوسہ صاحب کے زیر علاج رہا۔ ویسے ہسپتال کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ جناب شفیع زہری صاحب کے علاوہ تمام محترم ڈاکٹروں سینئر اور جونیئر نے مجھے شرف

بخشا۔ میرا معائنہ کیا اور میری بیمار پرسی کی۔ ہسپتال کے تمام سٹاف اور خصوصاً فیمیل نرسوں، میری بیٹیوں نے میرا بے حد خیال رکھا۔ اور اپنی بچیوں کی طرح مجھے پیار دیا۔ میں ان سب کا بے حد ممنون ہوں۔ اسی طرح میں جناب ڈاکٹر شیر محمد دوتانی کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے بروقت تھیراپی کر کے میری صحت یابی کو حرکت دی۔

جناب ڈاکٹر شاہ محمد اور میرے دیگر احباب نے اطلاع پاتے ہی میرے دور دراز دوستوں کو میری بیماری کی خبر کی۔ اخبار میں خبر دینے سے منع کیا۔ کیونکہ ڈاکٹروں نے ہجوم کی موجودگی کو میری مخصوص بیماری کے لیے مناسب نہیں سمجھا۔ تاہم ہجوم باقاعدہ رہا۔ اگر کمرے کے اندر نہیں تو باہر ضرور ہجوم تھا۔ جناب کمال خان شیرانی فوراً کوئٹہ پہنچے اور دس روز تک رہے۔ جناب خدائیداد خان اور میرے تمام احباب روز تشریف لاتے، پھولوں کا گل دستہ ساتھ لاتے۔ چند مہربانوں نے تو روز میرے لیے سوپ لانے کو بھی ضروری سمجھا۔ غرض میری بیمار پرسی کے لیے ایسے لوگ بھی تشریف لاتے جنہیں میں پہچانتا بھی نہیں تھا۔ کوئٹہ کے نہایت ہی بزرگ اور محترم شہریوں نے مجھے پوچھنا فرض سمجھا اور تشریف لائے۔ ہر مکتبہ فکر، نظریہ اور عقیدہ کے لوگوں نے میری بیمار پرسی کی، ہندو و عیسائی وغیرہ وغیرہ۔ ہر سیاسی پارٹی کا لیڈر اور کارکنوں نے مجھے عزت بخشی۔ ان سب کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ خواتین اور بچیوں نے مجھے اپنی ہمدردی اور محبت سے نوازا۔ میں ان شاگرد بچیوں کی پرنم آنکھوں اور آنسوؤں کا کیوں کر احسان چکا سکتا ہوں۔ یونیورسٹی کے طلبا نے مجھے عزت بخشی۔ غرض میری حیثیت سے زیادہ لوگوں نے مجھے عزت دی۔ میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں اور احسان مند ہوں۔ خدا انہیں اس محبت کا اجر دے۔ آمین۔

گذشتہ سے پیوستہ

سید کامل القادری نے کراچی اور لاہور کے دوروں کے دوران لٹ خانہ کی سفارت کے فرائض خوب سرانجام دیئے۔ کسی کے کہے بغیر، اُن کے ان دوروں سے کراچی اور لاہور کے ترقی پسند حلقوں میں لٹ خانہ کی خوب جان پہچان ہوئی۔ ادبی اور فکری دانشوروں سے اہل لٹ خانہ کا

تعارف کیا گیا۔مگر لٹ خانہ والوں کو اس کا پتہ نہیں چلا تھا۔ان دنوں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا نئے قائم ہوئے پاکستان کے ادبی حلقوں میں خوب چرچا تھا۔ ہر جگہ تحریک کی شاخیں قائم ہو رہی تھیں اور نوجوان ادیب اور شاعر اس تحریک میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔میرے خیال میں کوئٹہ میں بھی چند سال پہلے نوجوان دانشوروں نے تحریک کی شاخ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ جناب انجم قزلباش ان دانشوروں میں پیش پیش تھے جو اُن دنوں لاہور میں رہ رہے تھے۔لاہور جانے کی وجہ بھی اس تحریک کی کشش تھی ۔ وہاں وہ ادبی حلقوں کے علاوہ مزدور تنظیموں میں بھی دلچسپی لے رہے تھے۔مرزا ابراہیم اور فضل الٰہی قربان کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے ۔ادبی حلقوں میں جناب فیض،ظہیر کاشمیری،صفدر میر اور سبط حسن صاحب سے بہت متاثر ہوئے تھے۔کامل القادری کا لاہور میں ان سے ملاقات یقینی بات تھی اور کوئٹہ میں لٹ خانہ اور اہل لٹ خانہ کی بات ان تک پہنچ چکی تھی اور اس سے انہیں یقیناً خوشی ہوئی ہوگی۔

نہ جانے کراچی اور لاہور کے ترقی پسند دانشوروں نے مشورہ دیا تھا کہ کوئٹہ میں از سر نو ترقی پسند ادبی تحریک کی شاخ قائم کی جائے یا پھر ان سے متاثر ہو کر سید کامل القادری نے تحریک کی شاخ قائم کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ ایک روز لٹ خانہ میں سید کامل القادری نے ہمیں سید عبدالسلام شاہ (عین سلام) کے یہاں جانے کو کہا۔ میں اور کمال خان ان کے ہمراہ چلے۔اس سے قبل سید کامل القادری کے ہمراہ عین سلام،رفیق راز اور عابد شاہ عابد لٹ خانہ تشریف لائے تھے۔اس طرح ان سے ہمارا تعارف ہو چکا تھا۔

عین سلام کا گھر آج کی میزان مارکیٹ کے مغرب میں واقع زیارت پیر بخاری کے قریب تھا۔ان کے والد سید مولانا عبدالرزاق شاہ پیر بخاری کی مسجد کے امام خطیب تھے اور مشہور عالم دین تھے ۔ وہ اسلامیہ ہائی اسکول کوئٹہ میں دینی مدرس بھی تھے۔ جناب انجم صاحب جب اسلامیہ ہائی اسکول میں پڑھا کرتے تھے، ان کے اچھے اور فرمانبردار شاگردوں میں سے تھے۔ میرے خیال میں انجم اور عین سلام کی دوستی کی وجہ اسی رشتہ کے سبب قائم ہوئی ہوگی۔عین سلام کے چچا زاد بھائی سید عبدالستار شاہ جو اُن دنوں لاہور میں ڈاکٹری کی تعلیم میں مصروف تھے، بھی انجم

قزلباش کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے جو لاہور میں یقیناً ملتے رہے ہوں گے۔عبدالستار شاہ سید غفور شاہ صاحب کے بڑے بیٹے تھے اور مولانا عبدالرزاق شاہ کے بھائی تھے۔ دونوں بھائیوں کی طبیعت میں بڑا فرق تھا۔غفور شاہ صاحب ترقی پسندوں سے خوش نہ تھے مگر مولانا عبدالرزاق شاہ ان کی حمایت کرتے تھے۔ میرے خیال میں پیر بخاری انہی حضرات کے جدا مجد ہوں گے اور یہ حضرات خود بخاری سیدوں میں سے ہیں۔

عین سلام صاحب کے پاس پہنچے تو وہاں رفیق راز،عین سلام،عابد شاہ صاحب ایک اور صاحب پینٹنگ کا کام کرتے تھے۔''فی الحال سٹیشنری'' کے بورڈ انہی نے بنائے تھے۔خدائیداد صاحب کے دوست تھے اور اردو کے شاعر تھے۔اس طرح ترقی پسند ادیبوں کی ایک پہلی نشست ہوئی،جس میں میں نے اور خدائیداد نے شرکت کی۔یوں کوئٹہ میں ترقی پسند مصنفین کی شاخ شاید دوبارہ قائم ہوئی۔ میں نے اور خدائیداد نے بحیثیت بلوچی اور پشتو کے ادیبوں کے اس میٹنگ میں شرکت کی۔ ہمارا ارادہ بڑا پکا تھا کہ اس فکر اور اس کے نظریات کو بلوچستان کے ادیبوں میں خوب پھیلائیں گے۔

اس طرح پھر ہماری مصروفیات ادبی میدان میں تیز اور نمایاں ہوئیں ۔ اب ادبی شخصیات سے ملنا جلنا زیادہ ہوا۔گل خان نصیر اردو کے مشہور شاعر اور ادیب سمجھے جاتے تھے، جو سٹینڈرڈ ہوٹل واقع مشن روڈ میں قیام رکھتے تھے اور غلام محمد شاہوانی ''نوائے بلوچستان'' کے مدیر تھے۔ میں نے اسٹینڈرڈ ہوٹل کا رخ کیا۔ وہاں اکثر گل خان نصیر سے اور غلام محمد شاہوانی سے ادبی گفتگو ہوتی تھی۔ان دنوں لاہور سے ایک مشہور مجلّہ ''سویرا'' شائع ہوا کرتا تھا۔یہ مجلّہ اردو کے ترقی پسند ادیبوں کا تھا،لہٰذا ہم سب اسے خریدتے اور اس میں بہت دلچسپی لیتے۔ میں نے بلوچی ادب اور شاعری میں زیادہ دلچسپی لینی شروع کی۔بلوچی ادب اس وقت نایاب تھا۔شاعری میرے پاس صرف وہی چند کلاسیکی طویل نظمیں تھیں، جو میں نے خود لوگوں سے اکٹھے کر لی تھیں۔

میں گل خان نصیر کو بحیثیت اردو شاعر کے جانتا تھا۔اکثر ان کی اردو نظمیں ان سے سنتے یا پھر اخبار میں پڑھتے۔غلام محمد شاہوانی کو ادب سے بڑا لگاؤ تھا۔وہ ادبی مطالعہ بہت کیا کرتے تھے

اور ترقی پسند اور جدید اردو شاعری اور ادب سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔

ایک روز میں نے گل خان نصیر سے کہا،" جناب آپ اردو کے اتنے اچھے شاعر ہیں تو آپ کیوں اپنی قومی زبان بلوچی میں شاعری نہیں کرتے"۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے بلوچی میں بہت شاعری کی ہے چونکہ لوگ دلچسپی نہیں لیتے اس لیے میں اسے شائع نہیں کرتا۔ یہ کہہ کر وہ اپنی بیاض لے آئے۔ جس میں بلوچی کی کئی نظمیں تھیں اور غزلیں بھی تھیں۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں روشن ہوئیں اور خوشی سے چلا اٹھا کہ" واجہ نصیر آپ انہیں پڑھ کر سنائیں۔" انہوں نے سب سے پہلے یہ قصہ سنایا کہ کس طرح انہوں نے بلوچی شاعری شروع کی۔

"ایک مرتبہ ہمیں خدائی خدمتگاروں نے اور باچا خان نے اپنی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے صوبہ سرحد میں چارسدہ بلایا تھا۔ میں اور میرے ساتھی گئے۔ وہاں تقریباً کانفرنس کی پوری کاروائی پشتو میں ہوئی۔ اگرچہ پشتو سے میں کچھ زیادہ بلد نہ تھا، تاہم میں ان کے اس عمل سے بہت متاثر ہوا۔ یہاں تک کہ نظمیں بھی تمام پشتو میں پڑھ کر سنائی گئیں۔ پھر مجھے مطالبہ ہوا کہ میں بھی مشہور شاعر ہوں، اپنا کلام کانفرنس میں سناؤں۔ میں نے عذر کیا کہ میں اس وقت تیار نہیں۔ اگلی نشست کے دوران سناؤں گا۔ میرا یہ عذر مان لیا گیا۔ مجھے اب اس کی تیاری کرنا تھی، چنانچہ کانفرنس کی اس نشست کے اختتام کے بعد لوگ اپنے اپنے پنڈال گئے۔ مگر میں نے دریا کے کنارے کا رخ کیا۔ میں نے سوچا کہ اب جس طرح بھی ہو مجھے اپنی زبان میں شاعری کرنی ہے۔ اور اپنی ہی زبان میں کانفرنس میں اپنی شاعری سناؤں گا۔ چنانچہ دریا کے کنارے میں نے اپنی طویل بلوچی نظم" بیا او بلوچ"، تخلیق کی اور کانفرنس کی اگلی نشست میں بہت جوش اور جذبے سے سنائی۔ لوگ میرے جذبہ سے بہت متاثر ہوئے۔ اس طرح میں نے بلوچی شاعری کی ابتدا کی"۔

پھر گل خان نصیر نے یہ طویل نظم پڑھ کر ہمیں سنائی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں جذباتی ہو کر باہر نکلا۔ باہر سٹینڈرڈ ہوٹل کے گیٹ پر ایک جاسوس جو گل خان نصیر کی نگرانی کرتا تھا، اس نے مجھے سلام دعا کیا اور میری آنکھوں کو پرنم دیکھ کر حیران ہونے لگا۔

بحر کیف انہی پرنم آنکھوں کے ساتھ لٹ خانہ روانہ ہوا۔ اس کے بعد بلوچی شاعری کے

علاوہ مجھے گل خان نصیر سے بہت محبت ہوگئی۔ اور ان کی شاعری سے بے حد دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد اکثر ہم جب بھی سٹینڈرڈ ہوٹل جاتے، گل خان نصیر سے ان کا بلوچی کلام سننے کا مطالبہ کرتے۔ سٹینڈرڈ ہوٹل میں اکثر ہماری ملاقات میر غوث بخش بزنجو، ملک فیض محمد یوسف زئی، ملک عبدالرحیم خواجہ خیل اور عبدالکریم شورش سے ہوتی۔ گل خان نصیر کی محبت کے صدقے ہی میں سٹینڈرڈ ہوٹل ہی میں بیشتر بلوچ سیاسی زعما اور سیاسی کارکنوں سے متعارف ہوا۔

لٹ خانہ میں اس وقت میں اور خدائیداد موجود تھے۔ ہم نے یہ سوچا کہ اب پشتو اور بلوچی ادیبوں کو یکجا کر کے ان کی تنظیم کی جائے۔ چنانچہ خدائیداد نے پہل کی اور ایک روز لٹ خانہ میں شام کے وقت پشتو ادیبوں کی ایک نشست ہوئی اور طے ہوا کہ پشتو ٹولی کے نام سے پشتو کے ادیبوں کو منظم کیا جائے اور اس طرح پشتو ادب اور شاعری کو فروغ دیا جائے۔ یہ میٹنگ کامیاب ہوئی۔ اب مجھے یاد نہیں اس کے عہدیدار کون تھے، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ جنرل سیکرٹری خدائیداد صاحب تھے۔ اس ادبی تنظیم کا تمام کام انہی کے ذمے رہا۔ انہوں نے اس کا دستور العمل ترتیب دیا اور اسے بعد میں پاس کرایا اور چھپوا دیا۔ کاش کہ اس کی کوئی نقل دستیاب ہوتی۔ خدائیداد صاحب سے اس کی مزید تفصیل معلوم کی جاسکتی ہے۔ چاہیے کہ ادارہ کوئیں دور اس کام کو سرانجام دے۔ اور قارئین کی معلومات کی خاطر پشتو ٹولی کے بارے میں اس تفصیل کو شائع کرے۔

میرا اسٹینڈرڈ ہوٹل میں آنا جانا باقاعدہ شروع ہوا۔ کبھی خدائیداد بھی ساتھ ہوتے اور کبھی میں اکیلا جاتا۔ وہاں بلاناغہ گل خان نصیر، غلام محمد شاہوانی اور شورش بابو (عبدالکریم شورش) سے باتیں ہوتیں۔ اس بات پر بحث ہوتی تھی کہ بلوچی زبان و ادب کو کس طرح بڑھاوا دیا جائے اور اس کی ترقی کے لیے کیا جائے۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ بلوچی زبان و ادب کی ایک تنظیم بنانی چاہیے۔ اور اس تنظیم کے ذریعے سب سے پہلا کام یہ ہو کہ قدیم شاعری کو یکجا کیا جائے۔ اس بارے میں گل خان نصیر نے اپنی کاوشوں کے بارے میں بتایا کہ کس طرح انہوں نے بہت پہلے سے جب کہ وہ ریاست قلات کی حکومت میں پسنی اور مکران کے دیگر علاقوں میں ملازمت کر رہے تھے تو گویوں اور ان لوگوں سے جن کو بلوچی قدیم شاعری کی نظمیں یاد تھیں، ان سے سن کر انہیں لکھ لیا تھا۔ اس

طرح انہوں نے اپنے اشعار کی بیاض کے علاوہ ایک دوسری نوٹ بک بنائی جس میں انہوں نے قدیم شعرا کے اشعار تحریر کیے تھے۔

زندگی میں پہلی مرتبہ قدیم شعرا کے نام سننے میں آئے۔ رندوں اور لاشاریوں کے دور کے اشعار کے علاوہ اس بیاض میں ملا فاضل، ملا قاسم، ملا بہادر، نور محمد ملا ابراہیم...... نہ جانے کن کن کے اشعار درج کیے گئے تھے۔ میرے لیے گل خان نصیر کا یہ دوسرا کارنامہ تھا بلوچی ادب کو ترقی دینے کا۔ پہلا تو ان کی اپنی بلوچی شاعری اور پھر اس گراں مایہ ادب کو ریکارڈ کرنا جو دن بدن فراموش کیا جارہا تھا اور معدوم ہورہا تھا۔

چنانچہ ایک شام گل خان نصیر کے کمرے کے آگے برآمدے میں چند ہم فکر لوگوں اور نوجوانوں کا دیوان (اجلاس) ہوا۔ اور یہ طے کیا گیا کہ ''بلوچی زبان وادب ءِ دیوان'' کے نام سے ایک انجمن بنائی جائے۔ اس وقت اس انجمن کے لیے انتخابات ہوئے۔ دیوان کا صدر ظاہر ہے گل خان نصیر ہوسکتا تھا اور ان سے زیادہ اس کا حقدار کون تھا۔ نائب صدر غلام محمد شاہوانی، جنرل سیکرٹری مجھے منتخب کیا گیا۔ پریس سیکرٹری جناب عبدالکریم شورش اور خزانچی جناب قاضی غلام محی الدین اور جوائنٹ سیکرٹری انور عالیانی تھے۔ اس طرح مجھے حکم ہوا کہ میں سیکرٹری کی حیثیت سے اس کا دستور العمل ترتیب دوں۔ میں نے اور غلام محمد شاہوانی صاحب نے اگلے روز کُٹ خانہ میں اس کام کو سرانجام دیا۔ خدائیداد نے ہماری مدد کی، دیوان کا دستور العمل شائع کیا اور اسے تقسیم کیا۔ میر گل خان نے تجویز کی کہ ادبی انجمن کا ایک سرپرست بھی ہونا چاہیے۔ ان کی رائے تھی کہ نواب اکبر بگٹی صاحب کو اس کے لیے کہا جائے۔

چنانچہ ایک روز گل خان نصیر کی سربراہی میں ہم (غلام محمد، شورش بابو اور میں) نواب بگٹی کے بنگلہ گئے۔ اس وقت وہ آرام کررہے تھے۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ دن کے 11 بجے وہ کیسے آرام کررہے ہیں۔ پتہ چلا کہ وہ رات کو دیر تک کلب میں رہتے ہیں اور دن کو اکثر ڈیڑھ بجے اٹھتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں شام کو پھر آنا پڑا۔ نواب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میر گل خان نصیر کی درخواست پر ادبی دیوان کی سربراہی قبول کی اور بلوچی زبان سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ ہم نے

چندہ کا مطالبہ کیا تو کہا کہ کل۔ چنانچہ اگلے روز میں اور غلام محمد اور قاضی محی الدین دوبارہ بگٹی صاحب کے بنگلہ پر گئے۔ اطلاع کردی۔ جواب میں نواب صاحب نے ہمارے لیے ایک لفافہ بھیجا۔ کھول کر دیکھا اس میں سو روپے کا ایک نوٹ تھا۔ یہ رقم ہمیں نہایت ہی قلیل معلوم ہوئی۔ تاہم اسے غنیمت جانا۔

دوسرے روز عبدالکریم شورش صاحب ہمیں جیل روڈ پر واقع جناب خیر بخش نواب مری کے بنگلہ پر لے گئے۔ وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ مگر بنگلہ کے باہر وہ اپنی اوپن امریکن موٹر کار میں سوار تھے، جس کی چھت کور-ایبل تھا۔ شورش نے ان سے انجمن اور اس کے اغراض بیان کئے۔ نواب صاحب نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ لہٰذا میرے خیال میں ٹھیک یاد نہیں، چندہ بھی نہیں ملا۔ نہایت ہی مایوسی ہوئی۔ دوسرے روز جمالی ہاؤس گئے۔ مرحوم میر جعفر خان جمالی سے ملے۔ ان کے بنگلہ پر تو اخبار نویسوں کا جمگھٹا تھا۔ ان سے ملاقات ہوئی اور بلوچی زبان وادب کے انجمن کے اغراض بیان کئے اور امداد کا مطالبہ کیا انہوں نے کچھ زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا اور ہمیں حوصلہ دیا اور تین سو روپے چندہ دیا۔ ہمیں ان کے روپے سے بہت خوشی ہوئی۔ اگلے روز میں، غلام جان شاہوانی اور قاضی محی الدین صاحب گرینڈ لے بینک گئے اور انجمن کا اکاؤنٹ کھولا۔ نہ جانے چار سو روپے تھے یا اس سے کچھ زیادہ۔ کیوں کہ کچھ رقم تو قاضی محی الدین صاحب نے دی تھی جو ہماری انجمن کے خزانچی تھے۔ قاضی صاحب مرحوم نہایت ہی مخلص، مہربان اور ادب دوست نوجوان تھے۔ وہ کوئٹہ فروٹ مارکیٹ میں کاروبار کرتے تھے۔ موجودہ نامی گرامی ٹی وی فنکار حسام قاضی صاحب کے والد تھے۔ وہ آخر دم تک ہمارے فکری ساتھی رہے۔ بدقسمتی سے وہ غلام محمد شاہوانی کی طرح جواں مرگ ہوئے۔

اب ہمارا کام تھا کہ انجمن کے لیے ایک دفتر لیں اور اس میں کام شروع کریں۔ چنانچہ غلام جان کی کوششوں سے فاطمہ جناح روڈ پر ایک کمرہ ملا جو دکان کے لیے بنایا گیا تھا۔ تین چار کمروں میں سے ایک خالی تھا۔ کرایہ دس روپیہ تھا۔ اسے ہم نے انجمن کا دفتر بنایا۔ پھر جا کر ایک بورڈ انجمن کے نام ''بلوچی زبان وادب ءِ دیوان'' سے بنوایا۔ یہ، اردو کے شاعر جو ترقی پسند مصنفین کی شاخ کے رکن تھے، پرنٹنگ کا کام کرتے تھے اور خدائیداد کے دوست تھے، میرے خیال میں

مفت بنوایا۔ سامان ہم نے خرید کر انہیں دیا تھا۔ اس کے بعد اس دفتر کے لیے ایک چٹائی خرید کر بچھا دی۔ ہر روز صبح میں اور غلام محمد شاہوانی اس دفتر بیٹھتے اور کام کرتے۔ ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ حانی شے مرید سے متعلق بلوچی نظمیں یک جا کرنا شروع کر دیں۔ ان دونوں میر عنایت اللہ خان گچکی، میر محمود خان گچکی کے چھوٹے بھائی پنجگور سے کوئٹہ تشریف لائے تھے۔ وہ غلام جان کے دوست تھے۔ میر عنایت اللہ خان اور میر محمود خان ہمارے دفتر تشریف لائے اور ہمارے ساتھ اس چٹائی پر بیٹھے اور ہانی شے مرید کے اشعار سناتے رہے اور غلام جان انہیں لکھتے رہے۔ اس طرح ہم نے چند ایک طویل نظمیں ان سے حاصل کیں۔ ہانی شے مرید کی کئی نظمیں جب جمع ہوئیں تو غلام محمد شاہوانی نے اردو میں ان کا ترجمہ کیا۔ بعد میں اپنے اخبار نوائے وطن میں شائع کیں۔ بدقسمتی سے آج تک انہیں کتابی وصورت نہ مل سکی۔

ایک روز یعنی دو تین روز دفتر میں کام شروع کرنے کے بعد ہم حسبِ دستور ''بلوچی زبان وادب ءِ دیوان'' کے دفتر واقع فاطمہ جناح روڈ اور آج کے مری لیب کے بالمقابل سڑک کی دوسری جانب بیٹھے تھے۔ میرے خیال میں، میں اور غلام جان شاہوانی تھے، کوئی اور نہ تھا۔ اچانک ہمارے دفتر کے دروازے پر ہمارے سرپرست جناب نواب اکبر خان بگٹی کی گاڑی آ کر رکی۔ ان کی گاڑی بھی ایسی گاڑی تھی جیسے نواب خیر بخش مری کی۔ یعنی شیورلیٹ جس کی چھت کنورٹ ایبل تھی۔ یعنی سر سے دور کی جاسکتی تھی۔ ان دونوں نواب صاحب اکثر یورپین لباس میں ہوتے تھے۔ نواب صاحب نے سر پر ہَیٹ پہنا تھا۔ ہم دونوں بہت خوش ہوئے کہ نواب صاحب اپنی ادبی انجمن کے دفتر کو عزت بخشنے تشریف لائے تھے، مگر نواب صاحب نہیں اترے۔ ان کے نوکر نیجوان کے ساتھ تھے، آ کر ہمیں ایک لفافہ دیا اور جلدی واپس چلا گیا۔ فر سے کار چلی گئی۔ لفافہ غلام محمد نے کھولا اور پڑھا۔ اس میں نواب صاحب نے انجمن کے صدر کو مخاطب کر کے انگریزی میں لکھا تھا کہ انجمن کی کارکردگی اچھی نہیں اور وہ کام نہیں کر رہی۔ لہٰذا میں ایسی بے کار انجمن کی سرپرستی پسند نہیں کرتا۔

ہم اس تحریر سے بہت حیران ہوئے۔ اسے اپنے صدر گل خان تک پہنچایا۔ وہ بھی بہت حیران ہوئے۔ اس لیے کہ ابھی ہفتہ ہی نہیں گذرا تھا اور نواب صاحب نے صرف سو روپے دے کر

ہم پر اتنا بڑا الزام لگایا تھا۔ حالانکہ ہم نے کام شروع کیا تھا۔ چونکہ نواب صاحب اس وقت سیاسی نہ تھے، وہ سرکار کو خفا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ظاہر ہے گل خان نصیر اور ہم سب اب سرکار کی سیاہ فہرست میں داخل ہو چکے تھے اور سی آئی ڈی ہمارے پیچھے پیچھے پھر رہی تھی۔

بعد میں جب نواب اکبر خان سیاسی ہوئے اور خود سی آئی ڈی کے لیے زیادہ خطرناک ہوئے۔ وہ گل خان کی رفاقت میں بلوچی شاعری کے بہت دلدادہ ہوئے۔ ویسے بھی نواب صاحب کو بلوچی کلاسیکی ادب سے بہت شناسائی ہے۔ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں اور بلوچی ادب کے خصوصاً قدیم شاعری کے بہت شائق ہیں۔ اس کے علاوہ بلوچی ساز وموسیقی کے بارے میں بہت معلومات رکھتے ہیں اور اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کی اس ادب اور زبان دوستی کی وجہ سے جب صوبے میں ان کی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے فوراً بلوچی کے علاوہ پشتو اور براہوی کو سکول میں تعلیم کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے بچوں کو مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے کا مسلم اصول تسلیم کیا اور اس پر عمل کیا۔ ان کی حکومت ختم ہوئی تو تین سال تک مادری زبان میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہنے اور درسی کتب کی اشاعت پر کثیر رقم خرچ کرنے کے باوجود بلوچستان کے بچوں کو ان کے اس حق سے محروم کیا گیا۔ بجائے اس کے کہ اس فائدہ مند اصول پر عمل کر کے اسے ترقی دی جاتی، اسے بالکل ختم کر دیا گیا۔

ماہنامہ نوکیں دور، کوئٹہ۔ ستمبر 1993

۱۱

اس سے پہلے کہ میں دوبارہ لٹ خانہ کے بیان کو شروع کر کے جاری رکھوں۔ چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

میں نے ذہنی طور پر اپنی بیماری کے سبب لکھنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ میرے لیے لکھنا بڑا مشکل کام تھا۔ اگرچہ لکھنے کے لیے ذہن میں بے حد زیادہ مواد جمع ہورہا تھا۔ لیکن جب لکھنے کی کوشش کرتا تو ارادہ بدل جاتا۔ چیزوں کو ڈھونڈنا، کاغذ کو درست رکھنا، سطریں سیدھی لکھنا ...... یہ میرے لیے ناممکن ہورہے تھے۔ مجبوراً دلبرداشتہ ہوجاتا، یہ کام پس پشت ڈالتا اور انتظار کرتا کہ جب ٹھیک ہوجاؤں گا اور بایاں ہاتھ ساتھ دینا شروع کردے گا، تب لکھنا شروع کردوں گا۔ خیال یہ تھا کہ بیماری کا تیسرا سال شروع ہوگا۔ یہ تیسرے سال کی بات محترم عبداللہ حسین نے ذہن میں ڈال دی تھی۔ گذشتہ سال ستمبر میں جب (نہ جانے ستمبر تھا یا اکتوبر) اکادمی ادبیات کی کانفرنس میں اسلام آباد میں تھا تو عبداللہ حسین صاحب نے میری حالت دیکھ کر بتایا تھا کہ تیسرے سال آپ ٹھیک ہوں گے، میرے والد کو فالج ہوا تھا، تیسرے سال ٹھیک ہوگئے۔ لیکن یہ تیسرا سال طویل ہوتا رہا

ہے۔ وہاں شاہ محمد مری صاحب نے اب ڈنڈا اٹھایا ہوا ہے کہ لٹ خانہ لکھنا شروع کردو۔ گذشتہ سال سے یہی کہتا چلا آرہا ہے اور میں وعدہ کرتا چلا آرہا ہوں کہ ضرور شروع کردوں گا۔ مگر اب تک نہیں کرسکا۔

پھر میرے لیے یہ بھی مشکل بات تھی کہ سلسلہ کہاں چھوٹ گیا تھا، اور کہاں سے شروع کردیا جاتا۔ اس بہانے کو دور کرنے کے لیے وہ پھر نوکیں دور کا وہ پرچہ لائے جو کسور گردیزی صاحب کا نمبر تھا اور اس میں میری سابقہ آخری قسط لٹ خانہ کی چھپی تھی۔ اس طرح وہ کئی مرتبہ کہتے رہے۔ مگر میں بھی بہانے تراشتا رہا۔ اب کے شاہ محمد نے دوسرا طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ آخر میں پھنس گیا ہوں۔ دیکھئے اب لکھنے بیٹھا ہوں تو سطریں ٹیڑھی ہورہی ہیں۔ پنکھے کی ہوا کاغذ اڑا لے جارہی ہے۔ پوتے اور نواسے تنگ کررہے ہیں۔ کوئی کاغذ اڑا لے جاتا ہے تو کوئی قلم چھین لیتا ہے۔ میں چلّاتا ہوں۔ مگر شاہ محمد کا ڈنڈا، محبت اور خلوص کام کرنے پر آمادہ کیے رکھتا ہے۔ انشا اللہ اب گاڑی چل پڑی ہے۔ یہ کام اختتام تک پہنچانے کا ارادہ کیا۔ اس کے علاوہ بھی لکھتا رہوں گا۔

ارادہ ہے کہ اب مزید صحت یابی کا انتظار نہیں کروں گا۔ اسی حالت میں قارئین کے لیے اظہار خیال کرتا رہوں گا۔ تحریری صورت میں زندگی کو سماج کے کام میں لانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ زندہ رہنے کا مقصد بھی تو یہی ہے۔

مجھے امید ہے کہ شاہ محمد اور نوکیں دور کو پڑھنے والے میرے سابقہ گناہ معاف کریں گے اور میری تحریر میں کمزوریاں اور فروگزاشتیں درگزر کریں گے۔

1951 کا آخر قریب ہورہا تھا۔ موسم خزاں شروع ہوا۔ ستمبر کے مہینے میں، اُس زمانے میں کوئٹہ میں خنکی ہوئی تھی۔ اب تو کوئٹہ کا موسم کافی بدل چکا ہے۔ لٹ خانہ اور اس کی ترقی پسندی کی خبر دور دور تک پھیل چکی تھی۔ بلوچستان کے اندر اور بلوچستان سے باہر ملک کے دوسرے شہروں تک؛ لاہور، کراچی، سکھر اور جیکب آباد سے ترقی پسند فکر سے وابستگی رکھنے والے جب بھی کوئٹہ آتے تو لٹ خانہ والوں سے ملنے کے لیے ضرور آتے۔ اس وقت میں اور خدائیداد جو اُن دنوں

خدائیداد صاحبی کے نام سے مشہور تھے، لٹ خانہ میں مقیم تھے۔ میں تو پھر بھی کبھی کبھار نوشکی اپنے گاؤں کا چکر لگاتا، اپنی فیملی سے ملنے جاتا۔ مگر خدائیداد جو اصل معنوں میں پرولتاری تھے، گھر بار سے نا آشنا تھے۔ وہ گلستان نہیں جاتے بلکہ گلستان کے احباب ان سے ملنے لٹ خانہ آتے۔ کبھی کبھی ان کے بھائی تشریف لاتے اور ہمارے پاس رہتے۔ نوشکی سے لوگ آتے اور ہمارے پاس ٹھہرتے۔ فی الحال سٹیشنری مارٹ کی کتابوں کی وجہ سے بلوچستان بھر کے اکلوتے کالج کے طلبا بھی لٹ خانہ آتے۔ ان میں جو ترقی پسند خیال رکھتے یا ادب سے شغف رکھتے یا قوم پرستانہ سیاسی افکار سے دلچسپی رکھتے، وہ بھی لٹ خانہ آتے۔ لٹ خانہ روشن فکری کا مقناطیس تھا جو سب کو کھینچ لاتا۔ امان اللہ گچکی، امان اللہ جمالدینی، عبدالحق محمد شہی، گل بنگلزئی، معصوم اچکزئی، ان کے ساتھی رحیم جو بعد میں برین کینسر کی نذر ہوئے، آتے۔ عبدالرحیم نہایت ہی خوبصورت اور ذہین اور خوش خلق جوان تھا۔ معصوم اچکزئی کا لنگوٹیا یار تھا۔

فیض صاحب اور ان کے ساتھی راولپنڈی سازش میں گرفتار ہوئے تھے۔ انہیں سزا ہوگئی تھی۔ پاکستان ٹائمز اور امروز پر پابندی تھی کہ چھاؤنی میں تقسیم نہ کیا جائے۔ وہاں سے لوگ انہیں پڑھنے کے لیے لٹ خانہ آجاتے۔ جناب کامل القادری کی وجہ سے ان کے کئی دوست لٹ خانہ آئے۔ ان میں سے ایک ذاکر صاحب ہوا کرتے تھے، انہیں ترقی پسندی کا بے حد شوق تھا۔ لیکن نہایت محتاط تھے۔ ہمیشہ اس خوف میں رہتے کہ سی آئی ڈی ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ اس زیادہ خوف نے انہیں دیر تک لٹ خانہ سے وابستہ رہنے نہیں دیا۔ نہ جانے پھر کیسے غائب ہوئے۔

میر بہادر خان بنگلزئی کوہلو میں تحصیلدار تھے۔ کمال خان ژوب اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ کوہلو سے ہو کر لٹ خانہ پہنچے۔ ان کے ہمراہ میر بہادر خان کے چھوٹے بھائی ہدایت اللہ اور ان کا بیٹا عبدالسلام آئے۔ انہیں بعد میں سکول میں داخل کرایا گیا۔ میرے چچا زاد بھائی اور سالا عبدالقیوم بھی ہمارے ساتھ لٹ خانہ میں رہتے تھے اور سکول پڑھنے جاتے تھے۔

گویا لٹ خانہ کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر کمرہ ایک وڈو ہٹ (widow Hut) تھا۔ کچھ اندر سوتے کچھ باہر انگور کے سائبان کے نیچے رات گزارتے۔

شیر محمد مری سے غائبانہ تعارف سکول کے ایام میں ہوا تھا۔ جو ہمارے ایک مشترک اور محترم استاد جناب خدابخش صاحب چغتائی کڑکی کے توسط سے 1938 میں جب ہم آٹھویں کلاس کے طالب علم تھے۔ میں گورنمنٹ مڈل سکول نوشکی میں پڑھتا تھا اور شیر محمد گورنمنٹ مڈل سکول لورالائی میں شاید اسی کلاس میں پڑھتے تھے۔ بلوچستان بھر میں سکول کی فیسوں کے خلاف ایک ہڑتال ہوئی، مولانا خدابخش صاحب نے جو مختلف سکولوں میں ٹیچر رہے تھے، ہم چند طالب علموں کا رابطہ کرایا تھا۔ یعنی ایک دوسرے سے متعارف کرایا تھا۔ ژوب میں کمال خان شیرانی اس کلاس کے طالب علم تھے۔ بلوچستان کی یہ پہلی سکول ہڑتال تھی۔ میں نے شاید پہلی مرتبہ یہ لفظ سنا اور مجھے پتہ چلا ہڑتال کیا ہوتی ہے۔ کانگریس کی سیاسی پارٹی کے تحت بلوچستان میں بھی چند باشعور لوگ سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ہڑتال برٹش دور میں ہوئی تھی۔ ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن مسٹر ولسن نے سکولوں میں فیس کا سلسلہ شروع کروانا چاہا۔ بلوچستان بھر میں اس کے خلاف ہڑتال ہوئی۔ نہ جانے سیاسی لوگوں کا اس ہڑتال میں ہاتھ تھا یا نہیں۔ بہر کیف ہم میں سے ہر ایک نے اپنے سکول میں اس ہڑتال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ کانگریس اور جمعیت علمائے ہند کے لیڈروں مثلاً خان عبدالصمد خان اچکزئی، محمد حسین عنقا، میر شہباز خان نوشیروانی اور مولانا غلام حیدر نوشکوی نے سکول ہڑتال کی حمایت کی اور طلبا کی راہنمائی کی۔ ہم نے خان صمد خان کو نوشکی بلایا۔ وہ چونکہ مصروف تھے، میر شہباز خان نوشیروانی کو ہمارے پاس نوشکی بھیجا۔ اس کے علاوہ مولانا غلام حیدر نوشکوی نے طلبا کو خطاب کیا اور ہڑتال کی حمایت کی تھی۔ مگر میری ذاتی پہلی ملاقات شیر محمد مری سے شاید 1948 کی شروعات میں ہوئی۔

ماہنامہ ''نوکیں دور'' کوئٹہ، جولائی 1995

۱۲

لٹ خانہ کی گلی جو تھوڑی دور چکر کاٹ کر بلوچی سٹریٹ میں جاتی تھی ،اس کے بائیں جانب نگار پرویژن سٹور واقع تھا جس کا ذکر شاید میں پہلے کر چکا ہوں۔اسے چلانے والے ولی محمد اوران کے ساتھی پوسٹ مین عبدالکریم کے بارے میں بتا چکا ہوں۔اس سٹور میں کئی دلچسپ لوگوں سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں اوران میں لٹ خانہ اوراہل لٹ خانہ سے دلچسپیاں پیدا ہوئیں۔ ایک عجیب اورعوامی شخصیت حبیب اللہ کی تھی جو مستری محمد غوث کی طرح لٹ خانہ سے مستقل طور پر وابستہ ہوئے ۔حبیب اللہ کا تعلق افغانستان کے علاقہ گرم سیل وادی ہیلمند صوبہ نیمروز سے تھا۔انسان تلاش معاش کے لیے کہاں سے کہاں چل نکلتا ہے ۔حبیب اللہ، مینگل قبیلہ کی شاخ غیباڑی سے ہے۔اس کے آباؤاجداد مویشی بانی کرتے تھے اور وہ خود اس علاقے کے سنجرانی بلوچ جاگیرداروں کے گھروں میں محنت ومزدوری کر کے بڑا ہوا تھا۔چونکہ ان سنجرانی میں سے کچھ میرے رشتہ دار ہیں اس لیے حبیب اللہ کو مجھ سے دلچسپی ہوئی ۔افغان قافلوں کے ہمراہ بہتر زندگی کی تلاش میں نوکنڈی آیا تھا۔وہاں میرے بھائی آزاد صاحب جوان دنوں نوک کنڈی میں تجارتی کاروبار میں مصروف

تھے،ان سے حبیب اللہ کی ملاقات ہوئی تھی ۔آزاد صاحب اب تک نہ شاعر تھے اور نہ ادیب، محض نوکنڈی کے کئی کاروباری لوگوں میں سے ایک کاروباری تھے ۔ان کی دکان پر اکثر افغانستان اور ایران کے سمگلر، جنہیں قاچاق کہا جاتا تھا آیا کرتے تھے ۔ یہ لوگ اس سرحدی شہر میں بلوچی قالین اور دریاں اور کالا زیرہ پہنچاتے تھے اور یہاں سے شکر، جوتے ، اور کپڑے لے جاتے تھے ۔ افغانستان سے ایسے کئی بلوچ لڑکے اور جوان بچے تلاش معاش کے لیے نوکندی پہنچ جاتے ۔ پھر یہاں سے کوئٹہ یا پھر سندھ چلے جاتے ۔حبیب اللہ ایسے ہی لڑکوں میں سے ایک تھا۔ وہ کئی برس تک نوکنڈی میں مزدوری کرتا رہا تھا۔ پھر وہاں سے ریل کے ذریعے کوئٹہ پہنچا تھا۔کوئٹہ پہنچ کر وہ ریلوے میں قلی کا کام کرتا رہا تھا۔ پھر اچانک بیمار ہوا تھا اور سول ہسپتال کوئٹہ میں داخل ہوا تھا۔ وہاں سے صحت یاب ہو کر کسی مزدور دوست کے توسط بلوچی سٹریٹ اور نگار پرویژن سٹور پہنچا تھا۔ یہاں سٹور کے مالک ولی محمد نے حبیب اللہ کی بڑی دلجوئی کی اور انہی کے سبب لٹ خانہ سے وابستگی ہوئی۔

مجھے حبیب اللہ سے بڑی دلچسپی ہوئی اور میں انہیں لٹ خانہ لے گیا۔ وہ ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ ہمیں سوشلزم اور پھر میکسم گورکی کے افسانے اور سوانح حیات پڑھنے کے بعد عام مزدوروں سے بہت لگاؤ پیدا ہوا تھا ۔حبیب اللہ کی داستانِ حیات میں وہ مزہ تھا جو گورکی کے افسانوی محنت کشوں کی داستانوں میں تھا۔ حبیب اللہ کو لٹ خانہ اور اہل لٹ خانہ کی زندگی اوران کا لوگوں سے برتاؤ کا طریقہ پسند آیا، اوراس کا جی لگ گیا۔ یہاں انسانی برابری کا طریقہ حبیب اللہ کے لیے کچھ عجیب سا تھا۔اسے حیرانی ہوئی کہ سابقہ سرکاری ملازم اور آفیسر مزدوروں سے انسان دوستانہ رویہ رکھتے ہیں۔ حبیب اللہ کو لکھنے پڑھنے سے تو کبھی سروکار نہیں رہا تھا۔مگر لٹ خانہ کے رہنے والے دن بھر کتابیں پڑھتے تھے ،لیکن حبیب اللہ کو کبھی بھی یہ احساس نہیں دلایا گیا کہ وہ اَن پڑھ ہے اور اس کے دوست پڑھے لکھے ہیں۔ پھر جو کام لٹ خانہ میں ہوتا وہ سب مل کر کرتے۔ حبیب اللہ کو یہ ماحول بہت اچھا لگا۔

اب محمد غوث مدراسی اور ساتھی عبدالرزاق کے علاقہ حبیب اللہ بھی اہل لٹ خانہ کے ساتھی بنے۔اس طرح اب لٹ خانہ میں بلوچستان کے دور دراز علاقوں سے لوگ آ کر شامل ہونے

لگے۔اورنئی زندگی اورنئی طرزفکر سے متاثر ہونے لگے۔ژوب سے کمال خان شیرانی کی وجہ سے جناب کمال الدین شیرانی جو غازی کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں، کیونکہ وہ غزوہ کے لیے کشمیر گئے تھے۔ پاکستان بننے کے وقت بلوچستان سے کئی لوگ جذبہ اسلام سے مست ہوکر کشمیر کی جنگ میں شامل ہوئے تھے۔کمال الدین شیرانی صاحب بھی ان میں سے ایک تھے۔کمال خان صاحب ان کو جہاد کے سلسلے میں کبھی کبھی تنگ کرتے تھے۔لیکن لٹ خانہ میں رہ کر اس نئی فکر کے زیر اثر انہیں اپنے جہاد کی حقیقت سے آگاہی ہونے لگی۔کمال الدین صاحب بلوچستان کے پرانے سیاسی کارکن تھے اور پشتو کے شاعر بھی۔ایک اور خوبصورت اور نہایت خوش طبع نوجوان جلال خان شیرانی بھی لٹ خانہ آنے جانے لگے۔وہ لٹ خانہ کی فکر اور اہلِ لٹ خانہ کے طرز بود و باش سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ بعد میں نائب تحصیلدار ہوئے مگر لوگوں سے خصوصاً مزدوروں سے ان کا برتاؤ نہایت انسان دوستانہ تھا۔بدقسمتی سے وہ عین شباب میں ایک حادثہ کا شکار ہوئے۔جس کا دوسرے لوگوں کے علاوہ لٹ خانہ والوں کو بڑا دکھ ہوا۔

نوشکی سے میرے دو عزیز نوجوان جمالدینی محمد حنیف اور چندن خان بھی لٹ خانہ آتے تھے۔اور اس جدید فکر اور طرح زندگی سے اثر لینے لگے۔محمد حنیف جمالدینی جو پرانے سیاسی کارکن تھے، لٹ خانہ اور کمال خان اور خدائیداد سے بہت متاثر ہوئے ، اور ہمیشہ لٹ خانہ سے وابستہ رہے۔ آج تک ان کی فکر میں تبدیلی نہیں آئی اور ہر وقت اپنی داستانِ زندگی کو بیان کرتے ہوئے لٹ خانہ کے حوالے دیا کرتے ہیں۔وہ لٹ خانہ کے بہت ہی مخلص ساتھی تھے۔

اسی طرح میرے چچا صاحب میر یار محمد بھی اکثر لٹ خانہ آتے اور ہمارے ساتھ رہتے۔ ہمارے دوستوں اور ساتھیوں کی باتیں ان کو بہت پسند تھیں۔ بڑھاپے کے باوجود ان کی فکر جوان تھی۔ترقی پسند ادب کا بہت شوق سے مطالعہ کرتے تھے، اور لٹ خانہ کا ذکر کرتے وقت اس سے اپنی وابستگی پر فخر کرتے تھے۔شام کو ہمارے دو اور دوست اور میرے رشتہ دار مرحوم سلطان محمد جمالدینی اور محمد شریف ساسولی بھی لٹ خانہ آتے اور ہماری محفل کو رونق بخشتے۔ بہادر خان بنگلزئی کی وجہ سے اسپلنجی اور بارڑی سے مختلف قسم کے لوگ لٹ خانہ آتے۔ان میں محمد ہاشم بنگلزئی اور ملا

حبیب اللہ بنگلزئی قابلِ ذکر ہیں۔انہوں نے لٹ خانہ کی فکر اور طرز زندگی سے بہت اثر لیا۔ہاشم کو تو اب تک کمال خان یاد کرتے ہیں اور ہاشم بھی اب تک کمال خان کے مداح ہیں۔

کراچی اور خصوصاً اس وقت لاہور کے ترقی پسندوں سے تعلق بڑھتا جا رہا تھا۔لاہور اس زمانے میں ترقی پسند ادیبوں کا گڑھ تھا۔اس وقت تک دادا فیروز الدین منصور زندہ تھے۔ان کی بڑی تعریف ہوتی تھی۔ان کی کتابیں بہت مقبول تھیں لٹ خانہ میں۔ان کی کتاب ''مودودیات'' اور پاکستان میں قومیتوں اور زبانوں کے بارے میں ان کا پمفلٹ ہم سب نے پڑھے۔ان کے ترقی پسندانہ خیالات سے بے حد متاثر ہوئے۔اسی طرح کا ایک پمفلٹ غیور السلام کا پڑھا تھا۔سید سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض اُن دنوں جیل میں تھے۔امروز اور سبطے صاحب کا ہفتہ روزہ لیل ونہار پڑھتے۔پاکستان ٹائمز بھی پڑھنے کو ملتا۔فکر تونسوی، کنہیا لال کپور، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، ابراہیم جلیس، احمد عباس اور ملک راج آنند کے افسانے بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔اردو کے شاعروں میں فیض صاحب سرفہرست تھے۔احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، اسرار الحق مجاز، ظہیر کاشمیری کو بہت پڑھتے۔ ملک پناہ صاحب بھی اردو کے ترقی پسند ادب کے شائق تھے۔ رات کو خوب محفل ہوتی۔ غلام جان شاہوانی کے ہمراہ ان کے ماموں محمد حیات صاحب بھی آیا کرتے۔ اکثر ترنم اور کورس میں ان شعرا کی منتخب نظمیں گا کر پڑھتے۔ جوانی اور عمر کا تقاضا تھا کہ یہ عشقیہ نظمیں گا کر پڑھی جاتیں۔غلام محمد شاہوانی کا انتخاب بہت اچھا ہوتا تھا۔کورس اور کبھی کبھی قوالی کو لیڈ وہی کرتے تھے۔قرۃ العین طاہرہ کی مشہور فارسی نظم جسے علامہ اقبال نے ایک مجموعہ فارسی غزلیں میرے خیال میں ''جاوید نامہ'' میں دہرایا ہے، اسے خوب گا گا کر سناتے اور اس سے سب محظوظ ہوتے۔ مجاز کی نظم ''اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں'' خوب گاتے تھے۔

لٹ خانہ میں بہت ہی مشہور ناول پڑھے۔اردو ادب کی اچھی اچھی کتابیں؛ ایک ملک دو کہانی، چالیس کروڑ بھکاری، لکھپت جیل کے دن، جیل کی راتیں، کال کوٹھڑی، سیفٹی ریزر، وغیرہ وغیرہ۔یہ تمام کتابیں دستیاب تھیں۔کالج کے لڑکوں نے لٹ خانہ کا رخ کیا۔اکثر کتابیں لے جاتے۔پڑھ کر واپس لاتے۔اس طرح ہمیں خوشی ہوتی کہ ہم اپنی ترقی پسندانہ فکر کو پھیلا رہے تھے۔

لٹ خانہ کا چرچا خوب ہونے لگا۔ سی آئی ڈی بھی زیادہ متوجہ ہوئی۔ ہمیں خوف کی بجائے خوشی ہوتی۔ مہم جویانہ عمر کا تقاضا بھی یہی تھا کہ کمیونزم کا الزام خوب لگنے لگا۔ ترقی پسند ادیبوں کو یوں بھی ملک میں اسی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور کمیونسٹ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ نوجوانوں میں ترقی پسند ادب سے لگاؤ لٹ خانہ نے پیدا کیا۔ شہر جاتے تو لوگ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے۔ روزانہ صبح شام ڈان ہوٹل میں نشستیں ہوتی۔ شورش صاحب، یوسف غلزئی، عبدالصمد درانی اور بہت سارے سیاسی کارکنوں اور صحافیوں سے ملاقاتیں ہوتیں اور تبادلہ خیال ہوتا۔ لٹ خانہ والوں سے ہر قسم کے لوگوں میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ لٹ خانہ والے بھی ہر مکتب فکر کے لوگوں سے بحث کرتے اور ان میں دلچسپی لیتے۔

ڈان ہوٹل کے پاس شام کے وقت واچ ٹاور سوسائٹی کے مسیحی مبلغین سے واقفیت ہوئی۔ وہ اپنا رسالہ واچ ٹاور ہمیں دیتے۔ کمال خان اور خدائیداد صاحب کی ان سے بہت دوستی ہوئی۔ ان میں ایک صاحب کا نام Joe تھا اور دوسرے کا ایلن۔ انہیں لٹ خانہ میں دعوت دی گئی۔ ایک دوپہر کو انہیں آلوؤں کا مزیدار طعام پیش کیا گیا۔ ہم نے ان کے ساتھ خوب محفل کی اور ان کی محبت کا خوب مزہ لیا۔ حبیب اللہ اور مستری محمد غوث بھی شریک ہوئے۔ کمال خان نے خوب بحث کی۔

رات کو ایک نوجوان اکثر ہمارے پاس آتے اور کبھی کبھی لٹ خانہ کے قریب اپنے گھر کھانے پہ ہمیں بلاتے۔ میں اور خدائیداد چلے جاتے۔ ان کو ترقی پسند تحریک سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ بلوچستان میں آباد ایک پرانے ہندوستانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نام مشکور احمد تھا۔ بعد میں وہ سکھر چلے گئے اور ان سے بہت عرصہ تک دوستی قائم رکھی۔ وہاں وہ مشہور ترقی پسند صحافی پیکر نقوی کے ہمراہ رہے۔ بعد میں وہ ابنِ ایوب کے نام سے مشہور ہوئے۔ مزدور لیڈر بنے اور مزدوروں کے پرچہ منشور کے ایڈیٹر بنے۔

اسی اثنا میں ایک نوعمر اور خوبصورت اچکزئی نوجوان سے لٹ خانہ کے توسط سے واقفیت ہوئی۔ یہ نوجوان جعفر خان اچکزئی تھے۔ جعفر خان مشہور سیاسی شخصیت جناب ایوب خان اچکزئی کے فرزند ارجمند ہیں۔ ان سے ایک روز سبزی مارکیٹ میں ایک آڑھتی کی دکان میں تعارف ہوا۔

کمال خان اور خدائیداد مجھے ساتھ لے گئے تھے۔ جعفر خان کے والد جناب ایوب خان پشتونستان کی تحریک سے متاثر ہو کر کئی دیگر پشتون ہم فکر لوگوں کے ساتھ افغانستان فرار ہوئے تھے۔ اور وہاں پشتونستان کے اہم لیڈروں میں سے تھے۔ ان کے بعد ان کے اس نوعمر بیٹے جعفر خان پر تمام ریاستی عذاب نازل ہوئے۔ انہیں گرفتار کیا گیا۔ اور کئی عرصہ مچھ کے بدنام جیل میں قید تنہائی میں رہے تھے۔ مگر انتہائی باوقار اور باحوصلہ نوجوان ثابت ہوئے۔ وہ عمر بھر سرکار اور سی آئی ڈی کی مصیبتوں میں مبتلا رہے۔ میں اس نوجوان سے بہت متاثر ہوا۔ بعد میں ان سے لٹ خانہ والوں کی بہت گہری وابستگی ہوئی۔ اکثر ان کے گھر واقعہ کلی شیخان، ارباب کرم خان روڈ کے قریب جاتے۔ ان کی دعوتیں ہمیشہ لٹ خانہ والوں کی لیے باعث تفریح ولذت کام دہن ثابت ہوتیں۔

جناب کامل القادری صاحب بھی اکثر ہمراہ ہوتے جن سے جعفر خان کی بڑی دوستی تھی۔ جعفر خان کے چھوٹے بھائی معصوم خان لٹ خانہ کی فکر سے بہت متاثر ہوئے اور اکثر خود اور ان کے دیگر نوجوان ساتھی آتے اور کتابیں لے جاتے۔ پشتو ادب کی نشستوں میں ایک بزرگ جناب ملک شیر محمد غلزئی کے علاوہ ادبی ٹولی میں زیادہ دلچسپی لینے والے ملک یوسف پیر علی زئی بھی لٹ خانہ آتے تھے۔ اسی طرح کئی اور پشتون حضرات جنہیں سیاست میں دلچسپی کی وجہ سے لٹ خانہ سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، آتے۔ اس طرح اب لٹ خانہ کو کمیونزم کے ساتھ ساتھ سرکار اور اس کی سی آئی ڈی نے پشتونستان تحریک سے جوڑ دیا تھا۔ اب لٹ خانہ اور اس کے رہنے والوں کی نگہداری زیادہ دلچسپی اور ہوشیاری سے کی جانے لگی۔

اب گرمیوں کا زمانہ ختم ہوا اور خزاں کا موسم بھی اختتام کو پہنچنے لگا تھا۔ کمال خان نے تجویز پیش کی کہ سردیوں میں سبی میلہ میں شرکت کے لیے میر بہادر خان سبی آئیں گے اور وہیں کافی دن رہیں گے۔ ان کے پاس سبی چلا جائے۔ تجویز اچھی تھی، میں نے تسلیم کیا۔

مگر اُن دنوں فی الحال اسٹیشنری مارٹ کی جو پونجی تھی، لٹ خانہ میں خرچ کر بیٹھے تھے۔ مالی حالت کمزور ہو گئی تھی۔ ایک دو عدد پرانے زمانے کے ڈرائی سیل اور بیٹری والے ریڈیو ہمارے پاس تھے، وہ بیچ کر کھا بیٹھے۔ بیچنے کا اہتمام ہمارے دوست آدم علی بورہ نے کیا۔ اب روزگار کے

لیے سوچنے لگے۔ خدائیداد صاحب نے ہمت کی اور مشن ہسپتال میں وہاں کے یورپین ڈاکٹروں کو جن سے ان کی اچھی خاصی جان پہچان پیدا ہو چکی تھی، پشتو پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سے وہ کچھ کما کر لاتے۔ میں نے بھی ایک خاتون کو انگریزی پڑھانا شروع کیا۔ ماہانہ 30 روپے ملتے، وہ بھی لٹ خانہ لاتا۔ اپنے گھر اور بچوں کا کوئی خیال تک نہ تھا۔ وہ میرے چچا جان سنبھال رہے تھے۔ میر بہادر خان کے یہاں سے اسپلنجی سے گندم آتی، وہ پسوا کر روٹی پکواتے۔ مجھے تو سردیوں کی چھٹی ملی۔ اب خدائیداد کے بارے میں یاد نہیں کہ وہ بھی سبی جانے کے لیے تیار ہوئے تھے یا نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ میں اور کمال خان سبی جانے کی تیاری کرنے لگے اور سبی میلہ کے ایام میں کوئٹہ چھوڑ کر چلے گئے۔ لٹ خانہ میں خدائیداد اور حبیب اللہ رہ گئے۔ وہاں میر بہادر خان صاحب پہلے سے موجود تھے، ہم ان کے ساتھ رہنے لگے۔ حاجی سلطان احمد بنگلزئی وہاں موجود تھے، سب انتظام ان کا تھا۔ ہم سب مزے میں رہے۔ اچھا کھانا اور آرام کی زندگی۔

سبی کے سرما کے چند دن میرے لیے زندگی کے یادگار دن تھے۔ ایک تو میر بہادر خان اور ان کے عزیزوں کی محبت اور مہمان نوازی، اس سے زیادہ یہاں میرے مشغلہ کا جو اہتمام بہادر خان نے کیا تھا، وہ میری ذہنی اور فکری دنیا میں علم کا اضافہ تھا۔ اس علم کا تعلق میری ذات اور میرے مقاصد سے تھا۔ بہادر خان صاحب جو مری علاقہ کوہلو کے تحصیلدار تھے اور کچھ عرصہ سے وہاں رہ رہے تھے۔ لٹ خانہ کی تحریک کے زیر اثر وہ سرکاری افسر نہیں رہے تھے بلکہ عوامی خدمت گار کی حیثیت سے وقت گزار رہے تھے۔ وہ اس محبت اور خصوصیت کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول ہو رہے تھے۔ ویسے بھی اپنے حُسنِ اخلاق کی وجہ سے جہاں بھی ملازمت کے دوران رہے، لوگ ان سے خوش رہے جبکہ مفاد پرست ان سے ناراض رہے۔ کمال خان کا بھی یہی حال رہا تھا۔ خیر کمال خان نے تو ملازمت احتجاجاً چھوڑ دی تھی جس کا ذکر آ چکا ہے۔ بہادر خان صاحب نے بھی جب ملازمت چھوڑ دی تو کوہلو کے تحصیلدار تھے اور یہ ان کی ملازمت اور تحصیلداری کے آخری ایام تھے۔

میرے ساتھ ان کے کئی احسانوں کے علاوہ سب سے بڑا احسان جو یہاں سبی میں انہوں نے کیا وہ ایک ایسی ہستی کو کوہلو سے بلا لائے تھے جو میرے لیے بلوچی کلاسیکی ادب کا خزانہ

تھا۔ وہ ہستی مرحوم محمد اکبر بجارانی کی تھی۔ جنہیں ان کے عزیز محمند کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان کی بینائی صحیح نہ تھی، بس گزارہ کرتے تھے۔ وہ ہر روز میر بہادر خان اور حاجی سلطان احمد بنگلزئی کے گھر آتے۔ میں اور کمال خان بھی ان کی بیٹھک میں مقیم تھے۔ وہ بلوچی قدیم اشعار سناتے اور میں انہیں قلم بند کرتا۔ کئی روز مسلسل ہم یہ کام کرتے رہے۔ محمد اکبر کے پاس بلوچی اشعار کا بڑا سرمایہ تھا، وہ اپنے اس علم میں بہت مستعد اور قابل تھے۔ وہ نہایت ہی شستہ زبان اور باوقار انداز میں بلوچی اشعار سناتے۔ مجھے ان اشعار کو تحریر میں لانے میں بہت کم دِقت ہوئی۔ ویسے یہ کام جیسا کہ میں نے ذکر کیا تھا، عرصہ سے کر رہا تھا۔ کئی لوگوں کی زبان اور یادداشت سے اشعار قلم بند کر رہا تھا۔ مگر دیگر کے ساتھ اِس کام میں مجھے کافی دقت پیش آئی، محمد اکبر کے ساتھ کام کرنے میں کوئی دِقت نہ تھی۔

میں نے بلوچی کلاسیکی شاعری کا اچھا خاصا سرمایہ اس طرح جمع کیا اور بہت ہی زیادہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اب محسوس ہو رہا تھا کہ میری زندگی واقعی با مقصد ہو رہی ہے۔ ملازمت چھوڑ کر ہم نے اچھا کیا تھا۔

لٹ خانہ کے اب دو سال پورے ہو رہے تھے۔ اس دو سال میں میری فکری دنیا کافی بدل چکی تھی۔ گورکی، کرشن چندر اور ترقی پسند ادیبوں اور مصنفین نے ہمیں بہت کچھ دیا تھا۔ ذہن کو وسیع بنا دیا تھا۔ ادب اور فلسفہ نے زندگی کے مقاصد کو واضح کر دیا تھا۔ اب بلوچی قدیم شاعری کی اہمیت اور اپنی زبان کے سرمایہ کو ٹھیک طرح سے سمجھنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ محمد اکبر نے گویا بلوچی ادب کی حقیقتوں سے آگاہ ہونے میں میری اور بھی مدد کی۔ چاکر، بی ورغ، شہداد، ریحان، ہیبتان، گوئہرام، ماہناز، بالاچ وغیرہ وغیرہ سے منسوب اشعار نے بلوچی زبان کی گراں مائیگی، اس کے حسن اور ہستی سے آشنا کر دیا۔ بلوچی زبان کے بارے میں میری معلومات اور لغت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ عجیب بات ہے کہ میں تھا تو بلوچ، زبان بھی بلوچی بول رہا تھا مگر اس زبان اور اس کی ہستی سے کس قدر ناواقف و نابلد رہا تھا۔ اب مجھے اتنا اچھا استاد ملا تھا۔ میں زندگی بھر ان کا شکر گزار رہا ہوں۔ محمد اکبر بلوچی زبان کا میرا پہلا اور نہایت قابل استاد تھا۔

محمد اکبر بلوچی اشعار بیان کرتا رہا اور میں لکھتا رہا۔ جہاں کہیں مجھے الفاظ کے معنی نہ

آتے، ان سے پوچھتا۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ انہیں الفاظ کے معنی سمجھانے میں مشکل پیش آتی۔ کیونکہ کئی الفاظ آج کل استعمال میں نہیں آتے اور متروک ہو چکے ہیں۔ بہر کیف وہ جس طرح مطلب لیتے، مجھے سمجھاتے۔ کمال خان اور میر بہادر خان پاس بیٹھتے۔ بہادر خان تو خیر اشعار سمجھ لیتے کیونکہ بنگلزئی قبیلہ کا بہت بڑا حصہ بلوچی بولتا ہے۔ وہ مشرقی بلوچی بولتے ہیں اور پڑ رند ہیں۔ لہٰذا پورے قبیلہ کے لوگ ذولسان یعنی بلوچی اور براہوئی دونوں زبانیں بولتے اور سمجھتے ہیں، ہمارے نوشکی کے لوگوں کی طرح۔ کمال خان بھی دلچسپی لیتے اور بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے۔

ایک روز ہم نے چاکر کے قلعے کو دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ کیونکہ کلاسیکی بلوچی اشعار میں سیبی، چاکر، رندوں اور اس قلعہ کا ذکر آتا اور اس تمام شاعری کا پس منظر سبی، دھاڈر، کچھی ہے اور تمام واقعات کو اس سرزمین کے ماحول میں بیان کیا گیا ہے۔

حاجی سلطان احمد بنگلزئی نے ازراہِ مہربانی کیمرے کا بھی اہتمام کیا تھا تا کہ اس قلعہ اور اس کے کھنڈرات کی تصویریں لی جائیں۔ ہم روانہ ہوئے، حاجی صاحب، میر بہادر خان ہمارے استاد محمد اکبر، کمال خان، (میر کمال خان جیسے کہ اکثر بلوچ انہیں کہتے تھے) اور میں۔ قلعہ مغرب کی جانب ہے اور ہم شہر سے تھوڑے فاصلے پر ریلوے لائن کو عبور کر کے پرانے کھنڈرات کو پار کر کے جنہیں محمد اکبر نے چاکر کے دور کے شہر کے کھنڈرات بتایا اور اس وقت کے سبی کا شہر بتایا۔ بلوچی میں سبی کو سیبی کہتے ہیں۔ اور کہا کہ ارغون ترکوں نے بعد میں اس شہر کو رندوں پر حملہ کے وقت جلا ڈالا تھا۔ اس کے بعد ہم قلعہ کے اصل دروازہ یعنی گیٹ سے داخل ہوئے جو نہایت ہی نمایاں تھا (اُس وقت)۔ اس کے بالکل ساتھ اندر کی طرف نہایت ہی بلند اور وسیع ایک گنبد نما سٹور ہاؤس تھا۔ میں آثار قدیمہ کا ماہر نہیں کہ اس قلعہ کے عظیم گیٹ کی تعمیر کے بارے میں تفصیل میں جاؤں۔ البتہ میں اس کی عظمت سے متاثر ہوا، شاید جذباتی لگاؤ کی وجہ سے۔ قلعہ چاکر سے منسوب ہے اور اب تک جتنے اشعار محمد اکبر سے سنے تھے، چاکر کی عظمت ان میں نمایاں نظر آتی تھی۔ جب کولی (یا غلہ کا سٹور) جسے محمد اکبر نے بیان کیا، اسے غور سے دیکھا تو اوپر سے اس کا منہ کافی کھلا تھا اور اس کی اونچائی اندازاً پچاس فٹ تھی۔ وہ گول اور مخروطی بنا تھا۔ لیکن نیچے اس کی بنیاد کی وسعت بہت زیادہ

تھی۔ اکبر نے بتایا کہ اسے غلہ سے بھر دیا جاتا تھا۔ اور مشکل دنوں کے لیے اس میں غلہ سٹور کیا جاتا تھا۔ قلعہ کافی وسیع نظر آیا۔ دیواریں نہایت ہی موٹی اور چھوٹی تھیں۔

تمام اطراف میں دیواروں پر مردگرد یعنی سپاہی اور چوکیداروں کے گھومنے پھرنے کا انتظام کیا گیا تھا اور ہر طرف ترکش بنے ہوئے تھے۔ گیٹ کے بالکل مقابل سمت مغرب کی جانب رہائشی مکان تھے۔ محمد اکبر نے انہیں چاکر کا محل بتایا اور شے مرید و حانی کی شہرہ آفاق رومان حانی جسے چاکر نے (داستان کے مطابق چالاکی سے) شے مرید سے چھین کر اپنی رانی بنا دیا تھا، جو نہیں بننا چاہتی تھی، اسے حانی کی رہائش گاہ بتایا۔ ان تمام کی تصویریں حاجی سلطان نے لیں۔ ہم سب تصویروں میں موجود تھے سوائے حاجی صاحب کے، کیونکہ وہ کیمرہ مین کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ کیمرہ چھوٹا تھا اور اُن دنوں کیمرہ کے ریل بھی چھوٹے ہوا کرتے تھے اور بلیک اینڈ وہائٹ۔ ہم چاکر کے قلعہ سے اردگرد کا نظارہ بہ خوبی کر سکتے تھے؛ دور دور تک پہاڑوں کا حصار۔ سبی سے سولہ میل دُور ڈھاڈر کا تاریخی شہر۔ بلوچی اشعار میں کہا گیا ہے کہ ڈھاڈر میں چاکر کے چچا زاد بھائی میران رند نے اپنا قلعہ تعمیر کیا تھا۔

ڈھاڈر ہی سے رند و لاشار کی خون آشامیاں اور مخاصمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ ڈھاڈر میں ریحان رند اور رامن لاشاری کے گھوڑوں کی دوڑ میں رندوں کی ناانصافی کی وجہ سے دشمنی کی بنیاد پڑی۔ جس کے مطابق لاشاری نوجوان نے آگ بگولہ ہو کر گوہر مہیری کی اونٹنیوں کو ذبح کر کے رندوں کو مشتعل کر دیا۔ گوہر جو چاکر کی پناہ میں آئی ہوئی تھی۔

میرے لیے گویا محمد اکبر نے کلاسیکی شاعری میں بلوچ تاریخ کا ایک اہم باب کھول دیا تھا۔ جس سے میں اپنے ماضی میں جھانک رہا تھا۔

قلعہ سے اترتے وقت جب پرانے شہر کے کھنڈرات کو دیکھا تو اس میں واقعی راکھ ہی راکھ نظر آئی۔ محمد اکبر نے بتایا جب رند اور لاشاری ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں انتہا کو پہنچے اور کئی جنگیں لڑ چکے تو چاکر نے اپنی حمایت میں ایک تیسری طاقت کو اس جنگ میں ملوث کیا۔ اس طاقت نے پہلے لاشاریوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور بعد میں چاکر رند اور اس کی جنگی قوت کا جائزہ لیا

تو اسے بہت خستہ کمزور اور نڈھال پایا۔ اس کی نیت بدل گئی اور سبی پر قبضہ کرنے اور آگے بڑھنے کی ٹھانی۔ چاکر نے بھانپ لیا اور اس نے اور اس کے کارندوں نے سبی کو خالی کرنے کا سوچا۔ چنانچہ اسے خالی کر کے ملتان کا رخ کیا۔

ماہنامہ ''نوکیں دور'' کوئٹہ۔ اگست 1995

۱۳

یہ تھی چاکر کے قلعہ اور قدیم سیبی کی کہانی جو بلوچی قدیم اشعار کے حوالے سے محمد اکبر نے سنائی۔ ہم واپس اپنی دنیا اور سبی میں پہنچے۔ تقریباً میں نے اپنا کام ختم کیا ہوا تھا۔ ایک بیاض میں نے ان قدیم اشعار سے بھرلی تھی۔ میر محمد اکبر کا شکریہ ادا کیا اور ہر ایک پھر سے اپنے کام پہ لگ گیا۔

قدیم بلوچی شاعری اور سیبی کے بارے میں قارئین کو پھر کبھی بتاؤں گا۔ اس وقت صرف اتنا عرض ہے کہ سیبی میں ہر سال موسم سرما میں دربار اور سبی میلہ ہوتا چلا آیا ہے۔ شاید سیبی کی یہ بہت قدیم روایت ہے۔ نہ جانے کب یہ روایت شروع ہوئی تھی۔ ویسے سیبی کے ارد گرد چاکر اور اس کے رندوں کے دور سے بہت پہلے کے بلکہ کئی ہزار سال پرانے آثار دریافت ہوئے ہیں اور ماضی کو ٹٹولنے اور زمین میں مدفن معلومات کو کھودنے اور ظاہر کرنے کا یہ سلسلہ کئی سالوں سے شروع ہے۔ مہرگڑھ کے آثار کی کھدائی ختم ہوئی تھی اور یہ بتایا گیا ہے کہ مہرگڑھ کی تہذیب موہن جودڑو کی تہذیب سے کئی ہزار سال پرانی تہذیب تھی۔ یوں مہرگڑھ کی تہذیب کو نو ہزار سال پرانا بتایا گیا ہے۔ اس کے قریب ایک اور پرانے یادگاری ٹیلے کی کھدائی ہوئی ہے جو نوشہرو کے نام سے مشہور ہے۔ اسے دیکھنے کا اتفاق

ہوا تھا۔ جناب بشیر احمد بلوچ سابقہ چیئرمین بلوچی اکیڈمی کے ممبروں کے ایک ایسے گروپ میں میں بھی شامل تھا جو اسے دیکھنے کے لیے لے جایا گیا تھا۔ وہاں تمام ایشیا میں آثار کو تلاش کرنے کی فرانسیسی ٹولے کے سربراہ خود نوشہرو کے کام میں مصروف تھے اور اس عظیم علمی کام کی راہنمائی کر رہے تھے۔ وہ ہمیں خود اپنی گاڑی میں موقعہ پر لے گئے اور معلومات بیان کرتے رہے۔ اسی طرح وادی کیچ، مکران میں اطالوی ٹولہ پنوں قلات کی کھدائی میں اس وقت مصروف کار ہے۔ انہوں نے بھی بلوچی اکیڈمی میں آکر بتایا تھا کہ وہاں کے آثار بھی بہت پرانے ہیں اور موہن جودڑو کی تہذیب سے کئی ہزار سال پرانے ہیں۔ اب تک سلسلہ اور بھی نیچے چلا جا رہا ہے۔ دیکھئے علم انسانی میں کیا کچھ مزید اضافہ ہوگا۔ اور انسانی تہذیب کی قدامت کہاں تک پہنچے گی۔

بات سبی کے میلے اور اس روایت سے شروع کی تھی۔ یہ روایت اب تک برقرار ہے۔ ہر حکومت اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی چلی آرہی ہے۔ اب اسے ہفتہ سبی کا نام دیا گیا ہے۔ انگریز سامراج نے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ اور ایسے ہی ایام میں وہ رسوا کن تاریخی واقعہ پیش آیا تھا جس میں بلوچ سرداروں سے لاٹ کی بگی یعنی ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل کی بگی کھنچوائی گئی تھی۔ جس میں سراوان کے سردار اور چند اور بلوچ نواب اور سرداروں کو اس کام کے لیے بلایا گیا تھا۔ ان میں ایک بلوچ مجاہد نے جو بلوچ تاریخ میں سردار خیر بخش اول کے نام سے جانے جاتے ہیں، وہ مری قبیلہ کے سربراہ تھے، اس ذلیل سامراجی فرمان سے انکار کیا تھا۔ برطانوی سامراج نے بلوچستان کے بارے میں تمام واقعات یہاں تک کہ محراب خان شہید سے جنگ اور قلات پر قبضہ کے واقعات اور اس کی تصویر کشی کر کے ہمارے لیے باقی چھوڑا ہے۔ اسی طرح پشتون مجاہد سردار شاہجہان خان جوگیزئی کے قلعہ کو ڈائنامائٹ سے اڑانے کے واقعہ کو اسحاق بروس نے اپنی مشہور کتاب The Forward Policy میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مگر بگی کے واقعہ کا برطانوی دور کی تحریروں میں کہیں بھی ذکر نہیں۔ اس واقعہ کو بس ایک دوسرے عام بلوچ مجاہد نے جو شاعر تھا، اپنی شاعری میں محفوظ کر کے ہم تک منتقل کیا ہے اور بلوچوں نے ان اشعار کو سینہ بہ سینہ منتقل کیا ہے۔ یہ بلوچ مجاہد جو کسی طرح بھی نواب خیر بخش مری کی جرأت سے کم جرأت مند نہیں اور جس کا

کلام برطانوی سامراج کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے، ملا مزار بنگلزئی تھے۔ اس کے پشت پر نہ کوئی سردار تھا اور حمایت میں نہ کوئی قبیلہ۔ وہ تنہا تھا۔ اس نے اس واقعہ کو ایک ہی طویل نظم میں بلوچی براہوئی سندھی اور اردو میں بیان کیا ہے۔ اس طرح کہ جو سردار جو زبان بولتا تھا، اس کے الفاظ میں اور اے جی جی کے الفاظ اور اس کو جو جواب خیر بخش نے جواب دیا تھا، وہ اردو میں نظم کیا ہے۔

اس بہت بڑے جرم کی پاداش میں برطانوی حکومت اور اس کے آلہ کار سرداروں نے اپنی ندامت میں ملا مزار کو بلوچستان بدر کیا تھا۔ وہ تمام عمر جلاوطنی میں سندھ کے اس وقت کے مشہور شہر جیکب آباد (خان گڑھ) میں رہا۔ ملا مزار وہیں فوت ہوا اور وہیں مدفن ہے۔

افسوس ہے کہ اس تاریخی واقعہ پر تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ نظم محفوظ ہے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی کئی سال تک برطانوی حکومت کی روایت جاری رہی یعنی سرداروں کے لیے دربار اور انہیں خلعت سے نوازنے کی روایت۔ اب کہیں جا کر سرداروں کو اس ذلت سے نجات ملی ہے۔ اب سبی ویک یعنی ہفتۂ سبی کے نام سے اور میلہ مویشیاں کے طور پر یہ تاریخی روایت باقی ہے۔

ان ایام میں تقریباً تمام بلوچستان سے طرح طرح کے خیالات رکھنے والے اور سیاسی پارٹیوں کے کارکن اور راہنما سبی پہنچ جاتے۔ صحافی، ادیب، شاعر دانشور اور قسم قسم کے لوگ یہاں نظر آتے۔ ناٹکوں اور شعبدہ بازوں کے تماشے بھی ہوتے۔ سبی اور آس پاس کے عوام اس میں بہت جوش خروش سے شرکت کرتے اور نئے کپڑوں میں ملبوس ہو کر اپنی مسرت کا اظہار کرتے۔ سبی میں ان ایام میں عید کا سا سماں ہوتا ہے۔

بلوچ سیاسی راہنما اور کارکن ان دنوں سبی آئے ہوئے تھے اور مشہور تاریخی صحبت سرائے میں مقیم تھے۔ ملک عبدالرحیم خواجہ خیل، عبدالکریم شورش، ملک فیض جان، محمد ہاشم خان غلزئی، خان صمد خان شاید جیل ہی میں ہوں گے۔ محمد حسین عنقا اپنے رفیق شہزادہ عبدالکریم کے ہمراہ ہری پور جیل میں تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک روز میر گل خان نصیر، کمال خان، میر بہادر خان بنگلزئی اور مجھ سے

ملنے کے لیے حاجی سلطان احمد خان بنگلزئی کے مکان میں آئے۔ چونکہ باتیں سیاسی کرنی تھیں،اس لیے اس وقت سیاسی بندشوں اور سی آئی ڈی سے بچنے کی غرض سے حاجی سلطان احمد کے مکان کے پاس کھنڈرات شاید ایک اور پرانے قلعہ کے آثار میں ہم لوگ بحث کے لیے جمع ہوئے۔ مجھے اب ٹھیک یاد نہیں کہ میر گل خان کے ہمراہ کون تھے۔ شاید شورش صاحب ہوں گے۔ مگر مجھے بالکل یاد نہیں۔ البتہ کمال خان شیرانی، میں اور میر بہادر خان موجود تھے۔ بحث مسلم لیگ میں شمولیت کے بارے میں تھی۔ ان دنوں خان صمد خان ان کے علاوہ عنقا اور شہزادہ کریم اور ان کے دیگر ساتھی ملک سعید، میر عبدالواحد کرد وغیرہ بغاوت کے مقدمہ کی پاداش میں جیل میں تھے۔ نہ انجمن وطن اور نہ ہی قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی فعال تھے۔ سٹیٹ نیشنل پارٹی اور انجمن وطن دونوں پر میرے خیال میں پابندی تھی۔ میر گل خان اور شاید میر غوث بخش بزنجو اور ان کے رفقا کا خیال تھا کہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر کے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے جدوجہد شروع کی جائے۔ چپ بیٹھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

کمال خان شیرانی اور گل خان نصیر میں گرما گرم بحث شروع ہوئی۔ کمال خان مسلم لیگ میں شمولیت کی تجویز کے خلاف تھے۔ ویسے ہماری اب تک کوئی سیاسی ایکٹویٹی نہیں تھی۔ مگر گل خان مصر تھے کہ جب آدمی کو سواری کے لیے کوئی گاڑی نہ ملے تو پیدل چل کر وقت ضائع کرنے میں کیا فائدہ؟ کمال خان کہہ رہے تھے پیدل ہی چلنا چاہیے، آخر منزل کو پہنچ جائیں گے۔ بس یہی کچھ مجھے یاد ہے۔

شام کو صحبت سرائے سے ملحق مشرقی جانب میں ایک مسجد میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جلسہ عام ہونا تھا۔ اس کا اعلان ہو رہا تھا۔ بعد دوپہر جلسہ کا وقت مقرر کیا گیا تھا چنانچہ ہم وہاں پہنچے۔ عین جلسہ شروع ہونے سے چند منٹ پہلے میر غوث بخش بزنجو مسجد کے سامنے ایک جیپ میں سوار آ کر رکے۔ مجھے یاد ہے کہ میر صاحب نے قلاتی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اور ہاتھ میں 555 کا سگریٹ کا پیکٹ تھا۔ وہ نہایت چستی سے جیپ سے جست لگا کر اترے۔ ہم میں سے بیشتر جیپ کی طرف لپکے۔ ان سے مصافحہ کیا اور ہم سب جلسہ میں آئے۔

جلسہ کے بعد ہم منتشر ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک رات جب صحبت سرائے میر غوث بخش اور ان کے ساتھیوں سے ملنے گئے تو صحبت سرائے کے اصل گیٹ کے باہر سڑک کے اُس پار فٹ بال میدان میں ہم سب جا کر زمین پر بیٹھ گئے۔ چاندنی رات تھی، یہ یاد نہیں کہ کون لوگ تھے۔ بہت سارے ساتھی جمع تھے؛ کمال خان کی موجودگی مجھے یاد نہیں۔ میر غوث بخش بزنجو اپنی قلاتی ٹوپی میں اور ایک ڈفل کوٹ کندھوں پر ڈالے بیٹھے تھے۔ وہی بول رہے تھے۔ میرے خیال میں موضوع ''سیاسی سرگرمیوں کو کس طرح شروع کیا جائے'' ہی تھا۔ ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ میر صاحب کا کہنا تھا کہ مسلم لیگ کا چولا پہننا ہی پڑے گا۔ امریکہ ہمارے ملک میں سرگرم عمل ہے۔ مجھے (میر صاحب کو) تو سب سے پہلے دھر لیا جائے گا۔ بس اتنا یاد ہے۔

اس کے بعد نہ جانے کتنے روز اور رہ کر ہم کوئٹہ واپس ہوئے۔ میں اور کمال خان شیرانی۔ کیونکہ میر بہادر خان اس وقت تک ملازمت میں تھے اور ان کو واپس اپنی تحصیل کوہلو جانا تھا۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ ہم کیسے کوئٹہ پہنچے۔ البتہ یہ یاد ہے کہ لٹ خانہ پہنچ کر خدائیداد، حبیب اللہ، مستری محمد غوث جو ہمارے منتظر تھے، سے ملے۔

سردی کا موسم تھا۔ رات کے وقت لٹ خانہ کی کٹیا (Wido Hut) بہت ہی پرسکون اور آرام دہ محسوس ہو رہی تھی۔ دروازہ کے سامنے کونے میں انگیٹھی تھی۔ اس میں آگ بہت ہی خاموشی سے سلگ رہی تھی۔ دیگ میں کچھ پک رہا تھا۔ باورچی کا کام خدائیداد بہت ہی شوق سے انجام دے رہے تھے۔ انگیٹھی کے اوپر فرانس کی مشہور اور خوبصورت ہیروئن جون آف آرک (Joan of Arc) کی رنگین تصویر رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں آزادی کا علم بلند تھا۔ ساتھ ہی ایک اور رنگین اور خوبصورت پینٹنگ تھی، اس میں برطانوی مشہور شاعر دانتے (Dante) کو دکھایا گیا تھا۔ وہ دریا ٹیبر (Taber) کے اوپر ایک پل پر کھڑا اپنی محبوبہ بیٹریس (Beatrice) کا بے چینی سے منتظر تھا۔ سڑک کے پاس ایک پلازہ کے آگے سے بیٹریس اور اس کی ایک سہیلی دانتے کے پاس سے گزر رہی تھیں۔ بیٹریس کے ہاتھ میں گلاب کا ایک پھول دکھایا گیا تھا۔ مگر بیٹریس نہایت ہی بے اعتنائی سے دانتے کو جلانے کے لیے بنا دیکھے اور اس کی طرف بغیر توجہ دیے گزر رہی تھی۔ اور ایسا لگ

رہا تھا کہ دانتے حافظ شیراز لسان الغیب کا یہ شعر گنگنا رہا ہو اور اپنی محبوبہ کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہو؛

آنان کہ خاک ترا بہ نظر کجا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشم برما کنند

یہ نہایت ہی بے بہا پینٹنگ نہ جانے کہاں سے کمال خان کے ہاتھ لگی تھی اور خدائیداد نے ان سب قیمتی تصویروں کو فریم کروا کر لٹ خانہ کو پرکشش اور خوبصورت بنانے اور سجانے کے لیے اہتمام کیا تھا۔ ایک اور جانب انگیٹھی کے اوپر ایک اور تصویر آویزاں تھی۔ یہ تصویر مشہور چیک سورما، جولیس فیوچک کی تھی۔ جولیس فیوچک جو نازی ازم کے ظلم کا شکار اپنی کال کوٹھڑی میں اذیت گاہ میں روزنِ زنداں کے قریب کھڑا اپنے ہمدرد گارڈ کا بے چینی سے منتظر تھا کہ کب وہ آ کر اس سے کاغذ کا وہ پرزہ لے جائے جس میں جولیس فیوچک اپنا روزنامچہ قلم بند کیا کرتا تھا، جو بعد میں شائع ہوا تھا۔ جس کا ترجمہ ہم نے لٹ خانہ میں ''پھانسی کے سائے تلے'' کی ایک کتاب میں صورت میں پڑھا تھا۔

حبیب اللہ داش سے گرم گرم روٹی لے آیا تھا۔ اور ہم سب بے صبری سے منتظر تھے کہ کب خدائیداد اور حبیب اللہ کی دعوتِ شیراز سے لطف اندوز ہوں۔

بعد میں، میں نے اور کمال خان نے اپنے سبی کی مسافرت سے متعلق اپنے تاثرات میر بہادر خان، میر گل خان نصیر، میر غوث بخش بزنجو سے ملاقات اور گفتگو کے بارے میں بتایا۔

مجھے سب سے زیادہ اپنے ادنیٰ سرمایہ کے حصول پر ناز تھا جو بلوچی کلاسیکی شاعری کی صورت میں میں نے میر محمد اکبر کے گراں مایہ سینے سے قلمبند کیا تھا۔

اگلی صبح سے میں نے بلوچی کلاسیکی شاعری، جسے میں سبی سے لایا تھا، اسے ایک اور بیاض میں پاک نویسی کر کے منتقل کرنا شروع کیا۔ چند روز میں اس کام کو سرانجام دینے کے بعد اسے میں اپنے محترم دوست اور بلوچی کے شاعر میر گل خان نصیر کو دکھانے کے لیے سٹینڈرڈ ہوٹل گیا۔ ان میں سے کئی اشعار میں نے ان کو پڑھ کر سنائے۔ میر صاحب بے حد خوش ہوئے اور مجھ سے یہ بیاض اپنی قدیم شاعری کی کاپی میں نقل کرنے کے لیے مانگی۔ میں نے ان کی قدیم شاعری کی یہ کاپی ان سے پہلے لی تھی اور اسے لٹ خانہ لے جا کر پڑھ لیا تھا۔ اُن کے اس کام نے مجھ میں بلوچی شاعری کو

ڈھونڈ کر قلمبند کرنے کا شوق پیدا کیا تھا۔

میر گل خان نصیر نے (نہ جانے پہلے اس کا ذکر کیا ہے کہ نہیں) مجھے ایک نہایت ہی نایاب کتاب (The Popular Poetry of the Baloches) پڑھنے کے لیے دی تھی۔ یہ کتاب مشہور مستشرق (Orientalist) لانگ ورتھ ڈیمز کی تالیف ہے۔ اس کتاب کے بارے میں اس سے پہلے مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ یہ کتاب 1907ء میں دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی دو جلدیں تھیں۔ پہلی جلد میں بلوچی اشعار کا انگریزی میں ترجمہ ڈیمز نے کیا تھا اور بلوچی میں شاعری پر ناقدانہ مقالہ لکھا ہے۔ دوسری جلد میں ڈیمز نے ان اشعار کا رومن میں متن Text تالیف کیا ہے۔ بلوچ شعرا اور ادیبوں اور بلوچی پر دیگر یورپین کام کرنے والوں کی نگاہ میں ڈیمز کا یہ کام نہایت قیمتی اور بے مثال ہے۔ مشہور سکالر اور زبان شناس اور بلوچی پر کام کرنے والے نامور بلوچی شناس جوزف الفن بائین نے تو ڈیمز کو اپنا بلوچی پر کام کرنے کے لیے آئیڈیل بنایا ہے اور ڈیمز سے متاثر ہو کر اور اسی کی پیروی میں حال ہی میں جرمنی سے اپنی مشہور کتاب شائع کروائی ہے جو An Anthology of Classical And Modern Balohchi Literature کے نام سے مشہور ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ علیحدہ علیحدہ الفن بائین صاحب نے اس کام کی گلاسری (لغت) بھی شائع کی ہے۔ ڈیمز کی یہ کتاب برسوں سے نایاب تھی۔ بشیر احمد بلوچ صاحب کے دوران چیئر مین بلوچی اکیڈمی، انہوں نے بلوچی ادب کے شائقین کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے کہ کتاب ان کی لائبریری میں موجود ہو اور وہ بلوچی پر کام کرتے وقت اس کتاب سے استفادہ کر سکیں، ڈیمز کی کتاب The Popular Poetry of The Baloches کو دوبارہ شائع کیا ہے۔

میں نے اپنی مشکلات کو یاد کیا جو اشعار کو کسی دوسرے کی زبانی نقل کرتے وقت پیش آتی ہے۔ ڈیمز کے کام کا اندازہ لگانا شروع کیا تو ڈیمز کی کتاب اور اس کے اس کام کی قیمت مجھے بہت زیادہ معلوم ہونے لگی۔

میر گل خان نصیر کے کمرے میں اکثر غلام جان شاہوانی اور ملک محمد پناہ سے ملاقات

ہوتی تھی چونکہ بلوچی زبان وادب دیوان کے گل خان نصیر اور شاہوانی عہدیدار تھے۔ بلوچی ادب سے ہماری دلچسپی ظاہر ہے زیادہ تھی۔ ملک پناہ صاحب بھی بلوچی ادب کی طرف مائل ہوئے اور ادب میں ترقی پسند اردو ادب کے بارے میں بھی تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ میر گل خان نصیر اور ملک پناہ صاحب کا بھی ترقی پسند اردو ادب کے بارے میں مطالعہ اچھا خاصا تھا۔ غلام جان شاہوانی چونکہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھے تھے، ان کی اردو اچھی خاصی شستہ تھی۔ اور وہ بھی ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ گل خان سے ان کی بلوچی اور اردو شاعری اکثر سنتے تھے۔ ان کی اردو شاعری بھی بہت ہی اچھی اور متاثر کن تھی۔ خصوصاً ''راج کرے سردار رے بھیا'' سن کر بہت خوش ہوتے۔ انہی دنوں میر گل خان نصیر کے ساتھ والے کمرے میں ایک نہایت ہی خوبصورت اور خوش خلق نوجوان مقیم تھے۔ وہ اکثر میر صاحب کے پاس آتے۔ ان سے ہم سب کی دوستی ہوگئی۔ وہ نہایت پرکشش شخصیت کے مالک تھے اور جو بھی ان سے ملتا، ان سے ایسے واقف ہوتا گویا برسوں سے اسے جانتا ہو۔ ان کا نام فصیح اقبال تھا۔ ان سے ہم سب کی بہت ہی گہری دوستی ہوگئی۔ وہ تو شاید کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے۔ جیکب آباد سے آئے تھے۔ انہیں بلوچی اور بلوچستان والوں سے ایسی محبت ہو گئی کہ وہ ہمیشہ کے لیے بلوچستان کے ہو کے رہ گئے۔

فصیح صاحب سے ہمارے بہت ہی گہرے تعلقات ہو گئے۔ انہوں نے بھی صحافتی زندگی کی تازہ ہی ابتدا کی تھی۔ اس لیے میر صاحب سے ان کی وابستگی تھی۔ انہوں نے ہفتہ روزہ زمانہ نکالنا شروع کیا تھا۔ اس اخبار کا ڈیکلریشن جناب برکت علی آزاد صاحب نے لیا تھا مگر وہ خود جیکب آباد منتقل ہو گئے تھے۔ اخبار فصیح اقبال صاحب کے حوالے کیا۔ فصیح صاحب نے بلوچستان کی صحافت میں بڑا نام پیدا کیا۔ بلوچی زبان وادب کی ترویج میں ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ یہ ہفت روزہ زمانہ آج روزنامہ کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

اس طرح ادب کے ساتھ ساتھ ہماری صحافیانہ سرگرمیاں بھی شروع ہوئیں۔ میر گل خان نصیر کی قربت نے ادیب بننے کے علاوہ مجھے صحافی بھی بنایا۔

ماہنامہ ''نوکیں دور'' کوئٹہ۔ ستمبر 1995

۱۴

1952 کا نیا سال شروع ہو گیا تھا۔ یہ سال گذشتہ سال سے ہر لحاظ سے اہم اور بدلا ہوا نکلا۔ گذشتہ سال بلوچی زبان کا بلوچی ادب کی تاریخ میں پہلا ماہنامہ ''اومان'' کے نام سے کراچی سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے مدیر بلوچی زبان کے نامور ادیب اور سماجی کارکن جناب مولانا خیر محمد ندوی صاحب تھے انہوں نے بلوچی زبان کا ایک قاعدہ بھی شائع کیا تھا۔

لیکن 1952ء کا سال بھی بلوچی ادب کی تاریخ میں بہت اہم ثابت ہوا۔ گل خان نصیر نے بالآخر اپنا بلوچی کلام یکجا کر کے کتابت کے لیے دیا۔ کتاب کا نام انہوں نے ''گل بانگ'' رکھا۔ کتابت اس وقت کے کوئٹہ میں مشہور خوش نویس جناب برکت علی شہباز نے کی۔ برکت صاحب *نوائے بلوچستان* کی بھی کتابت کرتے تھے۔ *نوائے بلوچستان* کوئٹہ کے مشہور اردو پریس اسلامیہ پریس سے شائع ہوتا تھا۔ پریس کے مالک مرحوم حاجی محمد یوسف صاحب تھے۔ *گل بانگ* شائع ہوئی اور یہ کتاب ''بلوچی زبان وادب دیوان'' کی طرف سے شائع ہوئی۔ میں نے اس کتاب میں بڑی دلچسپی لی اور اسے فروخت کرنے کے لیے انتھک کوشش کی۔ کتاب کی قیمت 2 روپیہ تھی۔ مگر اس کم

قیمت پر بھی کوئی خرید نے والا نہ تھا۔آخر مجبور ہو کر گل خان نصیر کی ہدایت پر اسے مفت تقسیم کرنا پڑا۔

گل بانگ، بلوچی زبان کے سب سے بڑے شاعر گل خان نصیر کا پہلا شعری مجموعہ ہونے کے علاوہ بلوچی شاعری اور ادب کی سب سے پہلی کتاب تھی۔اس کتاب کی اشاعت میں بھی ''فکر لٹ خانہ'' کا بہت بڑا دخل تھا۔کتاب کی کئی کاپیاں ایران اور افغانستان کے بلوچ علاقہ میں بھیج دی گئیں۔اس طرح ان ممالک کے تعلیم یافتہ بلوچوں کو بلوچی ادب کی طرف متوجہ کیا گیا۔آج کئی ایرانی اور افغانی بلوچ ادیب اس کتاب کے مرہونِ منت ہیں کہ انہوں نے اس کی بدولت بلوچی میں لکھنا پڑھنا شروع کیا تھا۔ان میں سے کئی اب بلوچی کے مشہور ادیب ہیں۔سب سے نامور کابل یونیورسٹی کے مشہور استاد اور بلوچی ادب کے نامی گرامی ادیب اور محقق جناب عبدالرحمٰن پہوال ہیں۔پہوال صاحب نے افغانستان میں کئی بلوچی کتابیں شائع کر دی ہیں اور گل خان نصیر اور آزاد جمالدینی کی شاعری کے پشتو تراجم کر کے انہیں شائع کیا ہے۔اس کے علاوہ جدید بلوچ شعرا کے اشعار کا انتخاب شائع کیا ہے۔ایران میں چونکہ فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں کی ترویج پر پابندی رہی ہے، لہٰذا وہاں یہ کام سست رفتاری سے ہوا۔تاہم کئی ادیبوں نے اپنے طور کسی نہ کسی طرح اپنی تخلیقات شائع کی ہیں۔

گل بانگ کا اثر بہت زیادہ ہوا۔جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں نے گل خان نصیر کے اشعار کو ذوق وشوق سے پڑھا اور بلوچی شعر کہنے لگے۔گل خان نصیر کی شاعری نے جدید بلوچی شعرا کو بہت متاثر کیا۔*لٹ خانہ* اور اس کے باسیوں کی سرگرمیوں نے مختلف سیاسی حلقوں کو بہت تیزی سے اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔بالآخر سردار بہادر خان نے کوہلو ہی میں استعفیٰ دے دیا اور *لٹ خانہ* چلے آئے۔ان سے مزید برداشت نہ ہو سکا کہ ان کے ساتھی ملازمت چھوڑ کر *لٹ خانہ* میں رہیں اور وہ ملازمت میں رہیں۔ان دنوں سرکاری اور اس طرح کی انتظامی ملازمتوں سے استعفیٰ دینا آسان بات نہ تھی کیونکہ معاشی ڈھانچہ اور زندگی کے اہم کام سرکار سے وابستہ تھے۔مجھے یاد ہے کہ میں نے بڑی مشکل سے اپنے بزرگوں اور گھر والوں کو اپنے عوام کے سماجی اور سیاسی مقاصد کے لیے ملازمت چھوڑ کر لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کرنے کے بارے میں مطمئن کیا۔میری اکلوتی ہمشیرہ

میری ملازمت سے علیحدگی پر بہت برہم ہوئیں۔اسی طرح کمال خان کے والد بہت ناراض تھے۔انہوں نے *لٹ خانہ* آ کر چند روز قیام کیا اور سب کو سمجھانے کی کوشش کی۔ان کا کہنا تھا کہ تحصیلداری چھوڑنے سے ہمارے تمام معاملات برہم ہوں گے۔قبائلی حیثیت، مقدمات اور سماجی حیثیت...... وہ اپنے خیال میں ٹھیک تھے۔مگر ہمارے ذہنوں میں ایک اور سماج کا تصور جاگزین ہو رہا تھا۔لہٰذا وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہوئے۔خدائیداد پہلے ہی سے ایسے ماحول سے چھٹکارا حاصل کر چکے تھے۔وہ تو تھے ہی پرولتاری طبقے سے، یعنی نہ زر اور نہ زمین۔اور زن سے انہوں نے خود کو ویسے بھی تمام عمر آزاد کیا ہوا ہے اور اب تک ہم برہم چاریہ ہیں۔ان کے اور ان کے بھائیوں کے لیے نہ قبائلی مسائل تھے، نہ مقدمات۔اس لحاظ سے وہ ہم سب سے زیادہ خوش قسمت نکلے اور یہی وجہ ہے کہ وہ آخر دم تک اپنی نظریاتی اور فکری استقامت کو برقرار رکھ سکے ہیں۔

غلام محمد شاہوانی، ملک پناہ اور کامل القادری اکثر صبح وشام *لٹ خانہ* میں موجود ہوتے تھے۔انہیں کہیں اور وقت گزارنا پسند ہی نہ تھا۔میں صبح سٹینڈرڈ ہوٹل جاتا، گل خان نصیر کے پاس۔پھر اخبار ''نوائے بلوچستان'' میں کام کرنے پریس جاتا۔پھر *گل بانگ* کی طباعت کی نگرانی بھی کرتا۔سٹینڈرڈ ہوٹل میں گل خان نصیر اور ان کے سیاسی رفقا کے علاوہ غلام محمد شاہوانی اور ملک پناہ اکثر وہاں ملتے۔جب میر غوث بخش بزنجو کوئٹہ آتے تو اکثر گل خان کے قریب سٹینڈرڈ ہوٹل میں قیام کرتے اور ہم بیشتر وقت ان کی صحبت سے استفادہ کرتے۔وہ چونکہ خود کبھی کمیونسٹ پارٹی میں رہے تھے اور ان کا ترقی پسندوں سے گہرا تعلق تھا، اس لیے ہم *لٹ خانہ* والوں سے ان کو انس تھا۔*لٹ خانہ* والے بھی انہیں اپنا ہم خیال سمجھتے تھے۔اکثر *لٹ خانہ* بھی آتے تھے۔شورش بابو سے تو سٹینڈرڈ ہوٹل اور *لٹ خانہ* میں روزانہ ملاقات ہوتی۔یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ شورش بابو کا تعلق تو پہلے ہی سے کوئٹہ کے پرانے کمیونسٹوں سے رہا تھا۔اب اگرچہ وہ رہتے تو اپنے گھر میں بچوں کے ساتھ، مگر وہ تھے انہی لوگوں سے اور خود کو *لٹ خانہ* کا ہی باسی سمجھتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک رات مستری محمد غوث کی کٹیا میں جو جام منیر خان صاحب کے گھر کے عقب میں ان کے ایک اجڑے باغ میں واقع تھی؛ میں، خدائیداد، کامل القادری یکجا تھے۔کامل

نے ہمارا اسٹڈی سرکل لیا۔انہوں نے مارکس ،اینگلز کا کمیونسٹ مینی فیسٹو نکال کر ہمیں پڑھ کر سنانا شروع کیا۔اس کے بعد باقاعدگی تو نہ رہی کیونکہ کامل سیماب پا تھے،ایک جگہ ٹک نہیں سکتے تھے۔ کبھی کراچی، کبھی لاہور۔مگر ہم نے باقاعدگی سے مارکسی فلسفہ کا مطالعہ شروع کیا۔اسی طرح اور بھی بہت چیزیں زیرِ مطالعہ آرہی تھیں۔ ہمارے آگے مستقبل کا نقشہ کچھ اور بن رہا تھا۔ترقی پسند ادب نے ہمارے ذہنوں کو یکسر بدل دیا تھا۔سماجی برابری، انسان دوستی، عام اور کچلے ہوئے انسانوں سے دوستی، مذہبی، لسانی اور نسلی بنیادوں پر لوگوں میں امتیاز کرنا ہماری نگاہ میں گناہ تھا۔تمام انسانوں کے مذاہب، زبان، نسل کو اچھا سمجھنا اور سب کے کلچر، ادب اور روایات کو احترام سے دیکھنا ہمارے لیے لازمی تھا۔ ہر گرتے کو تھامنا اور اس کی مدد کرنا ہمارے لیے لازم تھا۔اسی طرح لوگوں کا رویہ بھی ہمارے بارے میں بدل گیا جو ہمارے اعتقادات اور خیالات سے متفق نہ تھے، ہمیں برا سمجھنے لگے۔ اور جو ہمیں اپنا دوست سمجھتے تھے، وہ ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے۔

زندگی کے حقائق رفتہ رفتہ ہمارے آگے واضح ہوتے جا رہے تھے۔ ہمیں پتہ چلا کہ مذاہب، عقائد، زبانیں، طبقات کس طرح تشکیل پاتے ہیں۔سماجی نابرابری کی وجوہات معلوم ہونے لگیں۔ ذہنوں نے سماج کے ان تمام مسائل کا حل سوشلزم کو قبول کیا۔گویا فکری طور پر ہم سوشلسٹ ہوگئے۔ یہ نتیجہ تھا ہمارے مطالعہ کا۔ترقی پسند ادب اور اس کی وجہ سے مارکسسٹ لٹریچر کے مطالعہ نے ہمیں اس نظریہ کو قبول کرنے میں مدد دی۔ اس کی وجہ سے ہم سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ممالک اور سیاسی تحریکوں کے حامی ہوگئے۔لٹ خانہ نے ہمارے لیے سیاسی اور فکری تربیت گاہ کا کام کیا۔ ہمارے توسط سے بلوچستان میں نوجوان طالب علموں اور لوگوں میں لٹ خانہ کی یہ فکر پھیلنے لگی۔اس کی وجہ سے سیاستدان اور وہ لوگ جو سیاسی کام کر رہے تھے یا کرنا چاہتے تھے، وہ لٹ خانہ اور اس کے باسیوں کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے علاوہ ادبی حلقوں کو بھی لٹ خانہ نے متوجہ کیا۔گویا بلوچستان میں لٹ خانہ ایک مقناطیس کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا، جس کی وجہ سے حکومت اور اس کی سی آئی ڈی پریشان ہو رہی تھی اور لٹ خانہ روز بروز ان کی اس پریشانی میں اضافہ کر رہا تھا۔

کمال خان تو بیشتر وقت لٹ خانہ سے باہر اپنے علاقہ میں رہتا تھا اور وہاں اپنے طریقوں سے اس فکر کو نہایت ہوشیاری اور حکمت عملی سے پھیلا رہا تھا۔مگر اس وقت میں اور خدائیداد کوئٹہ، یعنی بلوچستان کے مرکز میں لٹ خانہ میں موجود تھے۔لہٰذا ہمارے چاروں طرف سی آئی ڈی مصروف کار تھی اور ہماری رپورٹ باقاعدگی سے حکومت تک پہنچتی تھی۔آخر الامر ایک روز میرے اور خدائیداد کے لیے ڈپٹی کمشنر کوئٹہ کا بلاوا آیا۔

ہم دونوں کچہری ڈی سی کے دفتر پہنچے۔ہمیں اندازہ تھا کہ ہم سے کیا پوچھا جائے گا۔ہم دونوں کی ڈی سی کے سامنے یکے بعد دیگرے پیشی ہوئی اور ہمیں ہماری سیاسی اور سرکار کی نگاہ میں ناپسندیدہ سرگرمیوں کے بارے میں تنبیہ کی گئی۔اس کے بعد لٹ خانہ کے قریب ہماری گلی میں باقاعدہ ہمیں واچ کیا جانے لگا۔لٹ خانہ کی وجہ سے گلی میں رہنے والے چند بے روزگار لوگوں کو روزگار ملا یعنی وہ سی آئی ڈی میں بھرتی کر لیے گئے۔

ہم سرکار کی اس تنبیہ سے بہت خوش ہوئے کہ ہماری سرگرمیوں سے سرکار پریشان ہوئی ہے اور ہماری سیاسی حیثیت تسلیم کی گئی۔ہم اپنے روزمرہ کی سرگرمیوں میں اور زیادہ تیز ہوئے۔ ہماری پیشی کی بات ان حلقوں میں پھیل گئی جو لٹ خانہ اور ہم سے دلچسپی رکھتے تھے۔کالج کے اور دیگر نوجوانوں نے زیادہ دلچسپی سے لٹ خانہ آنا جانا شروع کیا اور ترقی پسند لٹریچر کا مطالعہ کرنے لگے۔

ہمارے قریب ہی بلوچی اسٹریٹ میں ڈاکٹر ارباب یوسف کا گھر تھا۔ان دنوں وہ امین الدین پری میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے۔ان کی خدائیداد سے جان پہچان تھی۔وہ اکثر لٹ خانہ آیا کرتے تھے اور اس سے دلچسپی لینے لگے تھے۔اس طرح گورنمنٹ ڈگری کالج جو بلوچستان کا اس وقت تک واحد کالج تھا، وہاں سے اکثر لڑکے لٹ خانہ آیا کرتے تھے۔وہاں امان اللہ گچکی جنہیں ادب اور خصوصاً ترقی پسند ادب سے بہت لگاؤ تھا، وہ ان دنوں سے ہم دلچسپی لینے لگے تھے۔جب ''فی الحال اسٹیشنری مارٹ'' شروع ہوا تھا تو کامل القادری پیپلز پبلشنگ ہاؤس سے اردو انگریزی کی بہت سی دلچسپ کتابیں لائے تھے جو سارے کا سارا پروگریسو لٹریچر تھا۔امان اللہ گچکی کالج کے نہایت ہی ذہین، سنجیدہ اور باشعور طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔غلام محمد شاہوانی سے ان کے تو

برادرانہ تعلقات تھے۔ان کی وجہ سے کالج کے بیشتر طلبا بالخصوص بلوچ اور مکران کے طالبعلموں کی ایک ادبی تنظیم تشکیل دی جس کا نام انہوں نے ''بلوچی لبزانکی دیوان'' یعنی بلوچی ادبی انجمن رکھ دیا۔ یہ کافی عرصے تک کالج میں قائم رہا اوراس کے بعد پورے بلوچستان میں بلکہ اب تک اسی نام سے ادبی سرگرمیوں کا سرچشمہ رہا ہے۔اس طرح بلوچی کے بہت اہم اور نامور شاعر اور ادیب ان کی کوششوں سے پیدا ہوئے۔خود امان اللہ گچکی ، کریم دشتی، عطا شاد، صدیق آزاد، نعمت اللہ گچکی ، صورت خان مری، امان اللہ جمالدینی، طاہر محمد خان مرزا اور کئی۔

کالج کے طالب علم اکثر آتے اور ہم سے کتابیں پڑھنے کے لیے لے جاتے۔ پڑھ کر واپس کرتے اور پھر اور لے جاتے۔اسی طرح پشتون طالب علم بھی آتے۔ان میں سب سے زیادہ جولٹ خانہ سے وابستہ تھے وہ جعفر خان اچکزئی کے بھائی معصوم خان اچکزئی تھے۔ وہ بہت ہی ذہین اور باشعور طالب علم تھے۔ان کی وجہ سے اور کمال خان کی وجہ سے بعد میں عبدالرحیم مندوخیل، اسدلونی، خالد خان اور کئی اور جن کے نام اب یاد نہیں، ان میں ایک پیارے اور بہت ہی خوش خلق جوان رحیم کاکڑ تھے، جو ہمیشہ معصوم خان کے ساتھ آیا کرتے۔

رحیم کچھ عرصہ بعد کینسر کی بیماری سے وفات پا گئے ، جس کا سب کو بہت ہی افسوس ہوا۔ معصوم خان نے بعد میں پشتو میں کتاب لکھ دی، جس کا نام تھا ''زر اواقتصاد (سرمایہ کی معیشت)۔ اس طرح عبدالرحیم مندوخیل نے پشتو میں کتاب لکھ دی جس کا نام تھا، ''خپل واکی'' (خود اختیاری)۔ یہ دونوں کتابیں شائع ہوئی تھیں۔

امان اللہ جمالدینی اور ان کے چھوٹے بھائی قدرت اللہ اکثر لٹ خانہ آتے۔ امان اللہ نے بلوچی ادب میں اچھا خاصا کام کیا۔ کرشن چندر کے افسانے ترجمہ کیے۔قدرت اللہ نے بھی بلوچی میں ترجمے کیے۔طاہر محمد خان نے تو بلوچی کے چند اچھے اور مشہور افسانے تخلیق کیے۔خود امان اللہ گچکی کا بلوچی کے بڑے پائے کے نثر نگاروں اور نقادوں میں شمار ہوتا ہے۔امان اللہ جمالدینی سید کامل القادری کے قریبی ساتھی تھے۔انہوں نے کامل کے ساتھ مل کر کئی اور دوستوں اور صفیہ ایوب کے ہمراہ کالج کے طلبا میں ڈیمو کریٹک سٹوڈنٹس کو منظم کیا۔ جو کراچی میں اس نام کی بہت

مشہور طلبا تنظیم کی شاخ تھی۔ بعد میں امان اللہ جمالدینی، کامل القادری، صفیہ ایوب اور ایک اور بچی نہ جانے کون ...... بشیر بلوچستان کے طلبا کی نمائندگی کرنے کراچی اس تنظیم کے کنونشن میں شرکت کے لیے لے گئے تھے۔کامل القادری، امان اللہ جمالدینی اور امان اللہ گچکی کی وجہ سے لٹ خانہ کی وابستگی کالج کے طلبا سے بہت دیر تک رہی۔بعض دفعہ غلام محمد شاہوانی کے ہمراہ میں بھی کالج کے ہاسٹل جایا کرتا اور سٹوڈنٹس سے ملاقاتیں ہوتیں۔

اینڈرسن روڈ، موجودہ لیاقت بازار میں برتنوں کی ایک دکان ہوتی تھی۔شہر سے لٹ خانہ واپس ہوتے وقت اکثر میں اور خدائیداد اس دکان میں جاتے۔ دکاندار پکی عمر کے ایک باریش پشتون تھے۔ وہ خدائیداد کے دوستوں اور واقف کاروں میں سے تھے۔ان کا نام جناب مولانا عبدالخالق تارن صاحب تھا۔ وہ پشتو کے شاعر تھے۔اس کے بعد اکثر وہ لٹ خانہ آتے اور اپنے اشعار خدائیداد صاحب کو دکھاتے۔ان کی کتابت کروا کر ان کی طباعت اور اشاعت کرنا چاہتے تھے۔وہ بہت اچھے شاعر تھے۔ان کی ایک نظم اس سے پہلے میں نے خان صمد خان کے مشہور ہفت روزہ ''استقلال'' میں پڑھی تھی۔اس کا عنوان تھا ''بہار کی آمد''۔ جناب خان صمد خان ایک مرتبہ جیل سے رہا ہو کر کوئٹہ تشریف لائے تھے۔اس خوشی میں تارن صاحب نے یہ نظم لکھی تھی۔بعد میں تارن صاحب میر غوث بخش بزنجو اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ بدنام زمانہ قلی کیمپ میں بند کر دیے گئے تھے۔تارن صاحب نہایت ہی وسیع القلب اور روشن خیال عالم دین تھے۔وہ برصغیر کے مشہور دینی جامعہ دیو بند سے فارغ التحصیل ہوئے تھے۔فلسفہ اور منطق تاریخ و جغرافیہ پڑھے ہوئے تھے۔کئی سال بعد جب میں جامعہ بلوچستان میں بحیثیت استاد بلوچی کے ملازم ہوا تو تارن صاحب جامعہ بلوچستان کی مسجد میں بطور امام خطیب کے مقرر ہوئے۔جامعہ کے وائس چانسلر مرحوم بریگیڈیئر آغا اکبر شاہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔حالانکہ تنگ نظر مذہبی لوگ تارن صاحب کو پسند نہیں کرتے تھے اور انہیں 'سرخ ملا' کہتے۔تارن صاحب نے جامعہ بلوچستان میں ملازمت کے دوران وفات پائی۔وہ پشین کے علاقہ کچ کے باسی تھے۔

پشین کے ایک اور دوست بھی لٹ خانہ آیا کرتے تھے۔ ان کی بھی دوستی پہلے سے

خدائیداد صاحب سے تھی ۔ ان کا نام سید محمد تھا اور ان کا تعلق پشین کے علاقہ گنگلزئی سے تھا۔ نہایت ہی سنجیدہ اور شریف انسان تھے ۔ وہ پشتونستان کی تحریک سے متاثر تھے ۔ اسی طرح پیر علی زئی کے اچکزئی محمد یوسف تھے ۔ وہ تو پشتونستان کی تحریک کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے ۔ وہ پشتو ادبی ٹولی میں بھی بہت دلچسپی لیتے تھے ۔ اسی طرح ایک اور صاحب ماسٹر خدائے نور صاحب تھے ۔ ان سے بھی اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی اور لٹ خانہ سے دلچسپی رکھتے تھے ۔

میرے علاقہ نوشکی سے میر محمد حنیف جمالدینی ، میر بلال خان جمالدینی اور میر چندن خان جمالدینی اکثر لٹ خانہ آتے جاتے ۔ محمد حنیف اور بلال گل خان نصیر کے بہت پرانے سیاسی ساتھی تھے ۔ جب میر گل خان نصیر بلوچستان کے مشہور سیاسی پارٹی انجمن وطن کے سرگرم کارکن اور عہدہ دار تھے اور خان عبدالصمد خان کے قریب ترین ساتھیوں میں سے تھے تو انہوں نے نوشکی اور ضلع چاغی میں انجمن وطن کو بڑے جوش اور جذبہ سے منظّم کیا تھا۔ اس وقت نوشکی اور چاغی میں اس کے اہم لیڈروں میں گل خان نصیر کے علاوہ مولوی غلام حیدر صاحب بلال خان، محمد شریف ساسولی ، محمد حنیف جمالدینی ، میر علم خان بادینی ، سردار محمد ہاشم خان سنجرانی کے علاوہ کئی اور کارکن تھے ۔ اس لیے محمد حنیف اور بلال خان اکثر سٹینڈرڈ ہوٹل گل خان نصیر سے ملنے جاتے ۔ ان کی رہائش اکثر لٹ خانہ میں ہوتی ۔ محمد حنیف نہایت ہی مخلص انسان ہیں ۔ وہ لٹ خانہ سے بہت متاثر ہوئے اور لٹ خانہ کی زندگی نے ان پر گہرا اثر چھوڑا ۔ ان کے ساتھ میر چندن خان بھی لٹ خانہ سے وابستہ ہوئے چنانچہ جب نوشکی جاتے تو لٹ خانہ اور ان کے رہنے والوں کا پرچار کرتے ۔ وہ اتنے متاثر ہوئے کہ بعد میں اپنے گاؤں جمالدینی میں محمد حنیف اور چندن خان نے ایک سٹور کھولا اور اس کا نام ''ہوتان'' (گاؤں کے ایک تاریخی اور مشہور ریت کے ٹیلے کا نام ہے) سٹور رکھا۔ 1952ء کی تمام گرمیاں تقریباً محمد حنیف نے لٹ خانہ میں گزاریں ۔

ایک مرتبہ جب محمد حنیف نوشکی سے آئے تو اپنے ساتھ سونے کے چند زیورات لائے اور کہا، ''لٹ خانہ مالی بحران سے دوچار ہے، اس لیے میں ساتھیوں کی مدد اور گزران کے لیے یہ کچھ لایا ہوں''۔ اسے صرافہ بازار لے جاکر فروخت کیا اور کچھ رقم لا کر ہمیں دی ۔

خدائیداد صاحب کے ایک اور نہایت دلچسپ اور نوجوان دوست لٹ خانہ آئے اور کئی روز لٹ خانہ میں رہے ۔ ان کا تعلق بھی پشین سے تھا ۔ ان کا نام تھا سید مصطفیٰ شاہ ۔ شاید گلستان سے ان کا تعلق تھا ۔ وہ نہایت پرجوش اور پرعزم نوجوان تھے ۔ اب یہ یاد نہیں کہ وہ لٹ خانہ سے متعارف ہونے سے پہلے مچھ جیل جا چکے تھے یا لٹ خانہ میں رہنے کے بعد ۔ ان کے بزرگ بمبئی میں کاروبار کرتے رہے تھے ۔ ان کی ابتدائی زندگی اور تعلیم وہیں بمبئی میں ہوئی تھی ۔ وہ بمبئی میں رہ کر انڈین کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں سے متاثر ہوئے تھے ۔ جہاں انڈین کمیونسٹ پارٹی کا مرکز اور اشاعت گھر تھا ۔ کیونکہ اس زمانے میں جو بھی کمیونسٹ لٹریچر انگلش یا اردو میں شائع ہوتا، کھیت واڑی کا ایڈریس اس پہ ہوتا ۔

بلوچستان آکر مصطفیٰ شاہ پشتونستان کی تحریک سے بھی متاثر ہوئے ۔ چنانچہ وہ اپنے چند دوستوں کے ہمراہ سرحد پار کرنے کی کوشش میں گرفتار ہوئے تھے ۔ ان کے ہمراہ ماسٹر خدائے نور اور سید محمد کاسی بھی گرفتار ہوئے تھے ۔ تینوں مچھ جیل پہنچا دیے گئے تھے ۔ سید محمد کاسی کو تو میں کافی عرصہ پہلے سے جانتا تھا ۔ وہ پرانے کانگریسی تھے ۔ اکثر کھدر کے لباس میں ملبوس اور سر پر کرل ٹوپی بھی کھدر کی ہوتی تھی ۔ ان دنوں خان صمد خان صاحب کا بھی یہی لباس ہوا کرتا تھا ۔ سید محمد کاسی انجمن وطن سے بھی وابستہ رہے تھے ۔ انجمن وطن کے ایک پرانے راہنما مرحوم نواب عبدالقادر کاسی بھی افغانستان فرار ہوکر گئے تھے اور وہاں پشتونستان کے وزیر خارجہ بنائے گئے تھے ۔ وہ بھی خان عبدالصمد خان کے ساتھی تھے ۔

سید مصطفیٰ شاہ اس کے بعد پھر فرار ہوکر قندہار چلے گئے ۔ سید محمد جو سید و کاسی کے نام سے مشہور تھے جیل میں ذہنی توازن ے محروم ہوئے اور بعد میں انہوں نے وفات پائی ۔ نواب عبدالقادر کاسی جو اس وقت نواب نہ تھے، ان کے والد کی وفات کے بعد ان کے بڑے بھائی محمد عمر خان کاسی اپنے قبیلے کے نواب ہوئے ۔ ان کی وفات کے بعد ہی عبدالقادر کاسی نواب ہوئے ۔ اس سے پہلے انہوں نے تمام عمر تنگ دستی میں گزاری تھی ۔ بھائی کی وفات کے بعد بھائی اور والد کی جائیداد کے وارث ہوئے ۔ انہی دنوں نواب عبدالقادر جو اس وقت نواب نہ تھے، افغانستان سے

ہندوستان ہوتے ہوئے واپس بلوچستان آئے تھے اور گرفتار کیے گئے تھے۔ انہیں مچھ جیل سے کوئٹہ منتقل کیا گیا تھا۔ مچھ جیل میں میر عبدالواحد کرد بھی قید تھے۔ وہ قیام پاکستان کے بعد شہزادہ عبدالکریم خان کی بغاوت میں گرفتار ہوئے تھے اور سات سال کی سزا کاٹ رہے تھے۔ وہ میرے بہت ہی جانی دوست تھے۔ میرے، کمال خان اور بہادر خان کے کلاس فیلو رہ چکے تھے، جبکہ ہم تینوں اسلامیہ کالج پشاور میں تعلیم پا رہے تھے۔ میر عبدالواحد کرد بلوچستان کے نام گرامی سیاسی رہنما جناب میر عبدالعزیز کرد کے بھتیجے تھے۔ ان کی وجہ سے وہ سیاسی ہو گئے تھے۔ اس طرح شہزادہ عبدالکریم کے ہمراہ سرحد پار کر گئے تھے اور بعد میں انہی کے ہمراہ واپس آنے پر گرفتار ہوئے تھے۔ میں کوئٹہ جیل اکثر ان سے ملاقات کرنے جاتا۔ اس وقت میرے سوا، ان کے ایک دو اور میرے جیسے دوست مثلاً غلام محمد شاہوانی کے، کوئی حال پرسانِ نہ تھا۔ جیل میں ان کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔

میر عبدالواحد کے ایک اور چچا میر غلام رسول خان کرد لٹ خانہ کے قریب میر احمد خان روڈ پہ رہتے تھے۔ وہ اکثر لٹ خانہ آتے اور ہم سے ملتے۔ ان کے بیٹے نصیر احمد کرد جو اس وقت سکول میں پڑھتے تھے، اکثر لٹ خانہ آتے۔ انہیں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اکثر کتابیں پڑھنے کے لیے لے جاتے۔ میر عبدالواحد کرد کی وجہ سے اس فیملی سے بہت گہرے مراسم استوار ہوئے تھے۔ نصیر احمد کرد کی والدہ اپنے عزیز میر عبدالواحد کی وجہ سے مجھ پر بہت مہربان تھیں۔ اکثر گھر میں پکا کر لٹ خانہ ہمارے لیے بھیج دیتیں۔ وہ ہر طرح سے لٹ خانہ والوں کی مددگار تھیں۔ بعض دفعہ لٹ خانہ والے اگر کسی کی دعوت کرتے تو نصیر احمد کی والدہ ہی یہ کام سر انجام دیتیں۔ انہیں اب تک لٹ خانہ یاد ہے، وہ اب تک اس کی اور اس کے رہنے والوں کی ستائش کرتی ہیں۔

ماہنامہ ''نوکین دور'' کوئٹہ۔ دسمبر 1995

۱۵

ہم بدستور لٹ خانہ میں مقیم تھے۔ خدائیداد، بہادر خان، حبیب اللہ اور کمال خان جو اپنے گاؤں سے آئے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ آگے اب ''کیا کیا جائے؟'' یعنی اب عملی سیاست کی جانب پر تول رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ یہ لکھا جائے کہ اس ''کیا کیا جائے؟'' کے جواب میں لکھا جائے کہ ہم نے کیا کیا؟...... میرے خیال میں اس وقت کے عالمی اور ملکی سیاسی اور سماجی حالت کے بارے میں کچھ بات کی جائے۔

عالمی سطح پر صورتحال یوں تھی کہ سوویت یونین کا نیا نظام مستحکم ہو چکا تھا اور ہر لحاظ سے اس میں ہمہ جہت پیش رفت ہو رہی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں نازی ازم اور اس کے حواری جاپان اور اطالیہ کو شکست ہوئی تھی۔ برطانیہ نے اپنے سامراجی اور نو آبادی نظام کی بساط لپیٹ لی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان دنیا کے نقشے پر دو آزاد مملکتوں کی صورت میں نمودار ہو چکے تھے اور اپنے طور پر رو بہ ترقی تھے۔ چین نے چند ہی سال پہلے نئے چین کے نام سے سوشلسٹ نظام قائم کر لیا تھا اور اپنے انتہائی سماجی اور معاشی مشکلات کو ختم کر کے اپنے پُر عزم عوام کو ترقی کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔

برطانیہ کی بجائے تازہ دم نیا امریکی سامراجی نظام، نئے روپ اور نئے انداز میں سوشلسٹ نظام والے نو آزاد ممالک کے خلاف ہر جتن کرنے پر آمادہ تھا۔ اور ان نو آزاد ممالک کی مالی، معاشی اور ہر طرح کی پسماندگی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا اور حکمران طبقوں کو اپنے ان عوام دشمن مقاصد میں استعمال کرنے کے لیے منصوبے تیار کر رہا تھا۔

دنیا بھر میں عوام اور محنت کش طبقہ اور روشن فکر لوگوں میں سوویت یونین کی حمایت کا پُرزور چرچا تھا۔ سوویت یونین میں سٹالن کی سخت گیر پالیسی نے سوشلسٹ نظام پر آنچ نہ آنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ سٹالن کی شخصیت اپنے وقت کی مقبول ترین عوامی شخصیت مانی جاتی تھی اور امریکی سامراج سوویت یونین میں دراڑیں پیدا کرنے کے لیے ہر طرح کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس وقت کرہ ارض دو واضح دھڑوں میں بٹ چکا تھا؛ سوشلسٹ اور ترقی پسند دنیا اور اس دنیا کے مظلوم و مقہور انسان اور محنت کش طبقہ ایک طرف، اور تازہ دم اور نوجوان امریکی سامراج اس کے ہمراہ دنیا کے فوجی اور نوکر شاہی ٹولے، جاگیردار طبقہ، رجعت پسند فکر اور استحصالی قوتیں دوسری طرف۔ سب اس نئی ابھرتی ہوئی سامراجی قوت کے زیر سایہ خود کو محفوظ محسوس کر رہے تھے اور اس کی ہر طرح حمایت کر رہے تھے۔

اس صورتحال نے انسانی فکر کو بے حد متاثر کیا تھا۔ دنیا کے ہر ملک میں اس صورتحال سے دو دھڑے قائم ہو رہے تھے۔ ترقی پسندوں کا دھڑا اور رجعت پسندوں کا دھڑا۔ کرہ ارض کے تمام ممالک اس صورتحال سے دوچار تھے۔ نو آزاد ممالک کے عوام اپنی ترقی کے لیے سوویت یونین کی طرف دیکھتے تھے۔ سوویت یونین ہر لحاظ سے ان نو آزاد پسماندہ عوام کی مدد کے لیے آمادہ تھا۔ سوویت نظام یعنی سوشلزم کا سائنسی نظام دنیا بھر کے مظلوم اور پسماندہ عوام کے لیے ایک روشن ستارہ تھا اور آئیڈیل تھا۔ اس نظام نے سائنسی اور علمی کاوشوں سے اس وقت تک ثابت کر لیا تھا کہ سماج کے تمام مسائل کو حل کرنے کا واحد طریقہ سوشلزم ہی ہے۔ سوشلسٹ سائنسی منصوبہ بندی نے سوویت یونین کے تمام پسماندہ عوام کو ہر طرح کی ترقی اور پیش رفت سے سرفراز کیا تھا۔ چند ہی سال انقلاب اور سوشلزم کے قیام سے قبل کی وسط ایشیائی عوامی جمہوریتیں، تعلیم، صنعت، تجارت،

زراعت اور ثقافت میں سال بہ سال ترقی کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہی تھیں۔ ادھر مشرقی یورپی جمہوریتیں مضبوط سے مضبوط تر ہو رہی تھیں۔

نو آزاد ممالک کے عوام سامراج اور نو آبادتی نظام جہالت، امراض، پسماندگی سے نجات کا واحد مددگار سوویت یونین اور اس کے دوست ممالک سمجھے جاتے تھے۔ ان کی آزادی کی سب سے بڑی وجہ بھی تو سوویت یونین اور اس کے ساتھی سوشلسٹ ممالک تھے۔ سوشلزم چونکہ سماج کو ترقی دینے کا ایک سائنسی علم ہے یعنی سماج کو آگے بڑھانے کا علمی رویہ ہے۔ سرمایہ دارانہ ممالک اور آمرانہ حکومتیں سوویت یونین اور سوشلسٹ ممالک کے مخالف ہوتے ہوئے بھی اپنے ملکی ترقی کے کئی شعبوں میں اس علم سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ ترقی میں منصوبہ بندی تقریباً تمام ممالک میں یعنی غیر اشتراکی ممالک میں بھی رائج ہوا۔

برصغیر نے نو آبادیاتی غلامی سے، برطانوی سامراج کے تسلط سے گلو خلاصی کے بعد بھارت اور پاکستان کی دو مملکتوں کی صورت اختیار کی تو بھارت شروع ہی سے سویت یونین اور سوشلسٹ ممالک کے دھڑے سے وابستگی اور دوستی کا دم بھرنے لگا۔ بدقسمتی سے ہمارا ملک روزِ اول سے دوسرے دھڑے کا ہمنوا بنا۔ اور رفتہ رفتہ جدید نو آبادیاتی نظام اور امریکہ کی جدید سامراجیت کا دُم چھلہ بنا۔ ہندوستان میں جمہوریت پنپنے لگی اور سماجی ترقی پروان چڑھنے لگی۔ فکری آزادی پر کوئی قدغن نہیں لگی۔ حکمران کانگریس پارٹی کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹی عوام کی ترقی میں ممد و معاون رہی۔ فکری آزادی اور سیکولر سوچ پروان چڑھتی رہی۔ پریس آزاد رہا۔ سوشلسٹ ادب پر کسی قسم کی پابندی نہ ہوئی۔ لسانی جھگڑے نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ انڈیا کے اندر بنگال اور کرالا میں سوشلسٹ حکومتیں بنیں اور اب تک ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں مسلم لیگی حکومتوں نے جو جاگیرداروں سے تشکیل پائی تھیں، سامراجی اور جدید نو آبادیاتی نظام کے مفاد میں اپنے عوام کو ہر قسم کی آزادی سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔ پریس کو غلام بنایا۔ تحریر و تقریر پر پابندیاں لگائیں۔ ادب پر قدغن لگائی، سوشلسٹ لٹریچر کو پڑھنا جرم قرار دیا۔ فکری اور سیاسی آزادی کا گلا گھونٹنے کے لیے قسم قسم کے قوانین بنائے گئے۔ جدید نو آبادیاتی نظام کے مفاد میں فیوڈلزم، بیوروکریسی اور کرپشن کو تحفظ دیا۔

دراصل حکمران پارٹی انہی لوگوں سے بنی ہوئی تھی اور انہی کے مفاد میں نہ صرف اپنے عوام کو سزا دیتے رہے بلکہ ہمسایہ ممالک کی ترقی اور پیش رفت کی راہ میں امریکی سامراج کے مفاد میں عمل کرتے رہے۔

اس بیرونی اور اندرونی خلفشار اور فضا میں ہماری آنکھیں کھلیں اور ہم نے عمل کرنا شروع کیا۔ سیاست اور ادب دونوں کی دنیا میں ہم نوآموز تھے۔ بہرکیف یہی دنیا اب ہماری سرنوشت ہوگئی تھی۔ مجھے بہت بعد میں اندازہ ہوا کہ سیاست کی دنیا منتخب کر کے غلطی کی تھی۔ جو لگاؤ مجھے علم وادب سے تھا، اس کا تقاضا تھا کہ میں اسی ہی میں محنت وجہد کرتا۔ بہرکیف میں بھی دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ سیاست کی دنیا میں کوشاں رہا۔ کیونکہ ہم نے یہی تہیہ کیا ہوا تھا کہ اپنے لوگوں کی خدمت کریں گے، ان کی مشکلات کو دور کرنے کی جدوجہد کریں گے۔ اس کے لیے سیاست اور تنظیم ضروری امر ہیں۔ اس کے لیے ہم نے سوشلزم کا نظریہ قبول کیا ہوا تھا۔ اور یہ لٹ خانہ کے ساتھیوں کا یہ متفقہ منتخب نظریہ تھا۔ اس کا مطالعہ ہم سب باقاعدہ کیا کرتے تھے۔ ہمارا ادبی اور سیاسی مطالعہ دونوں اسی نظریہ سے وابستہ تھے۔

کمال خان جب اپنے علاقہ اور گاؤں سے واپس ہوئے تو انہوں نے جو عرصہ وہاں گزارا تھا اور جن ہم خیال دوستوں سے ملاقاتیں کی تھیں، ان کے بارے میں بتایا کہ ان کے علاقہ کے مخصوص ماحول اور سماج اور معاشرہ کا تقاضا ہے کہ وہاں مذہبی اور قبائلی حالات کو ملحوظ رکھ کر کام کیا جائے۔ ان کے علاقہ کے چند دانشوروں نے جو دینی مدرسوں سے علم حاصل کر کے کمال خان کا ساتھ دینے کا تہیہ کیا تھا، وہ صوفی نور محمد اور ملا نور محمد تھے۔ انہوں نے ان کے ساتھ مل کر ایک کمیٹی بنائی تھی اور اس کمیٹی کا پروگرام اس علاقہ میں سماجی اور معاشرتی اصلاحات کا آغاز کرنا تھا۔ غازی کمال دین شیرانی بھی ان کے ہم خیال تھے۔ ایک اور نوجوان جو نائب تحصیلدار تھا، جلال خان شیرانی، وہ بھی ان کا ہم خیال تھا۔ ژوب شہر میں تعلیم یافتہ اور سیاسی شعور رکھنے والے نوجوان بھی کمال خان سے بہت متاثر ہوئے تھے؛ مثلاً رحیم مندوخیل اور صالح محمد مندوخیل اور اُن سے وابستہ کئی اور مندوخیل نوجوان کمال خان کے مداح تھے۔ گویا ژوب شہر میں بھی کمال خان نے اپنے اچھے

خاصے اثرات چھوڑ دیے تھے۔

لٹ خانہ پہنچ کر ان کی یہی تجویز تھی اور اپنے چند مہینوں کے تجربہ سے دوستوں کو انہوں نے یہی مشورہ دیا کہ ہمیں عوام اور اپنے اپنے علاقوں میں اپنا فکر پھیلا کر کام کرنا چاہیے۔ گویا میں نوشکی میں جا کر کمیٹی بناؤں۔ میر بہادر خان اسپلنجی اور اپنے قبیلہ بنگلزئی میں اور باقی ساتھی یہیں مرکز میں رہ کر کوئٹہ ہی میں نوجوان طالب علموں اور دانشوروں میں کام کریں۔

چنانچہ نوشکی میں ہمارے ساتھی اکثر ملکر میٹنگیں کیا کرتے تھے۔ ان میں میر محمد افضل جمالدینی، میر لونگ خان مینگل اور محمد حنیف جمالدینی نمایاں تھے۔ اور ان دو حضرات کی وابستگی پہلے ہی عوام سے تھی۔ اب مزید جوش وجذبہ سے متحرک ہوئے۔

اسپلنجی بہادر خان اور شاید کمال خان نے جا کر ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ جس کا سرکردہ چیئرمین یا سیکرٹری عوام سے لیا گیا تھا۔ اس کا نام ہے؛ محمد ہاشم بنگلزئی جس کی عقیدت لٹ خانہ والوں سے اب تک برقرار ہے اور اس پر اب بھی فخر کرتا ہے۔ انہی ایام میں ملا حبیب اللہ لٹ خانہ آیا تھا۔ اس کا ذکر میں نے شاید پہلے کیا ہے۔ اس کا تعلق بنگلزئی قبیلہ کے پڑرندوں کے سیکشن سے تھا۔ ان کا سردار، بہادر خان کا دادا وڈیرہ نور محمد خان تھا۔ اس لیے بہادر خان سے وابستگی تھی۔ ان کا علاقہ درہ بولان کی وادی بارڑی میں ہے۔ وہ بھی لٹ خانہ سے اور اس کے ساتھیوں کی فکر سے بہت متاثر ہوا تھا۔

اس نے ہمیں دعوت دی کہ ان کے علاقہ بارڑی کا دورہ کریں اور وہاں ایک کمیٹی بنا کر کام شروع کیا جائے۔ بہادر خان نے اس تجویز کی پرزور تائید کی۔ بہادر خان کمال خان اور میں تیار ہوئے۔ ایک روز کسی بس میں بیٹھ کر چل پڑے۔ بولان میں بی بی نانی کے قریب بس سے اترے اور پیدل چل پڑے۔ میر بہادر خان ہمارے رہنما تھے۔ ڈھائی تین میل کا فیصلہ طے کر کے ملا حبیب اللہ کے گاؤں پہنچے۔ وہاں ان کے عزیز بھائی اور ساتھیوں سے ملے۔ ایک کا نام سبزل تھا، ایک بالاچ اور تیسرے کا نام عنایت تھا۔ ایک دو رات ان کے مہمان ہوئے۔ وہ دیہات کے سیدھے سادھے بلوچ تھے۔ رات دن ان سے گفتگو ہوئی۔ ان کی مشکلات معلوم کیں اور انہیں دور

کرنے کے طریقے بیان کیے۔ اپنی فکر اور سیاسی خیالات سے انہیں آگاہ کیا۔ تجویز یہ دی کہ ایک کمیٹی تشکیل دی جائے' ہمیشہ میٹنگ کر کے ان کے مسئلوں کا اس میں جائزہ لیا جائے، اور ان سے لٹ خانہ کو آگاہ کیا جائے۔ انہوں نے اتفاق کیا۔ اگلے روز ایک جھونپڑی کے عقب میں گاؤں کے مرد حضرات کو بلایا اور ایک چیئر مین اور ایک سیکرٹری کے انتخاب کے لیے ووٹنگ کرائی۔ سادہ طریقہ سے پوشیدہ رائے لی گئی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، بالاچ چیئر مین اور عنایت کمیٹی کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس طرح کمیٹی تشکیل پا گئی۔ تیسرے روز ہم واپس لٹ خانہ روانہ ہوئے۔ میرے خیال میں یہ ہمارا آخری دورہ تھا وہاں کا۔ اس کے بعد کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بنگلزئی قبیلہ کے مقتدر سردار کو ہماری اس مداخلت اور قبائلی اور کسانوں میں عملی کام شروع کرنے کا پتہ چلا تھا اور انہوں نے اپنے پوتے میر بہادر خان کی سرزنش کی تھی۔ مگر میر بہادر خان پر اس کا اثر نہ ہوا۔ ان کی مخلصانہ وابستگی لٹ خانہ اور اپنے ساتھیوں سے برقرار رہی۔

جیسا کہ میں پہلے کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں لٹ خانہ اور اہلِ لٹ خانہ کی سرگرمیوں کی شہرت پھیل گئی لوگوں میں اور خصوصاً سیاسی حلقوں میں۔ لاہور، کراچی سکھر، جیکب آباد اور ملک سے باہر کابل، قندھار، ایران میں زاہدان کے بلوچوں میں۔ لہٰذا ہر طرف سے لوگ ہماری طرف متوجہ ہونے لگے۔ سابقہ انجمن وطن، انجمن ملکی مسلمانان، قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے لوگ، غرض کہ تمام سیاسی و ادبی حلقے، صحافی اور دانشور لٹ خانہ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

افغانستان کونسل جنرل اس وقت پروانی تھے۔ پورا نام مجھے معلوم نہیں۔ وہ نہایت ہی متحرک سفارت کار تھے۔ وہ اکثر سیاسی لوگوں سے ملتے تھے۔ ادبی کتابیں دیتے تھے۔ اس زمانے میں کابل میں ادبی سرگرمیوں کا نشاطِ ثانیہ تھا۔ پشتو ادبی ٹولنہ میں بڑی نام آور اور قابل قدر ہستیاں تھیں۔ پشتو اور فارسی میں پائے کی کتابیں ہر نوع کی تخلیق ہوتی تھیں۔ عبدالروف بے نوا رشتین، آقائے حبیبی، محمد علی کوہزاد اور کئی نام آور شاعر اور ادیب تھے۔ ان کی نگارشات پروانی کے ذریعہ کوئٹہ کے ادیبوں اور دانشوروں کو دی جاتی تھیں۔ لٹ خانہ پروانی کی اس عملی سخاوت سے محروم نہیں رہا۔ البتہ ان کی مالی سخاوت سے لٹ خانہ والے دور رہے۔ بلوچستان میں جو ادبی کتابیں اور

اخبارات شائع ہوئے، وہ وہاں یعنی افغانستان پہنچائی جاتی تھیں۔

ان تمام عملی سرگرمیوں کے باوجود ہم عملی انتظام کاری سے ناواقف تھے۔ ہماری ان سرگرمیوں کا محرک محض ہمارے اپنے مقاصد سے جذباتی وابستگی تھی۔ ہم بلوچستان کی تاریخ، قبائلی نظام، گذشتہ سیاسی تاریخ اور حالات سے واقف نہ تھے۔ نہ ہی بلوچستان میں اس وقت ان مسئلوں کے بارے میں کوئی لٹریچر موجود تھا۔ عبدالصمد خان، عبدالعزیز کرد اور یوسف علی خان کی سیاسی جدوجہد اور کوششوں کے بارے میں ہمیں کچھ پتہ نہ تھا۔

ماہنامہ "سنگت" کوئٹہ۔ دسمبر 1997

١٦

1952 میرے لیے دلچسپ سال رہا ہے۔اس میں زندگی کے ہر لحاظ سے دلچسپ واقعات تھے۔لٹ خانہ میں اب تقریباً ہماری روزمرہ کی زندگی یکساں تھی۔ہمیں علمی اور فکری جدوجہد کے علاوہ معاشی جدوجہد بھی مجبور کر رہی تھی۔یعنی غمِ جاناں کے علاوہ غمِ روزگار بھی دامن گیر تھا۔اگرچہ ہماری زندگی اب درویشوں جیسی تھی،تاہم زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔گھر تو لٹ خانہ تھا ہی؛ لباس ہمارا سب کا ایک جیسا تھا۔ملیشیا کے ایک دو جوڑے ضروری تھے۔ملیشیا سب سے سستا لباس ہوا کرتا تھا اور اس کا رنگ ایسا تھا جسے میل خور کہا جاتا تھا،یعنی جلدی میلا نہیں ہوتا۔دھوتے اسے ہم خود تھے۔اب تو ہم میں ''ہم اور تم'' کا امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔گویا؛

من تو شدم تو من شدی
من تن شدم تو جان شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں
من دیگرم تو دیگری

جو بھی فارغ ہوتا، کپڑے دھولیتا۔استری کپڑوں کے لیے لازم نہ تھی۔میں تو صحافی بن چکا تھا؛ برائے نام۔گل خان نصیر کا مدیر معاون تھا۔اخبار ''نوائے بلوچستان'' تھا۔مالک میر نبی بخش زہری یعنی زہری برادران، میر قادر بخش، میر امام بخش اور میر نبی بخش۔میر نبی بخش خود مسلم لیگی تھے۔ان کی سیاست کا محور ان کی ذات تھی۔کوئلہ کی کانیں، تجارت، اخبار اُن کی ضرورت بن گئی تھی۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ایڈیٹر انہوں نے گل خان نصیر کو منتخب کیا تھا۔عبدالکریم شورش (شورش بابو) بھی ان دنوں زہری برادران کے مائننگ ادارہ میں منشی (کلرک) تھے۔ملک محمد پناہ چاغی ٹرانسپورٹ کمپنی میں تھے اور بابو محمد پناہ کہلاتے تھے۔ڈاکٹر خدائیداد جو اس وقت ڈاکٹر کے لقب سے نہیں نوازے گئے تھے، ہرفن مولا تھے۔یعنی کبھی ٹیوشن کر کے کما کے لاتے اور کبھی اکاؤنٹینسی کر کے لٹ خانہ کے لیے سرمایہ بنالاتے۔

مجھے تو میر گل خان نصیر نے اپنا معاون بنا کر زہری برادران کے اخبار میں لگا کر برسرروزگار کیا ہی تھا۔میر بہادر خان صاحب جو ابھی تک سرداری کے لقب سے ملقب نہیں ہوئے تھے، آٹا وہ اکثر لٹ خانہ کو اسپلنجی سے بھجواتے۔اپنی زمینوں کی مستقل آمدن یا میری اخبار والی تنخواہ تھی جو سو روپے تھی یا پھر خدائیداد کی تنخواہ جو کبھی زیادہ کبھی کم ہوتی۔گویا ہم ایک کمیون کی زندگی گزار رہے تھے۔ہم اگرچہ سوشلزم کو زندگی بھر عملی شکل نہیں دے سکے، تاہم لٹ خانہ میں ہماری زندگی عملی طور پر سوشلسٹ نظام کے تحت گزر رہی تھی۔ہمارے وابستگان یعنی فیملی کو ہم سے مالی مدد کی توقع نہیں تھی، میرا پہلا بچہ تو بیماری کی نظر ہو چکا تھا۔بیوی کو ان کے والد نے اپنے یہاں بلا لیا تھا۔والدہ اور میرے بھائی کی فیملی کو میرے چھوٹے چچا جس کی اپنی اولاد نہ تھی، پال رہے تھے۔وہ سب مفلوک الحال تھے۔بدقسمتی سے میری مہربان اکیلی بہن بھی اسی سال بہت بیمار ہو کر چل بسیں۔وفات کے وقت ہم دونوں میں سے کوئی بھائی گھر میں موجود نہ تھا۔

میرا سب سے بڑا کمال یہ ہوتا کہ والدہ کے لیے سبز چائے ایک پاؤ لے کر بھجوادیتا۔کیونکہ والدہ سبز چائے کے بغیر اور کسی قسم کی چائے نہ پیتیں۔

انجم قزلباش کی آمد

ایک روز شورش بابو سائیکل پر لٹ خانہ پہنچے۔ سہ پہر کا وقت تھا شاید اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔ مجھے کہا کہ انجم قزلباش کوئٹہ آئے ہیں۔ چلو تمہیں ان سے ملاتا ہوں۔ مجھے انجم سے شناسائی نہ تھی۔ شاید نام سنا تھا۔ انہی دنوں ترقی پسندوں کا مشہور رسالہ ''سویرا'' شائع ہوا تھا، جس میں ترقی پسند مصنفین کی عالمی کانفرنس کی روئیداد شائع ہوئی تھی۔ یہ کانفرنس لاہور میں ہوئی تھی۔ اس میں پاکستان بھر کے ترقی پسند ادیبوں، شاعروں اور سیاسی کارکنوں نے شرکت کی تھی۔ سوویت یونین سے بھی تین نامی گرامی ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ ان میں ایک تاجکستان کے مشہور شاعر اور ادیب مرزا ترسون زادہ تھے۔ ان ادیبوں اور دانشوروں اور کانفرنسوں کی تصویریں مجلّہ میں چھپی تھیں۔ ایک تصویر میں خدائیداد نے نشاندہی کی کہ انجم قزلباش ہیں۔ قمیص شلوار میں قرہ قلی ٹوپی پہنے ہوئے اور گلے میں مفلر ڈالا ہوا؛ لمبا دبلا نوجوان تھا۔ بس اتنی ان سے غائبانہ شناسائی تھی۔ میرے خیال میں اس وقت جب شورش آئے خدائیداد موجود نہ تھے۔ ٹیوشن کے لیے گئے ہوں گے۔ میں تیار ہوا۔ سورج گنج بازار کے آخری حصہ میں واقع ایک دکان پر پہنچے۔ یہ دکان ڈرائی کلیننگ کی تھی اور مالک بلوچستان کے مشہور خاکسار اور صحافی ہفت روزہ ''پکار'' کے مدیر و مالک عبدالکریم بٹ تھے۔ دکان کے دروازہ کے قریب وہی نوجوان جن کی تصویر کی نشاندہی خدائیداد نے مجھے کی تھی، ایک ریڈیو کے ساتھ مصروف تھے۔ گویا اس کی مرمت کر رہے ہوں۔ شورش نے ان سے تعارف کرایا اور ہم دونوں نے ہاتھ ملائے۔

یہ تھی انجم قزلباش سے میری پہلی ملاقات۔ اس کے بعد ہم قریب ترین دوستی کے رشتے میں منسلک ہوئے۔

بعد میں پتہ چلا انجم قزلباش لاہور سے روپوش ہو کر کراچی پہنچے تھے۔ وہاں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے صدر دفتر واقع بندر روڈ میں پارٹی کے سرکردہ لیڈروں سے ملے تھے، جن میں امام علی نازش، حسن ناصر اور شرف علی کے نام لیتے تھے، موجود تھے۔ وہاں کچھ روز رہ کر شاید سکھر آئے تھے۔ وہاں بیڑی ورکرز کے لیڈروں سے جن میں ابراہیم ملباری کا نام لیتے تھے، ملے تھے۔

ازاں بعد جیکب سے روانہ ہو کر ٹرین کے ذریعے کوئٹہ پہنچے تھے اور راستے میں سریاب ریلوے سٹیشن پر اترے تھے۔ وہاں سے پیدل کلی کرانی اپنے ایک دوست اور ساتھی سید گوہر شاہ کے پاس گئے تھے۔ وہاں سے پھر اپنی ہمشیرہ اور بہنوئی کے گھر ہدہ پہنچے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انجم قزلباش، شورش بابو، امام علی نازش اور منہاج برنا نے پارٹی کی رہنمائی میں کام شروع کیا تھا۔ خدائیداد صاحب اس وقت ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے تنظیم کاری شروع کی تھی۔ اور سنا کہ کوئٹہ کے تانگے والوں اور خاکروبوں کی یونین بنائی تھی۔ اس وقت انجم قزلباش (سفر علی اور صفدر علی) کے نام سے جانے جاتے تھے۔ محکمہ زراعت میں کلرک تھے۔ انجم کے والد پولیس میں سپاہی تھے۔ انہوں نے اسلامیہ سکول سے میٹرک کیا تھا اور نہایت ذہین طلبا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پاکستان کے نامور ادیب اور نقاد ممتاز حسین صاحب ان کے اردو کے استاد رہے تھے۔ بعد میں جب میں نے ممتاز صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ انجم ان کے اسلامیہ سکول کے دورانِ ملازمت میں شاگرد تھے۔ ممتاز صاحب نے تقسیم ہندو پاکستان کے بعد اسلامیہ سکول میں کچھ عرصہ بطور اردو استاد کے ملازمت کی تھی۔ انجم صاحب کو شاید ممتاز حسین صاحب کی وجہ سے اردو ادب سے اس قدر وابستگی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ ادبی مضامین لکھا کرتے تھے۔ بعد میں جب لاہور منتقل ہوئے تو وہاں ترقی پسندوں اور پارٹی کے ورکروں میں رہے اور ترقی پسند مصنفین کی اس مشہور کانفرنس میں شرکت کی اور بلوچستان کی نمائندگی کی۔ ان دنوں سید ستار شاہ بلوچستان کے مشہور اردو شاعر عین سلام کے چچازاد بھائی لاہور میں ویٹرنری ڈاکٹری کی تعلیم کے حصول میں مشغول تھے۔ جو انجم کے قریب ترین پارٹی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ عین سلام سے بھی ان کی اُس وقت کی دوستی تھی۔

انجم قزلباش کے والد کا نام میرے خیال میں گل زمان ہے اور ان کا گھر کوئٹہ کے مشہور روڈ طوغی روڈ کے قریب اسلام آباد میں تھا۔ اس وقت اس علاقے کا نام یہی تھا۔ ان کی مادری زبان فارسی ہے۔ مگر بلوچستان کی تمام زبانیں جانتے اور بول لیتے ہیں۔ انجم دو تین سال لاہور میں رہ کر آئے تھے۔ اس وقت ترقی پسندوں اور پارٹی کا مرکز لاہور ہوا کرتا تھا۔ فیروز الدین منصور، سی آر اسلم، فیض احمد فیض، افضل، مرزا ابراہیم، فضل الٰہی قربان اور کئی پارٹی لیڈروں، مزدور لیڈروں اور

ٹریڈ یونین ورکروں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ادیبوں میں فیض صاحب، سبطِ حسن، ظہیر کاشمیری، ظہیر بابر، صفدر میر، عبداللہ ملک، اور کئی اور کا ذکر کیا کرتے تھے۔

انجم قزلباش کچھ عرصہ اپنی ہمشیرہ کے یہاں ٹھہرے رہے۔ ان کی دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ بالآخر منو جان روڈ ہدہ سے لٹ خانہ منتقل ہوئے۔ انجم کے لٹ خانہ میں رہنے سے خود لٹ خانہ اور اس کی فکر میں مزید تبدیلی آئی۔ اور رفتہ رفتہ کوئٹہ اور بلوچستان کی فکری فضا میں کافی تبدیلی پیدا ہوئی۔ ان کی وجہ سے لٹ خانہ کی مقناطیسیت میں مزید اضافہ ہوا۔ ادبی اور علمی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ کئی ادیب اور شاعر اب لٹ خانہ کی سیر کیا کرتے۔ انجم کی وجہ سے کراچی اور لاہور میں پارٹی کے لوگوں سے وابستگی زیادہ ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ انجم کو پروگرام کے تحت کوئٹہ بھجا گیا تھا۔

ایک مرتبہ حسن طاہر ایک نوجوان ادیب لاہور سے آ کر لٹ خانہ میں رہے۔ بعد میں منہاج برنا جب اپنے گھر کوئٹہ آئے تھے تو اکثر لٹ خانہ آیا کرتے تھے۔ وہ مشہور بائیں بازو کے کارکن اور لیڈر معراج محمد خان کے بڑے بھائی ہیں۔ میں انجم کے ہمراہ ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر واقعہ فاطمہ جناح روڈ جاتا۔ خدائیداد کی ان سے اور ان کے بڑے بھائی معراج محمد خان سے تو پہلے ہی دوستی تھی۔ اب مجھے پتہ چلا کہ خدائیداد ہماری راہ کے سینئر اور پیش رو مسافر رہے ہیں۔ انجم سے بھی ان کی اُس وقت کی وابستگی تھی۔ منہاج برنا جب تک کوئٹہ میں رہے، لٹ خانہ ہر وقت آتے رہتے۔ وہ کچھ عرصہ پہلے نیو چائنا New China کا دورہ کر کے آئے تھے اور اپنے ہمراہ چینی موسیقی کے ایک دو ریکارڈ (گراموفون ریکارڈ) لائے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس مشہور امریکی کمیونسٹ اور سیاہ فام موسیقار پال رابسن (Paul Rabson) کے ریکارڈ تھے جو لٹ خانہ میں ہمیں سنایا کرتے تھے۔ پال رابسن کی قوی، بارعب اور پُراعتماد آواز مجھے بہت متاثر کرتی تھی۔ انجم کی وجہ سے عالمی اور ملکی ترقی پسند ادب سے مزید آگاہی ہوئی۔ اردو میں جو ترقی پسند ادب تخلیق ہوا تھا، انجم نے ان کے بارے میں بتایا۔ رفتہ رفتہ انہیں حاصل کر کے پڑھنا شروع کیا۔ انجم کی وجہ سے روزنامہ *امروز* اب باقاعدگی سے پڑھتے۔ بعد میں انجم *امروز* کے نامہ نگار خصوصی ہوئے اور اکثر سیاسی خبریں لاہور بھیجتے۔ ازاں بعد جب مشہور ترقی پسند ہفت روزہ *لیل و نہار* لاہور سے چھپنا شروع

ہوا تو انجم قزلباش اُس کے بلوچستان سے نمائندہ ہوئے۔ وہ بھی اکثر پڑھتے تھے۔ اس میں ادبی اور سیاسی مضامین ہوتے تھے۔ مشہور ترقی پسند ادیب، صحافی اور مفکر سبطِ حسن اس کے مدیر تھے۔ اس کا ''ساتواں صفحہ'' پڑھنے کے لیے گویا ضروری تھا۔ انجم نے سیاسی خبریں بھیجنے کے علاوہ بلوچستانی ادیبوں کو بھی ملکی سطح پر روشن کرنا شروع کیا۔ عین سلام کی غزلیں اکثر *امروز* لاہور میں شائع ہوتیں۔

امروز، *پاکستان ٹائمز* اور *لیل و نہار* نے پاکستان میں فکری انقلاب برپا کیا۔ امروز گیٹ اپ، مواد اور فکری لحاظ سے پاکستان کی صحافت میں بڑی تبدیلی کا حامل رہا۔ اس کی مجلس ادارت کے تین روشن ستارے فیض احمد فیض، ایوب احمد کرمانی اور چراغ حسن حسرت نے ملک بھر میں ضیا پاشی کی اور ذہنوں کو منور کیا۔ یہی حال *پاکستان ٹائمز* کا تھا۔ اس کے بھی مدیر فیض صاحب تھے۔ میاں افتخار الدین نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ قائم کر کے ملک میں ترقی پسند فکر اور ترقی پسند ادیبوں اور تحریک کو جو قوت بخشی، وہ پاکستان میں عوام کی تاریخ میں سونے کے حروف میں لکھنے کی حامل ہے۔ پاکستانی صحافت کی پیش رفت کو اس عمل کے مرہونِ منت سمجھا جانا چاہیے۔ نام بردہ اوپر ذکر کیے ہوئے حضرات کے علاوہ کئی نام ور ادیب اور دانشور پاکستان پیپرز لمیٹڈ کی وجہ سے برسرِ روزگار ہو گئے اور نہایت اطمینان سے اور نڈر ہو کر قلم چلا رہے تھے۔ ظہیر بابر، ظہیر کاشمیری، حمید اختر، منہاج برنا اور کئی لوگ اس پریس کے سبب کام کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ مطمئن ہو کر ادب تخلیق کر رہے تھے۔ امریکی سامراج اور رجعت پرست فکر کے خلاف مضبوط محاذ قائم ہوا تھا۔ تمام ترقی پسند اور کمیونسٹ کارکن اور پارٹی رہنما میاں صاحب کے ہم نوا اور مدد و معاون تھے۔ پاکستان بھر میں ڈھاکہ سے لے کر پشاور کوئٹہ تک یہ سب متحد و ہمکار تھے۔

انجم قزلباش میاں صاحب کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اور وہ تھے بھی تعریف کے قابل۔ ہم نے انہیں کراچی میں صدر کے ایک پارک میں تقریر کرتے دیکھا اور سنا۔ نیشنل پارٹی میاں صاحب اور کمیونسٹ پارٹی کی کوششوں اور فکری اتحاد کا نتیجہ تھی۔ میاں صاحب اور اسی جلسہ میں مولانا بھاشانی کی پرجوش تقریروں کو سنا۔ عوام کے اقتدار اور ان کے حقوق کے حل میں اور امریکی سامراج اور اس کے حمایتی رجعت پرستوں اور جاگیرداری، سرمایہ داری مظالم کے خلاف

انتہائی واضح ہوکراور کھل کر تقریر کررہے تھے۔ بالآخر وہ تمام پیش رفت ان قوتوں سے برداشت نہ ہوئی اورانجام 1958 اکتوبر کے مارشل لا کی صورت میں برآمد ہوا۔

انجم صاحب نے اس فکر کو لٹ خانہ اوراس کے رہنے والے ساتھیوں میں پروان چڑھایا اور ترقی دی۔

اُن دنوں میرے بڑے بھائی آزاد جمالدینی روزگار اور کاروبار کے لیے تمام جتن کرکے تھک کر ہار گئے تھے۔ اورآخرالامر مجھے نصیحتیں کرکے (وہ چاہتے تھے کہ میں بھی کاروبار کرکے پیسہ کماؤں) ہتھیار ڈال کر لٹ خانہ پہنچ گئے۔ اوراسی ماحول میں ہمارے ہی رنگ میں انہوں نے رنگنا شروع کیا۔ انجم کی محبت، خلوص اور فکر نے اسے فوراً اپنالیا اوران کی سوچ کی کایا پلٹ دی۔ وہ تو تھے ہی خطرناک شاعراورادیب۔ انجم نے اس کی فطرت کو اجاگر کردیا۔

اب انجم قزلباش، ملک محمد پناہ اورعین سلام نے مل کرآزاد کی فکری صلاحیتوں کو صقیل کرنا شروع کیا۔ آزاد کی شاعری روز بہ روز انتہائی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ جو ترقی پسند شاعری اور ادب کا مطالعہ شب وروز کررہے تھے۔ فیض، ساحر، ندیم، ظہیر کاشمیری، علی سردار جعفری، جوش برصغیر کے اور عالمی سوشلسٹ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات نے آزاد جمالدینی کو نئے سرے سے جنم دیا۔ لٹ خانہ کے قریب گلی میں جام میر خان صاحب کے اجڑے ہوئے باغیچہ میں جہاں مستری محمد غوث کی کٹیا تھی، دن بھر انجم، آزاد اورعین سلام (گرمیوں کا موسم تھا) سرجوڑے بیٹھے رہتے۔ آزاد اپنی شاعری تخلیق کررہے تھے اور وہ ان کی فکری معاونت کرتے۔ آخران کاوشوں کا نتیجہ برآمد ہوا۔ چند صفحوں کا ایک کتابچہ، جس میں آزاد کی بلوچی شاعری تھی اور ساتھ ہی ان اشعار کا اردو ترجمہ۔ ترجمہ نثر میں انجم قزلباش نے کیا۔ بلوچی شاعری میں ایک بہت نمایاں اور گراں بہا ابتدا اوراضافہ سمجھا گیا۔ اس میں جدید اور ترقی پسند نظریہ سے بھرپور کام لیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ کتابچہ جس کا نام ہے؛ ''مستیں توار'' ہر سو چھا گیا۔ ''امروز'' اور''افکار'' کراچی میں آزاد کی شاعری کے اردو تراجم شائع ہونے لگے۔ ترقی پسند ادب میں یوں آزاد اوران کی شاعری کا تعارف ہوا۔ بعد میں انہی اشعار کے اردو سے دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوئے۔ یہاں تک کہ سوویت یونین میں کرغیزی

ادب میں اس کے ترجمے ہوئے۔ خود آزاد کی زندگی اور سوچ میں بے پناہ انقلاب آیا۔

میں اور آزاد کبھی کبھار نوشکی جاتے۔ وہاں بھی ان کی شاعری کے چرچے ہونے لگے۔ ان کی نظم پوریاگر (محنت کش، مزدور) اور آزاد بلوچستان، من باور چون کنیں آزادن آزاد (میں کیسے یقین کروں کہ میں آزاد ہوں) زبان زدِ خاص و عام تھیں۔ کتابچہ کو غلام محمد شاہوانی نے اسلامیہ پریس سے چھپوایا اور نہایت ہوشیاری سے وہاں سے اٹھوا کر تقسیم کیا۔ جب سی آئی ڈی کو پتہ چلا تو وہ ابھی اس کتابچہ کو چھاپہ مار کر ضبط کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی، مگر کتابچہ بڑی چابکدستی سے تقسیم ہو چکا تھا۔ البتہ انجم قزلباش اور آزاد جمالدینی سی آئی ڈی کی نظر میں آچکے تھے۔

گل خان نصیر اور میر نبی بخش زہری کا آپس میں گزارہ اب مشکل ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ کے پردے میں کام کرنا ناممکن ہوگیا۔ یہ پردہ کام نہ دے سکا۔ لہٰذا اب گل خان نصیر کے لیے کوئٹہ میں قیام کرنا مشکل ہوا۔ اب تو مجھے بھی سو روپے ماہانہ ملنا بند ہوا۔ اور میں نے بھی بہتر سمجھا کہ اخبار کا کام نہ ہونے کے سبب نوشکی میں جا کر اپنا اور کام کرنا بہتر تھا۔

نوشکی میں گل خان نصیر اور میں روزانہ اپنے اپنے گاؤں سے شہر آتے اور شام تک شہر میں رہتے۔ ہمیں دیکھ کر دیگر نوجوان اور عوامی کارکن ہمارے پاس آکر اکٹھے ہوتے۔ جو کچھ ہمارے ذہن میں ہوتا، وہ ان کے آگے بیان کردیتے۔ میر لونگ خان، میر اکرم خان مینگل، میر نور احمد جمالدینی، میر چندن خان اور محمد حنیف جمالدینی اور کئی اور ہمارے ساتھ تھے۔ سی آئی ڈی کی نظر نیک ہم پر رہتی۔ گل خان نصیر تو ان کے لیے پرانے پاپی تھے۔ روزانہ ہماری رپورٹیں پی، اے (پولیٹیکل ایجنٹ) چاغی اور کوئٹہ سپیشل برانچ کو بھیج دی جاتیں۔ ہم بھی برملا اظہار خیال کرتے۔ سرداروں اور استحصالی قوتوں کے خلاف، امریکی سامراج کے خلاف، سوشلزم کا پرچار کیا کرتے۔ سرداراور معتبرین جو پی، اے چاغی کے خوش آمدی اور رجعت پرست فکر کے علم بردار تھے، ہمارے خلاف تھے اور وہ بھی جھوٹ موٹ کی رپورٹیں پی، اے کے پاس لے جاتے۔ ان میں ہمارے اپنے عزیز بھی شامل تھے۔ گل خان نصیر بلوچی اور اردو میں ان قوتوں کے خلاف شاعری کرتے اور ہمیں سناتے۔

اسی سال ضلع چاغی میں بہت سخت قحط سالی ہوئی۔ گندم اور اشیائے خوردنی کی انتہائی کمی ہوئی۔ لوگ پریشان حال ہوئے۔ ان حالات نے ہمیں اظہارِ خیال کرنے پر مجبور کیا۔

کوئٹہ سے ''خاور'' نام کا ہفت روزہ پرچہ شائع ہونے لگا۔ اس کی چیف ایڈیٹر اور مالکہ مشہور وکیل عاصم ملک کی بیگم مریم عاصم ملک تھیں۔ وہ روشن خیال خاتون تھیں۔ سید کامل القادری کا ان کے پاس آنا جانا تھا۔ وہ یو پی کی تھیں۔ علم دوست اور عوام دوست خاتون تھیں۔ پرچہ کامل القادری کے سپرد کر دیا۔ کامل نے اسے ترقی پسند اور عوامی پرچہ بنایا اور لٹ خانہ والوں کو دعوت اشتراک و تحریر دی۔ میں نو آموز قلم کار تھا۔ چنانچہ میں نے نوشکی میں رہ کر لکھنا شروع کیا۔ بلوچی میں اور اردو میں۔ میں نے ایک مضمون ''چاغی کے سفید ہاتھی'' کے عنوان کے تحت لکھا۔ اس میں نوشکی کے چاپلوس معتبرین اور جرگہ ممبروں اور پی، اے چاغی اور دیگر بدعنوان افسروں کو ہدف ملامت ٹھہرایا۔ پی، اے چاغی سخت برہم ہوئے مگر نوشکی کے عوامی حلقہ نے اسے سراہا۔ اور اس طرح میری حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے لکھنے اور عوامی مسائل کو موضوع بنانے کا تہیہ کیا۔

ماہتاک ''سنگت'' کوئٹہ، جنوری 1998

۱۷

میر نبی بخش زہری کے ہفت روزہ اخبار ''نوائے بلوچستان'' سے فراغت پا کر ہم (میں اور میر گل خان نصیر) اپنے اپنے دیگر مشاغل سے وابستہ ہوئے۔ میرا زیادہ وقت اب نوشکی میں گزرنے لگا۔ گل خان نصیر نے مجھ پر کئی اور احسانات کے علاوہ ایک اور احسان کیا۔ ان کے پاس ایک نایاب کتاب تھی جو انہوں نے مجھے دیکھنے اور پڑھنے کے لیے دی۔ کتاب تو میں پوری طرح پڑھ نہیں سکا البتہ اسے دیکھ کر اس سے واقفیت حاصل کی۔ یہ کتاب تھی مشہور انگریز مستشرق لانگ ورتھ ڈیمز (Long worth Dames) کی تصنیف۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔ دو مختلف پبلشروں کے؛ (1) رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور (2) بنگال فوک لور سوسائٹی کی طرف سے۔ کتاب کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں بلوچی کلاسیکل شاعری کا متن رومن سکرپٹ میں اور دوسری جلد میں اس متن کا انگریزی نثر میں ترجمہ۔

ایک ناشر نے دونوں جلدوں کو یکجا کر کے جلد بندی کی ہے۔ دوسرے نے ہر جلد کو علیحدہ علیحدہ شائع کیا ہے۔ یہ کتاب 1907 میں لندن سے شائع ہوئی۔ اس وقت یہ کتاب Out of

Print اور نایاب تھی، ہم جیسے بے وسیلہ لوگوں کی دسترس سے باہر۔ بعد میں خوش قسمتی سے یہ کتاب علیحدہ علیحدہ جلدوں کی صورت میں مجھے آغا عبدالکریم خان احمد زئی کے گھر سے مختلف اوقات میں ملی۔ اس کتاب نے بلوچی کلاسیکل شاعری سے میری محبت اور وابستگی بڑھادی اور اس ادبی سرمایہ کو اکٹھا کرنے کے لیے میں بھی ڈیمز کی طرح آمادہ ہوا۔

بعد میں جناب جسٹس خدا بخش مری نے لندن میں کتاب حاصل کر کے اس کا ''بلوچی قدیم شاعری'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کروایا۔

گاؤں میں رہ کر میں بہت خوش تھا۔ پڑھتا، لکھتا اور گھومتا۔ گاؤں کے آس پاس ریت کے ٹیلے پر بیٹھ کر مطالعہ کرتا یا پھر سوچنے لگتا۔ شہر آنا جانا ضروری تھا۔ وہاں گل خان نصیر اور دیگر ہم فکر دوستوں سے ملتا اور تبادلہ خیال اور سیاسی گفتگو ہوئی۔

اُس سال ہمارے ضلع چاغی میں بہت سخت قحط آیا ہوا تھا۔ لوگوں کو کھانے کے لیے غلہ دستیاب نہ تھا۔ کاروباری لوگ سندھ اور کچھی کے علاقوں سے ناکارہ غلہ نوشکی لے آتے۔ چاول کی ایک بہت ناقص قسم جسے ڈرو کہا جاتا تھا، مہنگی قیمت پر فروخت کرتے۔ لوگ مجبور ہوتے قرض لے لیتے۔ شہر میں دن بھر ہمارا موضوعِ گفتگو قحط اور لوگوں کی مشکلات کے بارے میں ہوتا۔ سرکاری حکام بالخصوص پولیٹیکل ایجنٹ چاغی ہماری تنقید و ناپسندیدگی کا نشانہ ہوتے۔ سی آئی ڈی تو ہمارے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ ہماری رپورٹیں باقاعدگی سے پی اے چاغی تک جا پہنچتیں۔ لہٰذا حکام، میر اور معتبرین جو حکام کے جی حضوری ہوتے ہیں، بڑھ چڑھ کر ہماری شکایتیں کرتے اور حکام کو ہمارے خلاف بھڑکا دیتے۔

نوشکی میں گل خان نصیر کے علاوہ ایک اور سیاسی شخصیت مقبول تھی اور وہ ہمیشہ عوام کی رہنمائی کرتے۔ وہ جامع مسجد نوشکی کے امام جناب مولانا غلام حیدر نوشکوی تھے۔ چند سال قبل انہوں نے اور گل خان نصیر اور ان کے ساتھیوں نے ایسے ہی راشن کی نایابی کی مشکلات میں لوگوں کی رہنمائی کی۔ اس وقت پاکستان قائم نہیں ہوا تھا۔ تاج برطانیہ کا جھنڈا اس وقت تک بدستور لہرا رہا تھا۔ پی اے چاغی ایک انگریز آفیسر تھے۔ مولوی صاحب، گل خان نصیر، میر بلال خان اور ان کے

کئی دیگر ساتھی گرفتار کر لیے گئے اور انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ لوگ بے حد مشتعل ہوئے تھے۔ رات بھر پولیس جیل خانہ کے گرد گھیراؤ کر کے بیٹھے رہے۔ اگلے روز حکومت نے مجبور ہو کر ان لیڈروں کو رہا کیا۔ یہ واقعہ نوشکی کی سیاسی تاریخ میں ''ہنگامہِ نوشکی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گل خان نصیر نے اس واقعہ کو ایک طویل بلوچی نظم کی صورت میں قلم بند کیا ہے۔ ان کی شاعری کے پہلے مجموعہ ''گل بانگ'' میں یہ نظم شائع ہوئی ہے۔

گل خان نصیر، مولوی غلام حیدر نوشکوی، میر بلال خان جمالدینی حکومت کی نگاہوں میں بدستور معتوب تھے۔ پی اے چاغی جو اس وقت خان عبداللہ خان غلزئی تھے، ان حضرات اور ہم سب سے نالاں تھے اور موقع کی تلاش میں تھے کہ کسی نہ کسی بہانے انہیں اندر کیا جائے۔

مولوی صاحب تو نہایت آتش بیان شخص تھے۔ جمعہ کے خطبہ میں اور نوشکی بازار میں جہاں جاتے پی اے چاغی اور ضلعی حکام کو ہدفِ تنقید بناتے اور لوگوں کی مشکلات کے حوالے سے لوگوں کو شعور دلاتے۔ لہٰذا حکام اور معتبرین مولوی غلام حیدر نوشکوی اور ان کے رفقا کے بارے میں سازش کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔ مولوی صاحب پر ناجائز اور بے بنیاد تہمت لگوانے سے بھی انہیں عار نہیں ہوتا تھا۔

اُدھر مولوی صاحب جن کا تعلق جمیعت علمائے ہند سے تھا اور برصغیر کے مشہور عالم، دینی یونیورسٹی دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ نہایت ذہین اور سیاست کار تھے۔ انہوں نے بھی خود کو ان تمام منصوبہ بندی اور سازشوں سے آگاہ رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے بارے میں قید و بند اور مقدمات کی مشکلات کا اندازہ لگایا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بھی اس دام سے باہر نکلنے کا منصوبہ بنانا شروع کیا تھا۔

میں نے انہی حالات کے بارے میں کوئٹہ کے ہفت روزہ ''پیغام جدید'' کے لیے خبریں بھیجنا شروع کیں۔ اور ساتھ ہی ایک مضمون ''چاغی میں شدید قحط'' کے عنوان کے تحت لکھ بھیجا۔ اس ہفتہ روزہ کے مدیر عبدالصمد خان درانی تھے، جو اس سے قبل بلوچستان کے سب سے مشہور اخبار ''استقلال'' کے مدیر رہ کر شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ درانی صاحب نے میرا مضمون بہت نمایاں کر کے چھاپا تھا۔ ان تمام باتوں سے حکام بہت ناراض ہوئے۔

مولوی غلام حیدر صاحب نے اپنے منصوبہ کے تحت پہل کی۔ ایک روز کسی شادی بیاہ کا بہانہ بنا کر برات کی صورت میں باڈر کراس کر کے افغانستان میں داخل ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کے بھائیوں کے علاوہ اور فیملی کے، ہمارے ساتھی محمد حنیف جمالدینی معہ اہل وعیال افغانستان گئے۔ میرے چچازاد بھائی میر بلال خان بھی اس منصوبہ بندی میں شریک تھے۔ وہ بھی اسی رات گاؤں سے اپنے اہل وعیال لے کر اونٹ کے ذریعہ اپنے سسرال پہنچے جو افغان باڈر کے قریب تھے۔

جب پی اے چاغی اور حکام کو ان واقعات کا پتہ چلا تو نوشکی شہر میں حکومتی سرگرمیوں میں غیر معمولی حرکت شروع ہوئی۔ رات کو جب میں اپنے گھر پہنچا تو مجھے یقین تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ چنانچہ آدھی رات کو لیویز والوں نے میرے چچا کو دروازہ کھٹکھٹا کر جگایا۔ میں جاگ پڑا۔ باہر کی گفتگو سنی تو پتہ چلا کہ لیویز والے میرے چچا کو لیویز تھانہ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ مجھے زور کی ہنسی آئی۔ گھر والے حیران ہوئے۔ بات ہنسی کی نہیں بلکہ پریشانی کی تھی مگر میں ہنس رہا تھا۔

صبح پتہ چلا کہ میر بلال خان، میر محمد حنیف اور مولوی صاحب کے ضامنوں کو پی اے چاغی نے پیش ہونے کے لیے بلایا تھا۔ صبح میں اور میرے دیگر عزیز شہر گئے اور لیویز تھانہ جا کر چچا اور دیگر عزیزوں کی خبر گیری کی۔ چار پانچ افراد ہمارے قبیلہ کے معتبرین میں سے لیویز میں بٹھائے گئے تھے۔ شہر گیا تو وہاں میر گل خان نصیر، میر اکرم خان اور دوسرے دوست آئے تھے۔ انہیں بھی ان تمام واقعات کا علم تھا۔ دن بھر شہر میں رہے۔ میں انتظار میں تھا کہ میری اور میر گل خان نصیر کی باری کب آئے گی۔ میرے چچازاد بھائی میر افضل جان کو بھی پی اے نے بلایا تھا۔ سہ پہر کے وقت بالآخر لیویز کا سپاہی آیا اور مجھے بتایا کہ صاحب اوپر بنگلہ پر آپ کو بلا رہا ہے، چنانچہ میں فوراً روانہ ہوا۔ پی، اے کا دفتر اور بنگلہ دونوں اس زمانے میں اوپر پہاڑی پر تھے۔ اب بھی پی اے چاغی کی رہائش وہیں ہے۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ نام بردہ حضرات کے ضامن سب کے سب پی اے کے دفتر میں بلائے گئے۔ ان کے علاوہ نوشکی کے تینوں قبیلوں جمالدینی، بادینی، مینگل کے تینوں سرداروں اور بڑے معتبرین کو مشورہ کے لیے پی اے نے بلایا تھا۔ بہت دیر تک ہم باہر انتظار کرتے رہے۔ آخر کار سردار صاحبان اور معتبرین دفتر سے باہر نکل کر چلے گئے۔ اب ہماری باری تھی۔ میں

اور میرے چچازاد بھائی میر محمد افضل، محمد حنیف کے بوڑھے والد حاجی میر رازو خان اور میرے چچا اور ہمارے دو اور رشتہ دار میر عیسیٰ خان اور میر کرم خان جو باہر کھڑے تھے، ہمیں بلایا گیا۔ پی اے کے پاس پیش ہوئے۔ سب سے بات ہوئی اور یہ ہوا کہ انہیں جیل بھیج دیا جائے گا۔ میری طرف انتہائی غضب آلود نگاہ کر کے پی اے صاحب نے کہا، ''تمہارے خلاف کوئی مقدمہ ہے؟'' میں نے فوراً جواب دیا، ''پہلے تو کبھی نہ تھا مگر آج سے شروع ہوگا''۔ بس اس کے بعد انہوں نے حکم دیا کہ ہمیں ای، اے، سی کے پاس لے جایا جائے۔

ای، اے، سی اُس وقت میرے نہایت مہربان اور بلوچستان یونیورسٹی کے سابق رجسٹرار جناب محمد انور کھیتران کے والد حاجی میر ابراہیم خان کھیتران تھے۔ ان کے سامنے ہم پیش کیے گئے۔ باقی لوگوں کو تو پہلے پولیس تھانہ جیل بھیج دیا گیا تھا۔ میں جب پیش ہوا تو حاجی صاحب نے پی اے کا حکم سنایا کہ مجھے میری سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار کیا جا رہا ہے اور مجھے ہتھکڑیاں پہنائی جائیں۔ چنانچہ مجھے ان کے دفتر سے باہر لے جا کر پولیس کے سپاہیوں کے حوالے کیا گیا۔ جنہوں نے مجھے ہتھکڑیاں لگا دیں۔ آس پاس میرے عزیزوں اور ساتھی عبدالقیوم جمالدینی، میر محمد اکرم مینگل کے علاوہ بہت لوگ جمع ہوئے۔ ہم تو تھے بھی اس وقت عوامی لوگ۔ سب افسردہ خاطر ہوئے۔ ان کے برعکس میں نے اپنے آپ کو ہیرو محسوس کر کے خوشی اور مسکراہٹ سے اس عمل کا استقبال کیا۔ میری دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔

قید و بند اور سیاسی گرفتاریوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ چکا تھا۔ اس وقت میں اپنے آپ کو ماکسم گورکی کے ناول ''ماں'' کے ہیرو پاویل کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ ہنستے اور خوشی مناتے سپاہی مجھے پولیس جیل پہنچا گئے۔ تلاشی کے بعد مجھے بند کیا گیا تو وہاں ہمارے ساتھ بوڑھے حاجی میر رادو خان، میر محمد حنیف کے والد اور میر محمد افضل، میر عیسیٰ خان اور میر کرم خان موجود تھے۔ ماسوائے حاجی میر رادو خان کے اور میر محمد افضل کے باقی دو صاحبان نہایت افسردہ تھے۔

رات ہوئی تو ہمارے سردار جمالدینی (جو میرے چازاد بھائی بھی تھے) ہماری حال پرسی کے لیے آئے۔ بستر بھجوایا اور کھانا بھی۔ رات بڑی خوشی اور خوش گپی میں گزری۔ حاجی میر رادو

خان نہایت ہی دلیر اور پُر مزاح انسان تھے۔ انہوں نے بہت دلچسپ الف لیلوی کہانی سنائی۔

دیر بعد پی اے صاحب خود جیل تشریف لائے اور جیل کے دروازے سے پوچھا، یہاں کون کون ہیں؟ جیل والوں نے سب کے نام گنوائے اور آخر میں جب میرا نام لیا تو پی اے صاحب فوراً واپس لوٹ گئے۔ وہ مطمئن ہوئے کہ میں جیل میں بند تھا۔

فراریوں کے باقی ضامن جن میں میرے چچا اور ہمارے قبیلہ کے چند اور معتبرین تھے، انہیں لیویز تھانہ میں بند کیا گیا تھا۔

رات مسرت اور چین سے گزری اور صبح اس انتظار میں تھے کہ کب ہمیں پی اے صاحب کے پاس پیشی کے لیے لے جایا جائے گا۔ میں دل میں از خود پی اے کے سوالات ترتیب دیتا اور اپنی طرف سے تند و تیز جوابوں کو تشکیل دے رہا تھا۔

وہ نہایت ہی خوبصورت دن تھا۔ یکم جنوری 1953، نیا سال شروع ہوا تھا۔ رات بھر بارش ہوئی تھی اور صبح بھی۔ جب مجھے پولیس والے لے جا رہے تھے، بونداباندی ہو رہی تھی۔ فضا پاک و صاف تھی۔ دشت و کوہ سب دُھل گئے تھے اور ریت کے ٹیلے بھی۔ اگرچہ اس وقت نظر نہیں آرہے تھے کیونکہ سامنے کی پہاڑی جس پر پی اے چاغی کا دفتر اور بنگلہ تھا، اس نظارے کو دیکھنے میں حائل تھی۔

چلتے چلتے اچانک سپاہی بائیں طرف مڑے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے پی اے چاغی کے پاس لے جائیں گے۔ مگر وہ مجھے سڑک کے قریب سرشتہ دار صاحب کے دفتر پہنچا گئے۔ اس وقت ہمارے اور بلال خان کے گہرے دوست مرزا احسان الحق سرشتہ دار تھے۔ وہاں پہنچ کر میں حیران ہوا۔ غلام جان شاہوانی، میر لونگ خان مینگل (میر گل خان نصیر کے بڑے بھائی) اور اکرم خان کے علاوہ میرے عزیز سرشتہ دار کے دفتر میں بیٹھے تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ سپیشل تحصیلدار میر تاج محمد خان لہڑی بھی تشریف فرما تھے۔ وہ اس وقت سپیشل ڈیوٹی پر تھے۔ یعنی افغان بارڈر کے معاملات کے تحصیلدار تھے۔ چونکہ جو لوگ فرار ہوئے تھے وہ افغان سرحد پار کر گئے تھے۔ میں نے فرض کیا کہ یہ سب کچھ ان کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں دفتر میں داخل ہوتے ہی جذباتی ہوا اور

ان پر برس پڑا۔ وہ ہماری ملازمت کے دوران رفیق کار اور اچھے دوست تھے۔ وہ ہنستے رہے۔

معلوم ہوا کہ گذشتہ شام میر غوث بخش بزنجو صاحب اور غلام جان شاہوانی کوئٹہ سے آئے تھے۔ شہر میں جب ان کو میری گرفتاری کا پتہ چلا تو پریشان ہوئے تھے۔ اُن کو اِن تمام واقعات کا علم نہیں تھا۔ رات انہوں نے کلی مینگل میں میر گل خان نصیر کے گزاری تھی اور علی الصبح شہر آکر پی اے کے پاس گئے تھے۔ پی اے ان کی اہمیت سے واقف تھے اور ان کی شخصیت کے قدردان بھی۔ بزنجو صاحب نے ان سے میری گرفتاری پر حیرانی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ مجھے رہا کیا جائے۔ میں نے صرف ایک رات جیل میں گزاری تھی۔ پی اے نے جواب دیا تھا کہ وہ مجھے رہا کریں گے مگر کچھ عرصہ بعد۔

ماہنامہ ''سنگت''، کوئٹہ۔ فروری 1998

۱۸

بہرکیف بزنجو صاحب کے اصرار پر مجھے پانچ ہزار کی ضمانت پر رہا کرنے پر راضی ہوگئے تھے۔

اب جب میں نے یہ بات سنی میں تو ہیرو بنا تھا اور زندگی میں اس پہلی گرفتاری پر نازاں تھا۔ ضمانت دینے پر کہاں راضی ہوتا۔ ضمانت تو میر لونگ خان داخل کر چکے تھے اور تمام کاغذات تیار تھے۔ بہ مشکل مجھے راضی کیا گیا۔ رہا ہو کر ہم سب کلی مینگل میر گل خان نصیر کے گھر گئے۔

بہت ہی خوبصورت دن تھا۔ گل خان نصیر، غوث بخش بزنجو، غلام جان شاہوانی، میر لونگ خان شہید اور میر اکرم خان کی صحبت میں دن بھر خوش رہا۔ رات بھی وہیں گزار دی۔ اگلے روز بزنجو صاحب اور غلام جان کوئٹہ روانہ ہوئے۔ میں اور میر گل خان نصیر نوشکی میں رہے۔ بزنجو صاحب نے ہمیں کہا کہ کچھ روز رہ کر کوئٹہ جائیں۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔

کوئٹہ آ کر لٹ خانہ پہنچا اور دوستوں کو تمام حال سے باخبر کیا۔ لٹ خانہ کے وہی سابقہ لیل و نہار تھے۔ بعد میں اکثر سٹینڈرڈ ہوٹل میر گل خان نصیر اور بزنجو صاحب کے پاس جاتے۔ وہاں ملک پناہ صاحب اور غلام جان ملتے۔ غلام محمد بدستور روزنامہ اتحاد میں کام کر رہے تھے۔

نیا سال 1953 بھی اپنی اہمیت میں لٹ خانہ کے لیے کچھ کم نہ تھا۔ اس سال پشتو زبان کے مشہور مجلّہ ''پشتو'' کی اشاعت شروع ہوئی۔ لٹ خانہ ہی اس کی جائے پیدائش اور جائے وفات رہا۔ جب بلوچی کے مجلّہ ''سوب'' کے اجرا کی درخواست کو رد کیا گیا تو لٹ خانہ کے احباب کے مشورہ سے ایک پشتو رسالے کی درخواست کی تجویز ہوئی۔ چونکہ ''سوب'' کا تجربہ اس بارے میں ہوا تھا کہ لٹ خانہ میں موجود ساتھیوں کے کسی نام سے ڈیکلریشن ملنا مشکل ہوگا اور اس کی درخواست رد کر دی جائے گی۔ کیونکہ سی آئی ڈی کی رپورٹیں سب کے حق میں اچھی نہ تھیں۔ چونکہ کمال خان اکثر لٹ خانہ سے باہر ہوتے، ان کے نام کی اجازت کا امکان نظر آیا۔ چنانچہ کمال خان کے نام سے ڈیکلریشن کے لیے درخواست دی گئی تھی۔ پانچ چھ ماہ کے بعد ''پشتو'' ماہنامہ کا ڈیکلریشن حاصل ہوا۔ اور اسے شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا۔

''پشتو'' اگرچہ کمال خان شیرانی کے نام سے شروع ہوا۔ مگر اس کا کرتا دھرتا سب کچھ خدائیداد تھے۔ اس وقت ڈاکٹر خدائیداد اسی نام سے مشہور تھے۔ خدائیداد نے انتہائی لگن، محنت اور خلوص سے یہ کام شروع کیا۔ خدائیداد ایڈیٹر تھے۔ ''پشتو'' کے لیے مضامین اور دیگر مواد اکٹھا کرتے۔ کور کو مختلف طریقوں سے سجاتے۔ کیونکہ وہ آرٹسٹ بھی تھے اور ہر قسم کے اشاعتی ٹیکنیک سے آگاہ تھے۔ چنانچہ اپریل 1953 میں ماہنامہ ''پشتو'' کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ دن بھر لٹ خانہ میں خدائیداد اسی کام میں مصروف رہے۔ بس ٹیوشن کے لیے باہر جاتے۔ اور اس محنت سے جو کما کر لاتے ''پشتو'' کے لیے کاغذ خرید کر کے پریس میں دیتے۔ پرچہ اسلامیہ پریس میں چھپتا۔ پرچہ کے پروف بھی خدائیداد پڑھتے۔ میری کوشش تھی کہ ان کا ہاتھ بٹاتا۔ مگر میں اپنے آپ کو اس قابل نہ سمجھتا۔ خدشہ رہتا کہ کہیں پشتو مضامین میں غلطیاں نہ رہ جائیں۔

''پشتو'' ماہنامہ کی اشاعت بلوچستان میں بالخصوص پشتو ادبی دنیا میں جو اس وقت انتہائی درجہ محدود تھی، بہت ہی نیا تجربہ اور خوش آئند بات تھی۔ پشتو پڑھنے والوں اور خصوصاً نوجوانوں نے ماہنامہ ''پشتو'' کو خوش آمدید کہا۔ خدائیداد جنہیں پشتو ادب سے بہت عرصہ سے واقفیت اور دلچسپی رہی تھی اور صوبہ سرحد اور افغانستان میں جو نامور ادیب تھے اور صوبہ سرحد میں جو ادیب اور شعرا تھے،

ڈاکٹر خدائیداد ان سب سے واقف تھے۔ چنانچہ ان کے ایڈریس حاصل کر کے انہیں ماہنامہ ''پشتو'' بھیجنا شروع کیا۔ ان کی طرف سے ریسپانس فوراً اور نہایت مثبت تھا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے سب سے پہلے ہمیش خلیل نے پشاور، تہکال سے اپنے اشعار بھیجنا شروع کیے۔ ہمیش صاحب پشتو کے نامور شاعر اور محقق ہیں۔ پشاور سے مفلس درانی، میر مہدی شاہ، ایوب صابر اور جگر آفریدی، مراد شنواری، سید محمد رسول فریادی، علی محمد برگر، عبدالخالق تارن، میر آبو نے اپنے اشعار اور تحریریں ''پشتو'' کو بھیجیں۔ اسی طرح سرحد سے کئی دانشوروں نے اور مشہور شاعر، ادیب اور محقق قلندر مومند نے بھی اپنے اشعار اور تحریریں بھیجیں۔ انہی سالوں میں افغانستان میں شاہی حکومت سے باغی ہو کر چند افغان دانشور فرار ہو کر سرحد پار کر کے پاکستان آئے تھے۔ ان کے رہبر گرامی قدر مورخ، ادیب، محقق جناب پروفیسر عبدالحئی حبیبی تھے۔ کچھ پشاور گئے تھے اور چند ایک کوئٹہ آئے تھے۔ حبیبی صاحب سے محترم ڈاکٹر خدائیداد کی جان پہچان بہت پہلے سے تھی۔

جب وہ چمن میں افغان وکیل التجار تھے اور کوئٹہ آتے رہے تھے، پشاور میں تھے تو وہاں ایک سرکاری پرچہ ''جمہور اسلام'' میں لکھتے رہتے تھے۔ ان کو خدائیداد صاحب نے دعوت اشتراک دی۔ انہوں نے دعوت قبول کی اور ماہنامہ ''پشتو'' کے لیے اپنی تحریریں بھیجتے رہے۔

مجلّہ ''پشتو'' میرے خیال میں پہلا ترقی پسند پشتو پرچہ تھا۔ اس سے بہت پہلے سنا تھا کہ ''اسلم'' کے نام سے صنوبر حسین کاکاجی پشاور سے پرچہ نکالا کرتے تھے۔ ان کا نام ترقی پسندوں میں نہایت عزت و احترام سے لیا جاتا تھا۔ بلوچستان میں تو پشتو تحریر پرچوں میں بالکل نئی بات تھی۔ البتہ کبھی استقلال میں مولانا عبدالخالق تارن کی پشتو نظمیں نظر سے گزری تھیں۔

ماہنامہ ''پشتو'' نے بڑا نام پیدا کیا۔ چونکہ ترقی پسند پرچہ تھا اور اس دور میں ترقی پسند ادیب اور صحافی کھل کر اور شدت سے امریکی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کے قسم کھائے ہوئے دشمن تھے۔ خصوصاً پاکستان میں ان دنوں حکومت ایسی فکر کی بیخ کنی میں مصروف تھی۔ پھر امروز، *پاکستان ٹائمز، لیل و نہار* اور اس کا ''ساتواں صفحہ'' ترقی پسندوں اور سامراج پرستوں سے جنگ میں پیش پیش تھے۔ ظاہر ہے کہ ماہنامہ ''پشتو'' کسی سے پیچھے رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ پہلے ہی شمارہ میں

پرچہ تیار ہی ہوا تھا کہ روزن برگ جوڑے کی سزائے موت کی خبر نے ترقی پسندوں اور پوری دنیا کو چونکا دیا تھا۔ انہیں بجلی کے چیمبر میں بند کر کے سزائے موت دی گئی تھی۔ ''پشتو'' کی ادارت نے پرچہ کے کور کے آخری صفحہ پر امریکی حکومت کو لعنت کہہ کر یہ خبر شائع کی۔ اس طرح پہلے پرچے سے ہی ماہنامہ ''پشتو'' حکومت کی نظروں میں کھٹکتا رہا۔ اس کی عمر ایک سال سے زیادہ نہ رہی۔ 1954 میں ماہنامہ پشتو اور ڈاکٹر خدائیداد اور لٹ خانہ کا یہ بے بہا ادبی مجلّہ بند ہوا۔

اسی سال تھا یعنی 1953 میں گھر نوشکی گیا تھا۔ وہاں مجھے میر غوث بخش بزنجو کا پیغام ملا کہ میں کوئٹہ چلا آؤں۔ کوئٹہ آ کر جب میر صاحب کے ہوٹل واقعہ مشن روڈ، ان سے ملنے کے لیے گیا تو وہاں احباب کی موجودگی میں میر صاحب نے خوشخبری سنا دی کہ ''نوائے وطن'' کے لیے جو درخواست ڈیکلریشن کے لیے غلام محمد شاہوانی نے لیا تھا، اس کی اشاعت کی اجازت انہیں مل گئی ہے۔ وہ خود چونکہ روزنامہ ''اتحاد'' کے نیوز ایڈیٹر ہیں یہ کام اب نہیں کر سکتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ''نوائے وطن'' کی ادارت میر گل خان نصیر کریں اور ان میں ان کی معاونت کروں۔ غلام محمد اور میر گل خان نصیر بھی موجود تھے۔ میں نے لبیک کہا اور خوش ہوا۔

''نوائے وطن'' کا دفتر وہی ہوٹل کا کمرہ جس میں میر گل خان نصیر اس وقت رہائش کر رہے تھے، قرار پایا۔ میں حسب دستور جس طرح ''نوائے بلوچستان'' کے دور میں تھا، صبح ہوٹل میر صاحب کے پاس آتا۔ اشاعت کے لیے مواد جمع کر کے اسلامیہ پریس جاتا۔ دوست احباب بھی اکثر وہاں آتے۔ ورنہ پریس میں یا ڈان ہوٹل میں ان سے ملاقات ہوتی۔ ملک محمد پناہ صاحب بھی جب فارغ ہوتے وہاں آتے۔ اور رات کو غلام محمد شاہوانی اور لٹ خانہ کے باقی ساتھی سب لٹ خانہ میں موجود ہوتے۔

جون 1953 میں ''نوائے وطن'' کا پہلا شمارہ گل خان نصیر کی ادارت میں کوئٹہ سے شائع ہوا۔ میں ان کا بدستور (جیسا کہ ''نوائے بلوچستان'' کے دور میں) معاون مدیر تھا۔ اخبار کی پالیسی اب نسبتاً آزاد تھی۔ قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کی فکر اور نظریات کی پیروی، آزاد خیال نیشنلسٹوں کی پالیسی، بائیں بازو کی جانب رجحان پھر گل خان نصیر صحافی کے علاوہ ادیب اور شاعر تھے۔ اخبار میں

ادبی مواد اور خبریں ہوتیں۔ پرچہ عوامی تھا۔ یعنی عوام کے مسائل سے متعلق۔

مئی کے آخر میں یا جون کے شروع میں سکھر سے کامریڈ ابراہیم مالا باری تشریف لائے۔ وہ روہڑی میں بیڑی ورکرز (مزدوروں) کے رہنما تھے۔ شروع زندگی میں اپنے علاقہ کرالا اور مالا بار میں ہی مزدور گھرانے میں پیدا ہو کر کمیونسٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین تحریک میں سرگرم رہے تھے۔ اب برصغیر کی تقسیم نے انہیں سندھ اور پاکستان میں اسی تحریک میں سرگرم کیا تھا۔

ابراہیم انتہائی سیاہ تھے اور کپڑے سفید پہن رکھے تھے۔ بال لمبے اور پیچھے کو کنگی کئے ہوئے تھے۔ دانت انتہائی سفید۔ آنکھیں بے حد بیدار اور روشن تھیں۔ سفید کرتہ کے ساتھ سفید پاجامہ اور کندھے پر سفید تولیہ، ہمارے یہاں کی چادر کی طرح ڈالا کرتے تھے۔

لٹ خانہ میں کامریڈ ابراہیم کی موجودگی ہماری فکری وسعت کی غماز تھی۔ کامریڈ ابراہیم سے انجم صاحب کی پہلے ہی سے جان پہچان تھی۔ جب وہ لاہور سے کراچی ہوتے ہوئے یا کراچی سے کوئٹہ آتے ہوئے سکھر میں ان مزدوروں کے پاس رکے تھے جو کامریڈ ابراہیم کی رہنمائی میں کام کرتے تھے۔ ان کو ٹی بی کا عارضہ تھا۔ سکھر کے دوستوں نے ان کو کوئٹہ آب وہوا تبدیل کرنے کی غرض سے بھیجا تھا۔ لٹ خانہ میں جو بھی آتا، اسے ان کی موجودگی عجیب معلوم ہوتی۔ وہ کھانستے رہتے تھے۔ ان سے ہماری کافی بات چیت ہوئی۔ وہ اپنی زندگی کے تجربات سے آگاہ کرتے۔ انجم صاحب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ سو ہم سب بھی کرتے تھے۔

یہ کامریڈ ابراہیم کی لٹ خانہ میں پہلی آمد تھی۔ وہ اب بیماری کی وجہ سے کام نہیں کر سکتے تھے۔ سکھر میں اس وقت کے مشہور سندھی وکیل سید شمس الدین شاہ کے گھر میں رہتے تھے۔ شاہ صاحب ان کی ہر طرح سے دیکھ بھال کرتے تھے۔ خود شاہ صاحب کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی تھی۔ ان کی لائبریری کی بڑی شہرت تھی۔ کامریڈ ابراہیم نہ جانے مہینہ ڈیڑھ رہ کر سکھر واپس چلے گئے۔ اب یاد نہیں وہی سال تھا یا اس سے بعد کا سال وہ دوبارہ لٹ خانہ تشریف لائے۔ مگر اس مرتبہ ان کی حالت بہت ابتر ہو چکی تھی۔ ایک لمحہ بھی کھانسی اسے چھوڑتی نہ تھی۔ دن رات کھانستے رہتے۔

لٹ خانہ کے چھوٹے سے برآمدے میں (کیونکہ گرمی کا موسم تھا) ان کا بستر لگایا تھا۔

اکثر لیٹے رہتے۔ سرہانے کے پاس پانی کا کٹورا پڑا ہوتا۔ وہ اپنے برتن ساتھ لائے تھے۔ اور دوسرے ساتھیوں کی صحت کا بہت خیال رکھتے۔ وہ کہتے ”کسی اور ساتھی کو یہ موذی مرض نہ لگ جائے۔“ کھانسی نے ان کا بہت برا حال کیا تھا۔ ایک لمحہ بھی آرام نہ تھا۔ نہ رات کو لمحہ بھر کے لیے سو سکتے۔ رات بھر بیماری سے لڑتے جھگڑتے۔ بڑبڑاتے ”موذی جان لینے کا ارادہ ہے۔ آرام کرنے نہیں دیتی۔ میرے دوستوں اور ساتھیوں کو بھی پریشان کر رکھا ہے“۔

اس مرتبہ کامریڈ ابراہیم آئے تھے کہ ہم انہیں سینی ٹوریم میں داخل کروا دیں چنانچہ ایک روز میں اور انجم قزلباش ان کو تانگے میں بٹھا کر سول ہسپتال اس مقصد کے لیے لے گئے۔ اس زمانے میں سینی ٹوریم کے انچارج ڈاکٹر عبدالخالق خان کاسی تھے۔ ہسپتال میں داخلہ لینا بہت مشکل کام تھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹروں کی تعداد بہت کم تھی۔ آج کی طرح کے ہمدرد ڈاکٹر دستیاب نہ تھے۔ اور ہم جیسے لوگ جو اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ بھلا انہیں سینی ٹوریم میں داخلہ کیونکر ملتا۔

ڈاکٹر خالق صاحب اگرچہ واقف تھے۔ اور میری فکر و سیاست سے بھی آگاہ تھے۔ انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا کہ میں ایسا مریض ان کو دکھانے کے لیے لے گیا تھا۔ اچھا نہیں کیا تھا۔

آخر ہم مایوس ہو گئے۔ میں اور انجم انہیں کھینچ کھینچ کر بڑی مشکل سے ٹانگے میں بٹھا کر لٹ خانہ لائے۔

اگلے روز کامریڈ واپس سکھر جانا چاہتے تھے۔ ایک دم جانے کے لیے آمادہ ہوئے۔ پھر میں، ڈاکٹر خدائیداد اور انجم انہیں بڑی مشکل حالات میں ریلوے سٹیشن لے گئے۔ مشکل سے تھرڈ کلاس میں ان کے لیے سیٹ پیدا کی۔ انہیں گاڑی میں لٹایا اور رخصت ہوئے۔

یہ نظارہ عمر بھر میری آنکھوں کے سامنے واضح رہا ہے۔

کامریڈ ابراہیم سے ہر وقت میری بات چیت ہوتی۔ وہ کراچی میں بیماری کی حالت میں بندر روڈ پر واقع پارٹی آفس میں رہے تھے۔ وہاں کامریڈ امام علی نازش، کامریڈ شرف علی اور کامریڈ حسن ناصر ان کی بے حد دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان کی محبت، عزت و احترام کے سلوک کو داد دیتے۔

کامریڈ ابراہیم کو اب اس بیماری کی حالت میں اپنا گھر، وطن اور عزیز واقارب یاد آتے۔ وہ اپنے علاقہ کی اکثر منظر کشی کرتے۔ ناریل، آم اور کیلوں کے پیڑوں کے جھنڈ اور جنگلوں کو یاد کرتے۔ قسم قسم کے خوبصورت پرندوں اور چہچہاہٹ کا ذکر کرتے اور لوگوں کی مروت، محبت اور دوستی کو یاد کرتے۔ ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ اپنے لوگوں اور علاقہ میں جا کر وہیں وفات پائیں۔

ماہتاک ''سنگت''، مارچ 1998

۱۹

کامریڈ نے جو نقشہ مالا بار اور کیرالا کا بیان کیا تھا۔ اس وقت مجھے کرشن چندر کی کتاب ''صبح ہوتی ہے'' کی تصویر کشی یاد آئی۔ یہ کتاب میں نے ایک سال پہلےلٹ خانہ میں پڑھی تھی۔ کرشن نے جو خوبصورت نقشہ اور منظر بیان کیا تھا، بہ عینہہ ابراہیم بیماری کی حالت میں بیان کر رہے تھے۔ بعد میں کراچی میں میں نے جب کامریڈ کے بارے میں پوچھا تو دوستوں نے بتایا کہ ان کی آخری تمنا پوری ہوگئی تھی۔ بیڑی مزدوروں نے انہیں جہاز کے ذریعے مالا بار پہنچادیا تھا۔ اور وہیں پہنچ کر وہ فوت ہوئے تھے۔

کامریڈ ابراہیم کی شخصیت سے میں بے حد متاثر ہوا۔ میں اکثر سوچتا تھا اور اب بھی سوچتا ہوں کہ انسانوں کی تربیت اور شائستگی کس طرح بہتر طریقے سے ہوسکتی ہے۔ ماحول یقیناً ایک ایسا عنصر ہے جو کہ اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتا ہے اور ساتھ ہی فکر اور تربیت بھی مدومعاون ہوتے ہیں۔ کامریڈ ابراہیم زیادہ پڑھے ہوئے نہ تھے۔ وہ میرے خیال میں بقول انگریزی کے محاورہ کے مطابق Three R's سے واقف تھے۔ یعنی لکھنا، پڑھنا اور گنتی۔ اور اپنی

زندگی کی طوالت کے دوران مشق سے اس میں ترقی ہوئی ہوگی۔ ان کی عمر بھی کوئی زیادہ نہ تھی۔ تیس پینتیس سالوں سے زیادہ نہ تھی۔ وہ مزدور اور انتہائی غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ جانے سکول جانے کی نوبت انہیں میسر ہوئی تھی کہ نہیں۔ میں نے ان سے ان کی زندگی کے بارے میں تفصیل سے پوچھا نہ تھا۔ نہ انہوں نے اپنے بارے میں اور ذاتی زندگی کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا تھا۔ اکثر لوگ اپنی ذات اور بڑائی اور کارناموں کو بیان کرتے نہیں تھکتے۔ میں خود اس عیب سے مبرا نہیں۔ نہ کامریڈ ابراہیم کو تمدن اور ثقافت کی آسائشیں میسر ہوئی تھیں۔ وہ کئی سالوں سے بلکہ بچپن ہی سے (کیونکہ ایسے لوگ جب چلنے پھرنے لگتے ہیں تو انہیں یا ان کے والدین کو کمانے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے) محنت کش رہے تھے۔ کامریڈ ابراہیم کے ہاتھ اور انگلیاں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ دن بھر ہمیشہ بیڑیاں بناتے رہے ہیں (میں نے بیڑی ورکرز کو کام کرتے دیکھا ہے)۔

ان تمام ناکامیوں اور محرومیوں کے باوجود کامریڈ ابراہیم نہایت شائستہ، بردبار، روشن خیال اور مہذب انسان تھے۔ وہ تمام آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک انسان تھے۔ نہ ان میں فکری الائش و آلودگی نظر آئی نہ عملی۔ وہ تنگ نظری، تعصب، اور ہر قسم کی نفرتوں، نسلی، لسانی، مذہبی تنگ نظری اور منافرت سے پاک تھے۔ وہ ہمیشہ اوروں بالخصوص محروم انسانوں اور طبقوں کے بارے میں سوچتے تھے اور باتیں کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ انسانی اور سماجی ترقی کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ ان میں کسی قسم کا احساس کمتری یا احساس برتری نظر نہیں آیا مجھے۔ کامریڈ ابراہیم جسمانی اور فکری لحاظ سے ایک مقامی آدمی معلوم ہوئے۔ اگرچہ اس وقت بقول ان کے ایک موذی مرض میں مبتلا ہوئے تھے۔

''نوائے وطن'' کی ادارت سے منسلک ہونے کی وجہ سے اس اخبار میں مصروفیت کے علاوہ اب میری دلچسپی ماہنامہ ''پشتو میں'' بہت ہوئی۔ پشتو زبان وادب سے، ادبی ذوق وشوق کی وجہ سے میں پہلے ہی وابستہ تھا۔ اب اور زیادہ وابستگی بڑھی۔ میں بچپن ہی سے پشتو زبان سے بلد ہوتا چلا آرہا تھا۔ جبکہ میں سات آٹھ سال کا تھا۔ میرے دو سچے دوست سوتگان (ایرانی سرحد پر واقع ایک ملیشیائی پوسٹ) میں رہتے تھے۔ اور ان دولڑکوں عبدالحمید اور عبدالرزاق کے والد میر غزن صاحب

صوبہ سرحد سے ملازمت کی غرض سے مکران ملیشیا میں بطور محرر کے کام کر رہے تھے۔ ان کا تبادلہ پنجگور سے سوتگان ہوا تھا۔ اور جب وہ چھٹی پشاور چلے گئے تو وہاں سے اپنے تینوں بیٹوں کو سوتگان ساتھ لائے۔ تیسرے کا نام عبدالمالک تھا جو عمر میں بہت بڑا تھا۔ اس لیے ان میں سے ہم تینوں علیحدہ رہتے۔ عبدالحمید اور عبدالمالک کو بلوچی بالکل نہیں آتی تھی جبکہ ان کے والد بہت ٹھیک بلوچی بولتے۔ (پنجگور میں رہنے کی وجہ)۔ وہ مجھ سے پشتو میں بات کرتے۔ ان کی رفاقت میں میں نے پشتو بولنا شروع کیا، پشاوری لہجہ میں۔ اس طرح میں نے پشتو سیکھی۔ اور اسے مزید بہتر بولنے کی مشق اس وقت ہوئی جب میں مڈل پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پشین چلا گیا۔ اس طرح میری پشتو بہتر ہوئی۔ اس کے بعد جب میں اور کمال خان ازلی رشتے میں منسلک ہوئے اور پشاور مزید تعلیم کے لیے گئے۔ وہاں چار سال پشتو ہی بولتا رہا۔ تعلیم کے بعد تو میں اور کمال خان ملازمت کے دوران اور پھر ملازمت سے مستعفی ہوکر بھی ساتھ رہے۔ اور خدائیداد بھی ساتھ رہے۔ پشاور میں کالج کی تعلیم کے دوران میری پشتو ادب سے بھی شناسائی ہوئی۔ سب سے پہلے جو کتاب میں نے دیکھی وہ عبداللہ جان اسیر کی تھی۔ اس کا نام تھا ''دوینو جام'' (خون کا جام) اور ''د بیدیا گلونہ'' (صحرا کے پھول۔ عبدالرسول رسا)۔

اس طرح کمال خان میرے پشتو زبان وادب کے اُستاد رہے ہیں۔ اسلامیہ کالج پشاور میں پشتو کی ادبی محفلوں میں بھی کمال خان کے ہمراہ ہوتے۔ مشاعروں میں پشتو کے نامور ادیبوں اور شاعروں سے اس زمانے میں (چالیس کے عشرے میں) واقفیت ہوئی۔ سمندر خان سمندر، محمد اشرف مفتون (جو ہمارے ہم کلاس تھے) ہمزہ شنواری، فضل حق شیدا (جو ان دنوں کالج میں پڑھتے تھے) گویا اب پشتو زبان کے علاوہ پشتو ادب سے بھی میری وابستگی ہوئی۔

کالج سے فراغت کے بعد جب کمال خان کے ہمراہ ان کے علاقہ شین غر اور گاؤں شنہ پونگہ گیا تو وہاں ایسا ماحول ملا جو ٹھیٹ پشتون ماحول تھا۔ جہاں خالص، بقول پشتونوں کے سچے پشتو بولی جاتی تھی۔ کوہ سلیمان کے دامن اور میرے خیال میں بیٹ نکہ کی جائے پیدائش وزیست۔ اس طرح مجھے پشتو زبان، پشتون کلچر اور پشتو ادب سے لگاؤ اور محبت پیدا ہوئی۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ

پشتون عوام سے وابستگی۔ کہنے کا مطلب ہے کہ اب توکٹ خانہ میں ماہنامہ ''پشتو'' نکالنے اور شائع کرنے کا موقع ہمارے لیے خوش بختی تھی۔ خدائیداد نہایت خوبصورتی اور انہماک سے ''پشتو'' کی ادارت میں مگن تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ اپنی بساط کے مطابق ہاتھ بٹاتا۔ پشتو کو بڑے پائے کے مضامین، اور اشعار میسر ہو رہے تھے۔ حبیبی صاحب کے مضامین، خان صمد خان نے جیل کی سلاخوں کے عقب سے ماہنامہ ''پشتو'' کی پذیرائی کی۔ سی آئی ڈی بھی نہایت لگن سے ان تمام سرگرمیوں کا مشاہدہ کرنے لگی۔

ایک روز بعد از دوپہر (سہ پہر) ہمارے پولیس کے دو مہربان دوست دروازے پر نمودار ہوئے اور مجھے اشاروں سے باہر بلایا۔ میں ان کے ہمراہ گیا۔ گلی کی نکڑ میں سڑک سے ہٹ کر ایک جگہ ہم بیٹھ گئے۔

یہ دو مہربان میر عبدالجبار (بعد میں بلوچستان اسمبلی کے اسپیکر) اور مرحوم غلام حسین بگٹی تھے۔

ماہنامہ ''سنگت'' کوئٹہ۔ اپریل 1998

۲۰

انہوں نے بتایا کہ ''پشتو'' کی ڈاک بہت غور سے سینسر ہو رہی ہے۔ ہمیں نہایت ہوشیاری سے اس کا بندوبست کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ پرچہ کو بند کر دیا جائے۔ یہ ان کی محبت، سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کی قدردانی کا جذبہ تھا کہ انہوں نے ہمیں بروقت خطرہ سے آگاہ کیا۔ چنانچہ ''پشتو'' کا ایڈریس بدل دیا گیا۔ اب ہماری ڈاک قریب کی دکان نگار پرویژن سٹور بلوچی اسٹریٹ کوئٹہ کی معرفت ملنے لگی۔ یہ دونوں مہربان پولیس آفیسر سب انسپکٹر پولیس تھے۔ اس کے باوجود سی آئی ڈی اس ردوبدل سے آگاہ ہوئی۔ ہمیں اس کا پتہ یوں چلا کہ ایک دن حسبِ دستور ہم ڈان ہوٹل میں بیٹھے تھے: میں اور خدائیداد۔ ایک اور دوست پولیس آفیسر جو سی آئی ڈی میں تھے، آئے اور ہم سے مل کر ہنستے ہوئے کہنے لگے؛ آپ کی ڈاک اب کسی اور کے نام سے موصول ہو رہی ہے۔ اور بتایا کہ عبدالقیوم کے نام سے اور نگار پرویژن کی معرفت۔ نیز اس نے بتایا کہ ہمیش خلیل کی نظمیں رجسٹری کے ذریعہ آپ کو ملی ہوں گی؟ یہ بات درست تھی۔ ہمیں اسی نام سے ہمیش کی تازہ نظم وصول ہوئی تھی۔ یہ خوبصورت اور نوجوان آفیسر عبدالصادق کاسی تھے۔

میں نے ایک مختصر سا مضمون ''پشتو'' ادب کے عنوان کے تحت پشتو کے لیے لکھا۔ خدائیداد سے اصلاح کر کے پشتو میں چھپوایا۔ پشتو میں تذکیر وتانیث اور رسم الخط (املا) کی غلطیاں ہمارے سے سرزد ہوئیں۔اس کے لیے اصلاح کی ضرورت ہوتی۔ آقائے حبیبی نے میرا مضمون پڑھ لیا تھا اور اس پر میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ یہ خط ماہنامہ ''پشتو'' میں چھپا تھا۔

ایک شمارے کے ٹائٹل کو خود خدائیداد نے تیار کیا۔ اور ایک ٹیکنیک سے۔ یہ ٹائٹل رحمان بابا کا سکیچ تھا۔ بہت خوبصورت ٹائٹل تھا۔ ایک کلر میں۔ رحمان بابا کی شاعری مجھے اسی طرح پسند اور پیاری ہے جس طرح شاہ لطیف، حافظ شیرازی، وارث شاہ (اگرچہ میں ان سے زیادہ بلد نہیں۔ مگر میں نے ہیر گاتے سنا ہے اور اس طرح ان کا عاشق ہوں) اور مست توکلی پسند ہیں۔ رحمان بابا کا یہ سکیچ بالکل رابندر ناتھ ٹیگور کی طرح تھا۔ ٹیگور کا سکیچ اور رحمان بابا کا سکیچ ایک طرح کے ہیں۔

لٹ خانہ میں ہر ایک ساتھی اپنے کام میں مگن رہتا۔ انجم *لیل ونہار* اور روزنامہ *امروز* لاہور کے لیے رپورٹنگ کر کے بھیجتے' آزاد جمالدینی کے اشعار کا بلوچی سے اردو میں ترجمہ کر کے روانہ کرتے یا پھر عین سلام اور رفیق راز کی نظمیں یا غزلیں حاصل کر کے لاہور بھیجتے۔ میں سٹینڈرڈ ہوٹل جا کر گل خان نصیر کے اخبار *نوائے وطن* کے لیے کام کرتا۔ غلام محمد شاہوانی روزنامہ *اتحاد* کے لیے دن بھر کام کرتا۔ ملک پناہ صبح *لٹ خانہ* آکر پھر چاغی ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر روانہ ہو جاتے۔

سید کامل القادری اور سی آئی ڈی آنکھ مچولی میں مصروف تھے۔ کامل صاحب ان کو ڈاج دے کر چھپ جاتے۔ بالآخر سی آئی ڈی کا پلہ بھاری ہوا۔ اور پتہ چلا کہ پولیس والے انہیں کہیں سے سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے سینٹرل جیل مچھ پہنچا چکے تھے۔ ان دنوں سیاسی قیدیوں کو گرفتار کرنے کا نیا قانون بنا تھا؛ ''پاکستان سیفٹی ایکٹ''۔ اس سے پہلے بلوچستان میں انگریزوں کے پرانے کالے قانون فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن F.C.R کے تحت اس قسم کی گرفتاریاں ہوا کرتی تھیں۔ اس پاکستانی نئے قانون میں بلوچستانیوں کے لیے یہ فائدہ تھا کہ سیاسی قیدیوں کو مجرم نہیں سمجھا جاتا بلکہ سیاسی سرگرمیوں سے روکنا مقصد تھا۔ پھر F.C.R کی معیاد تین سال تھی اور سیفٹی ایکٹ چھ ماہ کے لیے ہوتا۔ اس کے بعد اگر حکومت مطمئن نہ ہوتی تو پھر چھ ماہ کے بعد اس میں مزید چھ ماہ کا

اضافہ ہوتا۔ اگر سیاسی شخصیت ناقابلِ برداشت ہوتی تو سلسلہ جاری رہتا۔ مثلاً شہزادہ عبدالکریم خان کے کیس میں یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا۔ F.C.R میں اکثر پہلے قیدی کو مجرم قیدیوں کے ساتھ C کلاس میں رکھا جاتا۔ پھر اگر مرضی ہوتی تو حکومت سے B کلاس حاصل کی جاتی۔ سیفٹی ایکٹ میں اکثر شروع ہی سے B کلاس دی جاتی۔ اس طرح سید کامل القادری کو سیفٹی ایکٹ میں B کلاس میں رکھا گیا۔ باقی پاکستان میں اس نئے ایکٹ کا استعمال بے دریغ کیا جاتا رہا۔ چنانچہ سندھ اور پنجاب میں سیاسی قیدیوں کی گرفتاریاں اکثر اسی ایکٹ کے تحت ہوتی رہتیں۔

چنانچہ ابراہیم جلیس جب اس ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے تو انہوں نے ''سیفٹی ریزر'' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر شائع کروادی۔ جس میں انہوں نے بہت خوبصورت انداز میں پُرمزاح طریقہ سے کراچی کے سیاسی قیدیوں کے سنٹرل جیل کراچی کے حالات لکھ دیے تھے۔ جو بیشتر ترقی پسند ادیب ودانشور تھے۔

لٹ خانہ میں ایک مرتبہ ایک عجیب شخصیت وارد ہوئی۔ جب ہم (میں، کمال خان اور بہادر خان بنگلزئی) اسلامیہ کالج پشاور میں پڑھتے تھے تو ایک روز اچانک ایک شخص ہمارے کمرے میں آیا۔ اسے ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چھوٹے سے قد کا نہایت زیرک آدمی۔ پتہ چلا کہ اس کا نام خدا بخش ہے اور اس کا تعلق ریاست قلات سے ہے۔ اور اس کا وطیرہ ہے کہ ہر سال سردیوں میں وہ ہندوستان کی سیر کو نکلتا ہے۔ اکثر وہاں جاتا ہے جہاں بلوچستان کے طالب علم کسی کالج یا یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ ان کے پاس دو تین روز قیام کر کے پھر کہیں اور نکل پڑتا تھا۔ علی گڑھ، دہلی وہ کئی مرتبہ جا چکا تھا۔ یا پھر وہاں جاتا جہاں بلوچستان کے لوگ روزگار کے لیے گئے ہوں اور رہتے ہوں۔ اس طرح وہ بمبئی، کلکتہ، آگرہ اور کئی جگہوں کی سیر کر چکا تھا۔ کلکتہ اکثر وہ فٹ بالروں کے ہاں مہمان رہا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں بلوچستان کی شہرت فٹ بالروں کی وجہ سے رہی تھی۔ بلوچستان کے کئی نامی گرامی فٹ بالر کلکتہ ممڈن کے کھلاڑی تھے۔ خدا بخش تقریباً تمام سفر ٹرین کے ذریعے مفت کرتا۔

خدا بخش دو یا تین روز میرا اور کمال خان کا مہمان رہا۔ ان دنوں ریاست قلات کے

طالب علم پشاور میں پڑھتے تھے۔ ان میں سے ایک مستنگ کے مشہور فٹبالر اختر شاہوانی تھے، جو ہمارے ہم جماعت تھے۔ خود خدا بخش کا تعلق شاہوانی قبیلہ سے تھا۔ شاید اختر کی وجہ سے وہ ہمارے پاس آیا۔ میں اور کمال خان چونکہ ایک ہاسٹل بلکہ ایک کمرہ میں رہتے تھے۔ اس لیے وہ ہم دونوں کا مہمان رہا۔ ان کی باتیں اور سرگزشت بہت دلچسپ تھی۔ اس لیے ہمیں ان سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ خصوصاً کمال خان ایسے لوگوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ ایک روز کوئٹہ میں کمال خان سے خدا بخش کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ خدا بخش اکثر خدو پان والے کے نام سے مشہور تھے۔ خدو کے ٹھکانے کا کوئی خاص پتہ نہ تھا۔ وہ عام لوگوں میں خصوصاً قلات مستنگ کے ٹرانسپورٹروں اور ڈرائیوروں میں بہت مقبول تھا۔ لہٰذا اکثر انہی لوگوں کے پاس رہتا تھا۔ اس کے روزگار کا بھی عجیب طریقہ تھا۔ گرمیوں میں وہ اکثر کوئٹہ اور قلات میں رہا کرتا۔ اس وقت وہ کوئٹہ میں تھا۔ آج کے میزان چوک، اس وقت سبزی اور گوشت مارکیٹوں میں پان اور ان کے مسالے رکھے ہوتے۔ خریدار خود آ کر پان بنا کر لے جاتے اور پیسے ٹرے میں رکھ دیتے۔ خدو خود کہیں کسی یار دوست کے پاس محوِ گپ شپ ہوتا۔

اسی حالت میں کمال خان کو وہ اچانک ملا تھا۔ اور وہ اسے لٹ خانہ لے آیا۔ اس روز کے بعد وہ اکثر فرصت پا کر لٹ خانہ آتا اور کمال خان سے گپ شپ لڑاتا۔ اس کی ایک تصویر بھی اب تک باقی ہے کہ جس میں وہ کمال خان کے ساتھ لٹ خانہ کے انگور کے پیڑ کے نیچے گپ لڑا رہا ہے۔ لٹ خانہ اور کمال خان کی صحبت کا یہ نتیجہ نکلا کہ خدو (خدا بخش) کو سیاست کا مرض لگ گیا۔ اور وہ بے حد سیاسی بنا۔

خدا بخش کا تعلق عام لوگوں سے تھا۔ اس کی باتوں میں اب مزید لوگ دلچسپی لینے لگے۔ وہ عوامی مسائل اور ان کی مشکلات کے بارے میں بے لاگ تبصرہ کرتا اور حکومت کو برملا حدفِ تنقید بناتا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ خدو سی آئی ڈی کی نظروں میں بڑا مجرم ٹھہرا۔ اور آخر کار F.C.R کے تحت جیل بھیج دیا گیا۔ شاید تین سال پورے کر کے وہ نکلا۔ جیل نے اسے ایک مقصد دیا اور آخر دم تک اس مقصد سے ہٹا نہیں۔ پھر وہ قلات اور خضدار بھی جاتا رہا۔ وہاں بھی خدو پان والا اپنے کاروبار کے علاوہ نئے کاروبار یعنی سیاست میں مگن رہتا۔ خدو کی گرفتاری قلات میں عمل میں آئی تھی۔ اب

تک قلات کے لوگوں اور اس دور کی سیاست میں دلچسپی رکھنے والے خدو کو یاد کرتے ہیں۔ خدا بخش بالکل اَن پڑھ تھا۔ خدا بخش کا انتقال خضدار میں ہوا تھا۔

ماہتاک ''سنگت'' کوئٹہ۔ مئی 1998

۲۱

اسی سال دوستوں نے ایک نئے ہفت روزہ ''چلتن'' کو شائع کرنا شروع کیا۔ یہ پرچہ مستنگ سے شائع ہوا کرتا تھا۔ لٹ خانہ کے دوستوں کا ایک نوجوان ہندو سے رابطہ تھا۔ یہ تعلق جیکب آباد کے ہندو کامریڈوں کے توسط سے پیدا ہوا تھا۔ نوجوان کا نام تھا گربخش لال کالڑا۔ ان کا تعلق لہڑی کے علاقہ سے تھا جو سبی اور ڈیرہ بگٹی کے مابین ایک قصبہ ہے۔

گربخش لال کے پاس ملک محمد پناہ، انجم قزلباش، خدائیداد اور میرا آنا جانا ہوتا۔ انہیں ہماری صحبت بہت دلکش معلوم ہوئی۔ انہی دنوں ایک اور پنجابی نوجوان سے بھی ہم سب کی دوستی ہوئی تھی۔ ان کا نام تھا زمرد حسین۔ نہ جانے ان سے کس طرح رابطہ ہوا۔ گربخش لال اور زمرد حسین اکثر لٹ خانہ آتے رہتے۔ زمرد حسین کا گھر مستنگ میں تھا۔ میرے خیال میں انجم قزلباش کے مشورے سے گربخش لال نے ہفت روزہ ''چلتن'' کی اشاعت کی منظوری حاصل کی۔ چونکہ وہ خود ریاست قلات کا باشندہ تھا۔ اس لیے منظوری ریاست قلات سے لینی پڑی اور جائے اشاعت مستنگ ریاست قلات قرار پایا۔ ''چلتن'' کے ایڈیٹر انجم قزلباش اور زمرد حسین تھے۔ انجم قزلباش کی

شہرت بطور صحافی کے کافی ہو چکی تھی۔ اخبار کی پالیسی وہی تھی جو میاں افتخار الدین کے پروگریسو پیپرز کی تھی۔ سوشلسٹ بلاک کی حمایت، امریکی بلاک اور امپیریلزم کی مخالفت، مظلوم عوام کی حمایت اور مظلوم قوموں اور عوام کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا۔ انجم قزلباش کی تحریر میں کشش اور زور تھا۔ زمرد حسین نے ان سے بہت شہرت حاصل کی، خصوصاً ریاست قلات میں۔ اس تمام جدوجہد کا حاصل یہ ہوا کہ پہلے انجم قزلباش سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے، مچھ جیل پہنچائے گئے اور چھ ماہ کے لیے نظر بند ہو گئے۔ زمرد حسین پرچہ شائع کرتے رہے تا آنکہ وہ بھی سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور مچھ جیل میں نظر بند ہو گئے۔

جی میں آیا کہ لٹ خانہ کی نظروں سے اوجھل، خاموش اور ایک لحاظ سے ''گمنام سپاہی'' ڈاکٹر خدائیداد کے بارے میں ذرا تفصیل سے قلم چلاؤں۔ میرے خیال میں وہ لٹ خانہ کی اہم اول اور آخری شخصیت ہیں۔ جب لٹ خانہ کی زندگی کی ابتدا ہوئی تو خدائیداد نے بغیر کسی چوں وچرا کے اس میں ڈیرہ ڈال دیا، بغیر کسی غوغا کے ملازمت چھوڑ دی، نہ کسی کو پریشان کیا نہ خود پریشان ہوا، نہ کسی کو مورد الزام ٹھہرایا نہ کسی نے الزام دیا۔ خدائیداد جیسا کہ شروع میں بیان ہوا تھا، سکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد آرمی کے سگنل شعبہ میں بھرتی ہوئے تھے۔ دوسری عالمی جنگ تھی۔ وہ آرمی کے اسی شعبہ میں ملازم تھے۔ اس دوران انہوں نے برصغیر میں اس وقت کے ہندوستان کے مختلف جگہوں کی سیر کی۔ مختلف انسانوں، زبانوں، مذاہب، نسلوں اور تہذیبوں کو دیکھا اور جائزہ لیا۔ اس دوران مختلف ہنر سیکھے اور مختلف الخیال انسانوں سے سابقہ ہوا۔ وہ جنگ کے آخری ایام میں ایران بھی گئے اور ایران کے مختلف علاقوں کو دیکھا۔

جب جنگ کا اختتام ہوا اور فوجوں کی چھٹی کر دی گئی تو ان کو میرے خیال میں ایم ای ایس کے ملٹری اکاؤنٹ میں کھپایا گیا۔ وہ آخر تک اسی میں رہے اور یہیں سے ملازمت چھوڑ دی۔ ان کا دفتر جنرل پوسٹ آفس کے عقب میں ہوا کرتا تھا۔ میں اور کمال خان اُن سے ملنے وہاں جایا کرتے تھے۔ میرے خیال میں وہ اپنے سکول کے ساتھیوں کے ساتھ پیر ابوالخیر سٹریٹ میں کسی مکان میں رہتے تھے۔ سردار خیر و ترین مجھے یاد ہے کہ ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ اُن

سے ملنے کے لیے ہم وہاں گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی زندگی اور فیملی بیک گراؤنڈ سے واقفیت کم ہے کیونکہ وہ اپنی ذات اوران مسئلوں کے بارے میں کبھی نہیں بولتے۔ وہ ان آلودگیوں سے پاک وصاف ہیں۔ وہ ایک انسان ہیں۔ اور یہی ان کا بڑا اوصف ہے۔ اور اسی وصف سے ان کا رابطہ اور رشتہ دوسرے انسانوں سے جڑتا رہا ہے۔

ایک مرتبہ اتنا معلوم ہوا کہ وہ پشتونوں کے گنڈا پور قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اوران کے اجداد عام پشتونوں کی طرح محنت طلب پیشہ اور ہنرمند رہے ہیں۔ اور تلاش روزگار میں عام انسانوں کی طرح نقل مکانی کرتے کرتے گلستان پہنچے تھے۔ اور یہیں ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ ہنرمندی، محنت ومشقت کرتے رہے۔ گلستان کے خوانین اور بالخصوص خان عبدالصمد خان کے خاندان سے ان کی فیملی کی محبت اور دوستی رہی ہے۔ وہ ان کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔ اور اکثر لٹ خانہ ان سے ملنے آتے۔ خود عبدالصمد خان کے بیٹے احمد خان، جعفر خان، ان کے بھائی، معصوم خان ہمیشہ لٹ خانہ آتے۔ خود لٹ خانہ کا نام ان کے اور ہم سب کے بہت پیارے دوست غنی خان اچکزئی کی وجہ سے پڑ گیا۔ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ فی الحال اسٹیشنری میں دو خوبصورت بچیاں خدائیداد سے ملنے آئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں بہت پیار دیا۔ جب وہ چلی گئیں۔ تو میں نے پوچھا کہ یہ بچیاں کون تھیں؟ تو انہوں نے نہایت محبت اور احترام سے مرحوم اسلم اچکزئی کا نام لیا اور بتایا کہ ان کی بچیاں تھیں۔ اب مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ ان کے علاوہ انہوں نے اسلم اچکزئی کے علاوہ ان کے بھائی اعظم جان کا بھی نام لیا یا نہیں۔ اس فیملی کی وابستگی اب تک ڈاکٹر صاحب سے ہے۔ صمد خان کے بھانجے خان نیاز خان اب بھی جب بھی گلستان سے آتے ہیں۔ ڈاکٹر خدائیداد صاحب سے ملنے ان کے ٹھکانے جاتے ہیں۔

ماہنامہ ''سنگت'' کوئٹہ۔ جون 1998

۲۲

خدائیداد صاحب کے بڑے بھائی مولا داد لالا کبھی کبھار لٹ خانہ، بھائی سے ملنے گلستان سے آتے۔ ان سے ہم سب کی ملاقات ہوتی۔ نہایت ہی سلجھے ہوئے شائستہ انسان تھے۔ شاید انہی کی توجہ اور دلچسپی کا کرشمہ تھا کہ خدائیداد نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ یہ ان کے محنت اور کمال کا نتیجہ تھا کہ اس طرح کے ذہین اور قابل انسان نے پرورش پائی۔ خدائیداد صاحب کے ایک اور بھائی خدائے رحیم بھی آیا کرتے۔ ایک مرتبہ یاد ہے کہ خدائے رحیم بھائی سے مشورہ کرنے لٹ خانہ آئے تھے۔ بے روزگاری اور غربت نے اس نوجوان کو تلاشِ روزگار کے لیے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اپنے لکھے پڑھے اور بڑے بھائی خدائیداد سے مشورہ کے لیے آئے تھے۔ بہت وقت مشورہ سوچ بچار کے بعد خدائے رحیم عازمِ سندھ ہوئے۔

خود خدائیداد کو میں نے کبھی بھی بے روزگار نہیں دیکھا۔ سرکاری ملازمت چھوڑنے کے باوجود خدائیداد کو پرائیویٹ کام حاصل کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ ایک لحاظ سے وہ اکیلے لٹ خانہ کی مستقل آمدنی کا باعث تھے۔ وہ اکاؤنٹ کے کام کا خوب تجربہ رکھتے تھے۔ بہت عرصہ سورج گنج

بازار میں اخباروں اور کتابوں کی مشہور دوکان ''نیو بک سٹال'' میں انہیں اکاؤنٹ کا کام ملا۔اس فرم کے مالک دو بھائی حاجی عبدالصمد اور حاجی عبدالواحد تھے۔ ہم خدائیداد سے جب بھی وہاں ملنے جاتے تو انہیں بہی کھاتوں میں منہمک اور مصروف پاتے۔ یہیں ہمارے دوست، چچا عبدالحق سے ہماری ملاقات ہوئی۔ان کا تعلق قبیلہ بابئ سے تھا۔ چچا عبدالحق سوراب ضلع قلات کے بابئ تھے۔ حاجی برادران، عبدالحق جو اس وقت طالب علم تھے اور بی اے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، کی مدد کرتے تھے۔

نہ جانے خدائیداد مشن ہسپتال کے عیسائی ڈاکٹروں سے کیسے شناسا ہوئے تھے۔ان سے ان کی اتنی دوستی ہوگئی تھی کہ وہ انہیں اپنوں میں سے ایک سمجھتے تھے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی بہت عزت اور احترام کرتے۔ انہوں نے پشتو سیکھنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو اپنا اُستاد رکھا۔ ڈاکٹر صاحب پشتو کے تو تھے ہی اُستاذ انگریزی بھی ان کی بہت ہی نفیس اور رواں تھی۔ خدائیداد روزانہ انہیں پڑھانے جاتے۔ان میں امریکی، یورپی اور ہندی ڈاکٹر تھے۔ایک مرہٹی خاتون تھیں۔ جو سفید ساڑھی میں بہت بھلی لگتی تھیں۔نہایت حسین دلنواز اور مہربان خاتون تھیں۔ڈاکٹر صاحب سے ان کی بہت دوستی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نہایت ہی اچھے ترجمہ نگار ہیں۔ پشتو، انگریزی اور اُردو کو بہت آسانی اور عام فہم الفاظ میں ایک دوسرے میں منتقل کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اچھے اور بہت قابل ٹیوٹر بھی تھے۔ وہ ٹیوشن کا کام بھی کرتے تھے۔ان کے شاگردان پر فریفتہ ہوتے۔ وہ مخصوص مضامین جو انگریزی، حساب، سائنس اور اُردو ہوتے، انہیں پڑھانے کے علاوہ شاگردوں کی ذہنی اور فکری تربیت کرتے۔ان کے شاگرد علم اور سائنس سے گہری دلچسپی لیتے۔

ایک روز لٹ خانہ میں شہزادہ عبدالکریم خان کے بیٹوں کا نوکر علی خان آیا اور مجھے کہا کہ شہزادہ صاحب کے بیٹوں کے لیے ایک اچھا ٹیوٹر چاہیے۔علی خان کا چچا زاد بھائی محمد امین جو شہزادہ کے سُسر جام میر خان کے گھر کام کرتے تھے، ان کی وجہ سے وہ ہمیشہ لٹ خانہ آیا کرتا تھا۔ان سب کو لٹ خانہ سے عقیدت ہوگئی تھی۔ میں نے فوراً خدائیداد صاحب سے کہا۔ وہ راضی ہوئے۔اور ہم

آغا صاحب عبدالکریم خان کے بیٹے آغا عبداللہ جان احمد زئی کے پاس ان کے نوکر کے ہمراہ ان کے مکان گئے۔ان دنوں انہوں نے (لٹ خانہ سے زیادہ دور نہیں) عین الدین سٹریٹ پر مکان کرایہ پر لے رکھا تھا، وہاں پہنچے۔آغا عبداللہ جان ان کے چھوٹے بھائی آغا سلمان جان اور ان کے ماموں نواب شاہوانی کے چھوٹے بیٹے عبدالغفار سے ملے۔اور معاملہ طے ہوگیا۔

اس کے بعد آغا عبداللہ جان اور ان کے بھائی اور ماموں کا ڈاکٹر خدائیداد سے ایسا تعلق ہوا کہ عبداللہ جان جب تک حیات تھے، ڈاکٹر صاحب کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔عبداللہ جان کی فکری کائنات ہی ڈاکٹر خدائیداد نے بدل دی۔نہایت ہی خلیق، انسان دوست اور فہمیدہ نوجوان تھے۔ڈاکٹر سے تو پیار کرتے تھے۔لٹ خانہ آتے جاتے، اور مطالعہ کے لیے کتابیں لے جاتے۔ نیز مشورہ کر کے خریدتے۔ وہ ایک بہت اچھے وکیل بنے لیکن بدقسمتی سے کینسر کی وجہ سے عالم جوانی اور اُبھرتی ہوئی زندگی میں فوت ہوگئے۔

انہی ایام میں کراچی سے ایک نوجوان لٹ خانہ پہنچے تھے۔ان کا نام کامریڈ خدا بخش مینگل تھا۔وہ کافی عرصہ سے کراچی میں مقیم تھے۔ان کا تعلق وڈھ کے شاہی زئی مینگلوں سے تھا۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عطا اللہ خان مینگل کے قریبی رشتہ داروں میں سے ہیں۔ خدا بخش صاحب چھٹی پر آئے تھے۔ وہ ریڈیو پاکستان کراچی میں شعبہ بلوچی کے اناؤنسر تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بلوچی پروگرام کے پہلے اناؤنسر تھے۔یعنی تاریخ میں پہلی مرتبہ کراچی سے بلوچی زبان میں پروگرام نشر ہونا شروع ہوا تھا۔شاید 1952 میں، اور اس زبان میں جو آواز فضا میں گونجی تھی وہ خدا بخش مینگل صاحب کی تھی۔ وہ کراچی میں پروگریسو ادیبوں اور دانشوروں میں اُٹھتے بیٹھتے تھے۔کئی نامی گرامی اُردو اور سندھی کے پروگریسو ادیبوں سے واقف تھے۔ جناب قادر بخش نظامانی کا نام بہت لیا کرتے۔ بعد میں جب میں کراچی گیا تو نظامانی صاحب کے گھر میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ان کو ادب کے علاوہ آرٹ اور فلمی دنیا سے لگاؤ تھا۔ وہ ان شعبوں سے بہت باخبر تھے۔کافی ذہین اور باشعور نوجوان تھے۔

اُن دنوں پرنس روڈ کے راحت سینما میں مشہور ہندوستانی فلم ''ہم لوگ'' لگی تھی۔اس فلم

کے ہیرو بلراج ساہنی پروگریسو تھے۔انڈین کمیونسٹ پارٹی سے ان کا تعلق تھا۔فلم بہت اچھی تھی۔
نوتن اور بلراج ساہنی اس میں کام کرتے تھے۔گانے بھی بہت مشہور ہیں۔ہم لٹ خانہ والوں نے باجماعت اسے تین مرتبہ دیکھا۔میں نے، انجم قزلباش اور خدائیداد اور آس پاس کے دوست مزدور جوانوں کو بھی ہمراہ کیا۔تاکہ اس فلم سے انہیں طبقاتی شعور آئے۔ یہ ہمارا خیال تھا۔ جب کبھی ہمارے پاس رقم ہوتی تو اچھی فلمیں ضرور دیکھا کرتے۔ اکثر اسی راحت سینما میں فلم ''بازی''، ''کاسی تھٹا''، ''محل''، ''شبنم'' نجانے کئی اور بہت مشہور اور اچھی فلمیں دیکھیں۔ساتھ مل کر جب دیکھتے تو بڑا مزہ آتا۔اکثر سستے بنچوں پر بیٹھتے اور خوش ہوتے کہ ہم عوام کے ساتھ ہیں۔

ایک مرتبہ نہایت کڑاکے کی سردی میں طوغی روڈ پر واقعہ پریم سینما جواب کسی اور نام سے مشہور ہے، میں ''ندیا کے پار'' فلم لگی تھی۔ میں، انجم، خدائیداد اور ملک پناہ آخری شو دیکھنے چلے گئے تھے۔واپسی پر لٹ خانہ پہنچے، سردی سے برا حال ہوا تھا۔فلم ''آگ'' بھی اسی سینما میں مل کر دیکھی تھی۔خدائیداد خود فنکار اور آرٹسٹ ہیں۔انہیں دنیا کی تمام خوبصورت چیزیں پسند ہیں۔حسن پرستی میں اپنا ہم پلہ کم رکھتے ہیں۔مدھوبالا اور کامنی کوشل ان کو بہت پسند تھیں۔ان کی فلمیں ناغہ کرنا گناہ سمجھتے تھے۔

خدابخش صاحب کچھ دن لٹ خانہ میں رہ کر واپس کراچی چلے گئے۔کراچی میں ان سے بہت ملاقاتیں ہوتیں رہیں۔انجم اور خدائیداد جب بھی کراچی آتے، وہ بھی ان سے ملتے۔ بدقسمتی سے خدابخش صاحب بڑھاپے میں اپنے گاؤں وڈھ میں بیماری کی حالت میں کسمپرسی کے عالم میں وقت گذار رہے ہیں۔وہ بھی میری طرح مفلوج ہوگئے ہیں۔فالج نے انہیں بھی ناکارہ کردیا ہے۔

خدائیداد صاحب کی محبت اور دوستی بھی نرالی ہے۔وہ کسی مخصوص گروہ اور قبیلہ سے اپنی دوستی کو پابند نہیں کرتے۔ان کی دوستی کے اس زمرے میں مختلف اور دلچسپ اور پیارے انسان شامل رہے ہیں۔ان سے خدائیداد کی بے تکلفی اور ناز و انداز بہت ہی پیارے اور دلچسپ لگتے۔چونکہ میں اکثر ان کے ہمراہ ہوتا، میں نے اُن کی اِس خصوصیت کو غور سے دیکھا ہے۔حکیم سراج محمد خان ماہر نفسیات کا مطب جناح روڈ پہ موجود بانو روڈ اور جناح روڈ کے ملاپ کے ایک کونے پہ تھا۔آج کل یہاں میرے

خیال میں کسی صاحب نے ٹویو کا بچوں کے لیے بازی گھر Play land بنایا ہے۔حکیم صاحب کے دونوں بیٹے معراج محمد خان (بڑے) اور منہاج محمد خان (منجھلے) پاکستان کے مشہور صحافی اور دانشور ترقی پسند منہاج برنا ان کے دوست تھے۔نہ جانے سراج صاحب حیات ہیں کہ نہیں۔معراج محمد خان اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ جناح روڈ سے اچانک خدائیداد ہمیں حکیم صاحب کے مطب میں لے گئے۔ وہاں سراج محمد خان جن کا اپنا ایک عجیب انداز گفتگو اور میل ملاپ تھا۔کھڑے کھڑے باتیں ہوتیں۔سامنے مرتبانوں میں قسم قسم کے لذیز خوشبودار معجون اور مربے ہوتے۔ خدائیداد صاحب بڑے مزے لیے ڈھکنا اٹھا کر کھانا شروع ہوتے اور مجھے بھی ایسا کرنے کے لیے اشارہ کرتے۔ایسا لگتا تھا کہ یہ عمل ان کے لیے اور سراج صاحب کے لیے معمول کا تھا۔نہ کوئی تکلف اور نہ ہی کوئی ہچکچاہٹ۔سب کچھ نیچرل تھا۔میرے لیے یہ سب کچھ انتہائی غیر معمولی تھا۔

اسی طرح لیاقت بازار کے عین وسط میں لیاقت بازار اور آرچر روڈ کے کراسنگ پر کونے پر مرکز صحت ادویات کی بہت بڑی دوکان واقع تھی۔ان کے مالک بھی ایک ہندوستانی دوست تھے۔ بہت پیارے، نام مجھے اب یاد نہیں۔شام کو لٹ خانہ جاتے ہوئے وہاں سے گزر ہوتا تو خدائیداد وہاں ٹھہر جاتے۔خدائیداد مذاق میں اسے مرکز صحت کی بجائے 'مرکر صحت' کہتے۔ان سے بھی اسی انداز میں گفتگو اور بے تکلفی۔لگتا تھا کہ یہ دوکان اور اس میں سب کچھ خدائیداد کا اپنا تھا۔

اسی طرح کا ڈاکٹر صاحب کا ایک نہایت ہی پروقار اور محبوب دوست ایک ہزارہ تھا۔ان کی وجہ سے وہ ہمارے بھی مہربان ساتھی ہوئے۔ان کا نام بھی اب میں بدقسمتی سے بھول چکا ہوں۔وہ منکوں اور قیمتی پتھروں کا کام کرتے تھے۔ان کا اپنا ایک چھوٹا لکڑی کا بکسا ہوا کرتا تھا۔جس میں قسم قسم کے اور رنگ رنگ کے قیمتی نگینے قطار میں سجے ہوئے ہوتے۔کبھی یہ صاحب قندھاری بازار کے فٹ پاتھ پہ بیٹھے ہوئے ملتے۔کبھی جناح روڈ کے آخر میں حبیب نالہ کے پاس۔ان کے پاس بیٹھے یا کھڑے کھڑے خدائیداد صاحب ان سے ہزارگی فارسی میں باتیں کرتے۔ نہایت پیار اور لاڈ سے۔بہت مزہ آتا یہ سب کچھ دیکھ کر۔

ماہنامہ ''سنگت'' کوئٹہ۔جولائی 1998

۲۳

1953 میں ہماری زندگی میں اہم واقعہ ہمارے فکری اختلافات کا ہے۔لٹ خانہ جدیدیت کا گڑھ سمجھا جارہا تھا۔(اُس وقت) ہمارے بزرگ دوست اور ساتھی یا ہم خیال اپنی پرانی سیاسی جدوجہد کا سلسلہ چلانا چاہتے تھے۔ہم سوشلزم اور ترقی پسند فکر سے تازہ تازہ متاثر ہوئے تھے۔ ہمارے بزرگ نہ جدیدیت کے خلاف تھے نہ سوشلزم کے خدانخواستہ دشمن۔جناب بزنجو صاحب تو ہم سے کئی برس پہلے قادر بخش نظامانی کے توسط سے کراچی میں کمیونسٹ پارٹی (تقسیم سے پہلے کے زمانے سے) سے وابستہ رہے تھے۔ان کی وجہ سے گل خان نصیر جو بزنجو صاحب کے سیاسی ہم خیال اور دیرینہ رفیق ہونے کے علاوہ ادیب اور شاعر تھے۔اور اب تک اردو میں شاعری کرتے چلے آئے تھے۔ وہ ترقی پسند ادب اور ادیبوں سے بہت متاثر تھے۔اب ان کے کہنے پر ہم یعنی لٹ خانہ کے ساتھی؛ میں، ملک پناہ، انجم قزلباش، غلام محمد شاہوانی، بہادر خان بنگلزئی، ان کی روز بروز کے خان قلات اور ان کی پالیسی کی طرف جھکاؤ کے ناقد اور معترض بنتے جارہے تھے۔اس طرح غلام محمد سے متاثر بلوچ طلبا اور دانشور مثلاً امان اللہ گچکی اور ان کے ہم خیال بھی ہمارے ہم خیال اور

ہمارے بزرگ سیاستدانوں کی پالیسی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ رہے تھے۔اب یہاں مرزا غالبؔ کے یہ فارسی اشعار میرے اس خیال کی شاید بہتر وضاحت کرسکیں؛

بامن میاویز اے پدر ! آئین آزر رانگر
آنکس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد

ترجمہ:

اے ابو! مجھ سے مت الجھ، آزر کے آئین کی طرف نگاہ کر
جو شخص صاحبِ نظر ہوا، اس نے بزرگوں کے دین سے روگردانی کی

اب نہ جانے ہم صاحبِ نظر تھے یا کہ نہیں۔ بہرکیف ہمیں جدیدیت کی ہوا لگی تھی اور ہماری سوچ کا طریقہ مختلف ہورہا تھا۔ ہمارے بزرگ سوچ رہے تھے اور یہ خیال کئی سالوں سے چلا آرہا تھا کہ بلوچستان ایک آزاد مملکت رہا ہے اور اس کی وابستگی انگریز استعمار سے زور کے بل بوتے اور چند ایک معاہدوں کے ذریعہ جن پر انگریز اپنی قوت اور طاقت کی وجہ سے خوانین قلات کو مجبور کر کے دستخط کرواچکے تھے۔اب جبکہ وہ برصغیر کو مجبوراً چھوڑ کر چلے گئے تھے تو تقسیم کے بعد جس حصے میں بلوچ آبادی تھی اور خصوصاً ریاست میں بسنے والے بلوچ جو خان قلات کی رعایا تھی، پاکستان میں شمولیت کم از کم اب مشروط اور ان کی مرضی کے مطابق ہو۔لیکن خدا غارت کرے طاقت اور قوت کی ریاستی پالیسی کو، یہ کہاں انصاف کو پنپنے دیتی ہے۔سیاست میں تو ویسے بھی اس طرح کی بے ایمانی اور دھوکہ جائز ہے کہ لوگوں کے جمہوری حقوق ہتھیا لیے جائیں۔ویسے کہتے ہیں کہ قانون قدرت ہے کہ زندہ وہی رہ سکتا ہے جس میں زندہ رہنے کی سکت اور قوت ہے۔پھر یہ بات کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔انسانی اقدار اس وقت کچھ کام نہیں دیتے۔

ریاست قلات ایک ریاستی نظام تھا۔اس کی کل سالانہ آمدنی چند لاکھوں میں تھی۔ جو لوگوں سے بٹورا جاتا تھا، اسے آج کے پاکستان کی طرح کرپٹ افسران اعلیٰ جیب میں ڈالتے تھے۔اپنی جائیداد اور دولت میں اضافہ کرتے تھے۔ کہتے ہیں پاکستان بننے سے پہلے بٹوارے کے دوران خان قلات نے اپنی اسلام دوستی کا سہارا لے کر مسلم لیگ کے قائد محمد علی جناح کو جو اس وقت

قائداعظم کے نام سے مشہور نہیں ہوئے تھے، ان کو ان کی ہمشیرہ محترم فاطمہ جناح کے ہمراہ مہینہ ڈیڑھ قلات میں اپنے محل میں مہمان ٹھہرایا۔ اور مسلم لیگ اور ان کی تحریک کی ہر طرح سے حمایت کا اظہار کیا۔ کہتے ہیں کہ خان قلات جو اس وقت احمد یار خان تھے، نے انہیں چاندی میں تولا اور یہ چاندی ان کی تحریک کے لیے دی۔ ویسے یہ بات میں نے امریکی رسالہ میں بھی پڑھی ہے۔ ایک خاتون صحافی نے قلات کا دورہ چند سال پہلے کیا تھا۔ اس چشم دید واقعہ کا ذکر خان کے ایک مصاحب نے اس خاتون صحافی سے کیا۔

انگریزوں نے اپنے اس وقت کے وائسرائے کے توسط سے برصغیر کو تقسیم کرنے اور اپنے دست نگر بنانے کی غرض سے خان قلات کو یہ پیشکش تھی کی تھی کہ اگر وہ Trucial ریاست کی صورت میں رہنا چاہئیں تو انگریزوں کے تحفظ میں وہ رہ سکتے ہیں۔ شاہ اردن کی طرح اس کی ریاست کو ترقی دی جائے گی۔ کہتے ہیں کہ ان سابقہ ریاستی معاہدوں کی روشنی میں آل انڈیا ریڈیو سے گیارہ اگست کو قلات کی آزادی کا اعلان بھی کیا گیا۔ مگر خان قلات نے کچھ لوگوں کی رائے میں، انگریزوں کی یہ تجویز رد کردی اور اپنے قائداعظم محمد علی جناح سے سابقہ گفت وشنید کی روشنی میں اور اسلام دوستی کے جذبہ کے تحت محمد علی جناح اور ان کی تحریک کا ساتھ دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نتیجہ یہ نکلا کہ خان کے بھائی آغا عبدالکریم نے جو مکران کے گورنر تھے، مکران کو علیحدہ ریاست بنانے کے خلاف احتجاج کیا۔ افغان بارڈر پر کیمپ بنایا اور لشکر اکٹھا کرنا شروع کیا۔ بعد میں خان کے ذریعہ انہیں بلایا گیا۔ گفت وشنید کی بجائے گرفتار کر کے بیس سال کے لیے پس دیوار زندان قید کیا گیا؛ ان کے رفقا کے ساتھ۔ بعد میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خان قلات پر بھی صدر سکندر مرزا کے دور حکومت میں قلات پر حملہ کیا گیا۔ اسی شاہی محل سے جس میں راویوں کے قول کے مطابق قائداعظم اور ان کی محترمہ ہمشیرہ کو کافی عرصہ کے لیے مہمان رکھا گیا تھا اور چاندی میں تولنے والی بات ہوئی تھی۔ (خان معظم جنہیں بعد میں یہ لقب پاکستان حکومت نے عنایت کیا تھا، کیونکہ قلات کی چار ریاستوں مکران، خاران، لس بیلہ اور قلات کو سٹیٹ یونین کی شکل دے کر انہیں ان سب ریاستوں کا برائے نام سربراہ بنایا گیا تھا) کو اسی محل سے گرفتار کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ محل پر

بمباری سے محل کے سامنے خان قلات کی مسجد کا کنارہ بھی شہید ہوا تھا۔ اور اس واقعہ میں کئی لوگ مارے گئے۔ یہ تمام کام سکندر مرزا صاحب نئے بنے ہوئے جمہوری پاکستان میں کیا، جو بنتے ہی بڑی تیزی سے ترقی اور جمہوریت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جمہوری ادارے، مزدور تحریک، ترقی پسند فکر، امریکہ دشمنی اور استحصال اور سامراج دشمنی سے بچانے کے لیے قلات کے کھیل نے مارشل لا کا جواز فوج کے ساتھ مل کر فراہم کیا۔ سکندر مرزا بدبخت کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ چاہ کن را چاہ درپیش، اے بہ یک بینی و دو گوش۔ کوئٹہ ہی کے راستے ملک بدر کردیا گیا۔ فوج اور جنرل ایوب خان نے عنانِ حکومت سنبھال لی۔ قائداعظم کے جمہوری ارادوں پر بھی پانی پھر گیا۔ یہ قصہ انتہائی طویل ہے۔ اس پر بہت کچھ پاکستان میں لکھا گیا ہے۔ میں اس میں اپنی کم علمی کے باعث کوئی خاص اضافہ نہیں کرسکتا۔

گل خان نصیر اس وقت *نوائے وطن* کے مدیر اعلیٰ تھے اور میں ان کا معاون مدیر ادنیٰ، اخبار کا ڈیکلریشن غلام محمد شاہوانی نے حاصل کیا تھا۔ خان صاحب کے ذہن میں ابھی تک حکمرانی کے کیڑے رینگ رہے تھے۔ انہوں نے گل خان جیسے نڈر اور باکمال مدیر کو اخبار چلاتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر ان کے لنگوٹیا میر غوث بخش بزنجو کی ہر بات کو گل خان آمنا وصدقنا کہتا تھا۔ خان نے اخبار کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہا۔ قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی کے زمانے سے خان قلات اپنے کو پکا قوم پرست ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب تک ان پر انگریزوں کا دباؤ نہ تھا، قلات کے ریاستی نظام میں اصلاحات بھی کرتے رہے۔ تعلیم کے شعبہ میں مالیات کے شعبہ میں انہوں نے ناجائز ٹیکسوں کو ختم کیا۔ طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف اور مدد، محکمہ تعلیم میں دیگر اہم عہدوں پر ریاست بلوچستان کے دیگر اضلاع سے اعلیٰ تعلیم یافتہ قابل اور سیاسی فکر رکھنے والی شخصیتوں کو بلا کر اہم عہدوں پر فائز کیا۔ ان کے ذہن میں بہت منصوبے تھے۔ مگر انگریزوں کا دباؤ برداشت نہ کرتے ہوئے انہوں نے ان سب شخصیتوں کو خود عہدوں سے علیحدہ کردیا اور قلات اسٹیٹ نیشنل پارٹی پہ سرداروں کے ذریعے حملہ کروایا اور پارٹی کے لیڈروں کو ریاست بدر کردیا۔

گل خان نصیر اور میر بزنجو جو خان کے قریبی دوست رہ چکے تھے، اور ان کی فکری تلون

اور تردید سے باخبر رہتے ہوئے ان کے کہنے میں آ گئے۔ پھر ان کا ساتھ دینا شروع کیا۔ اخبار کی پالیسی جو بہت ٹھیک طرح سے چل رہی تھی، اسے خان کے مفاد میں بدل دیا گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے قریبی دوستوں سے بھی یہ تمام باتیں چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک دن معلوم ہوا کہ میر بزنجو اور گل خان نصیر ہمیں بتائے بغیر کراچی خان صاحب کے بلوانے پہ چلے گئے۔ اور وہاں سے ایک کتابچہ (پمفلٹ) چھاپا ''ریاست قلات کا قضیہ مسئلہ کشمیر کی روشنی میں'' ٹھیک نام یاد نہیں۔ ہمیں جب اس کا پتہ چلا، ہم تو تھے نئے نئے انقلابی، نظام کو بدل دینے والے۔ سیخ پا ہو گئے۔ ان کا انتظار کیے بغیر اور ان کی بات سنے بغیر شدت سے ان پر تنقید کرنے لگے اور ان کے مخالف بن گئے۔

ماہنامہ ''سنگت'' کوئٹہ۔ اگست 1998

۲۴

ہمارے محترم اور بزرگ دوستوں کے اس عمل کا انتہائی شدید ردِعمل ہوا۔ کاش وہ ہمیں اعتماد میں لے کر ایسا کرتے۔ یا ہم اس عمل کی وجوہات معلوم کر کے معاملہ کو سمجھ کر پھر عمل کرتے۔ ہم نوجوان تھے۔ تجربہ ہمیں نہ تھا بلکہ ابھی اس پروسیس سے گزرنا شروع ہوئے تھے۔ انہیں بھی شاید زیادہ تجربہ نہ تھا۔ ہم نے ذہنی طور پر قبول نہ کرتے ہوئے ان کے سمجھانے پر مسلم لیگ کی صورت میں کام کرنے کو تسلیم کر لیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس تمام حکمتِ عملی میں پسِ پشت خان صاحب احمد یار خان کی منصوبہ بندی تھی۔ ہم ڈھاڈر میں یہاں سے جلسے کے لیے خیمے قرض کر کے لے گئے تھے۔ لیکن جیسے کہ خان احمد یار خان کی عادت تھی اور مزاج، عین وقت پر ہاتھ کھینچ لیتے۔ معلوم بھی نہ ہوتا کہ ایسا وہ کیوں کرتے ہیں۔ تمام خیمے جلسے کے بعد سمیٹ لیے تھے۔ بسترے باندھ لیے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میر غوث بخش بزنجو اور گل خان نصیر صاحب افسردہ، ان بندھے ہوئے سامان پر بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے۔ میں اور غلام محمد پیسے مانگ رہے تھے تا کہ خیمے والے کو کوئٹہ جا کر ادائیگی کرتے۔ مگر پیسے تو خان صاحب نے دینے تھے اور انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ ان کے مشیر میر حمل

خان بھی موجود نہ تھے، جن سے شکایت کی جاتی۔ غوثی اور گل خان کے پاس تو کبھی کچھ ہوتا نہ تھا۔ بہر کیف شام کو یہ سامان لے کر ہم ڈھاڈر سے کوئٹہ روانہ ہوئے۔ ملک فیض جان بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ خیمے اور شامیانے کباڑی والے کو پہنچائے اور ادائیگی کے لیے وعدہ فردا کا طریقہ اختیار کر کے روانہ ہوئے۔ وہ نہایت ہی شریف النفس انسان تھے۔ جب بھی ہمیں دیکھتے منہ دوسری طرف کرتے تا کہ ہم شرمندہ نہ ہوں اور ہم شرمندگی سے سر جھکائے وہاں سے گزر جاتے۔ اتفاق سے کٹ خانہ واپسی کے وقت میکانگی روڈ پر دوپہر کو ہم ایک دوسرے سے کراس کرتے۔

تو اخبار اور اس سب معاملہ میں خان صاحب میر احمد یار خان ملوث تھے۔ اور اب ہم اپنے بزرگوں سے بدظن تھے۔

میں نے ان کے پمفلٹ کے ردِ عمل میں ایک تحریر تیار کی اور اس کا نام رکھا؛ ''ہمارا بلوچستان''۔ اس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ہم کس طرح کا بلوچستان چاہتے ہیں۔ یعنی اس میں سرداری اور ریاستی نظام نہ ہوگا۔ ایک پورا صوبہ ہوگا جس میں سب جمہوری اور نمائندہ حکومت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کریں گے۔ اس میں نہ مستجار علاقوں کا مسئلہ ہوگا نہ ریاستی یا برٹش بلوچستان کا امتیاز۔ ایک عوامی اور جمہوری نظام ہوگا۔

شام کو انجم قزلباش، ملک محمد پناہ، غلام محمد شاہوانی اور میں کیف فردوسی جناح روڈ میں ملے۔ اس میں اوپر کی منزل پر ایک کیبن میں مل بیٹھے۔ میں نے اپنی تحریر پڑھی۔ سب نے اسے پسند کیا اور اس منشور پر متفق ہوئے۔ پڑھنے کے بعد غلام شاہوانی نے جو اچھے صحافی اور علی گڑھ میں پڑھنے کی وجہ سے شستہ اردو لکھ سکتے تھے۔ وہ تحریر مجھ سے لی اور کہا میں اسے تیار کرلوں گا اور پریس سے چھپواؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے اسے نہایت خوبصورت انداز میں چھپوایا اور میرے اور اپنے نام سے اس کی اشاعت کی۔

ہم اِسے اُس وقت مارکس اور اینگلز کے مینی فیسٹو کا درجہ دے رہے تھے۔ ''ہمارا بلوچستان'' کے سرورق پر اسی قسم کے نمایاں کوٹیشن درج تھے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہم اس منشور کے مطابق پارٹی منظّم کریں گے۔ اور اس کا نام میں نے تجویز کیا ''دیمارو ک اُلس'' (آگے

بڑھتے عوام)۔ غلام محمد نے اسے انگریزی میں ینگ ڈیموکریٹ بتایا۔ اب مسئلہ اخبار کا تھا۔ اخبار کا ڈیکلریشن غلام محمد شاہوانی کے نام تھا۔ گویا حق ملکیت اس کا تھا۔ وہ اخبار واپس لے کر خود چلانا چاہتے تھے۔ میر گل خان نصیر شاید بہ ضد تھے کہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ معاملہ تلخی کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ میں نوشکی میں تھا۔ جب میر صاحب کوئٹہ پہنچے۔ انہوں نے مصالحت کرادی اور ''نوائے وطن'' میر گل خان کی ادارت سے لے کر غلام محمد شاہوانی کے حوالہ کر دیا۔

غلام محمد نے مجھے نوشکی بلوایا۔ یکم جون 1954 سے ''نوائے وطن'' کا پہلا شمارہ ان کی ادارت میں چھپنا شروع ہوا۔ 31 مئی کو نوائے وطن کا آخری پرچہ یوسف علی خان نمبر کی صورت میں ایک مجلّہ کی شکل میں شائع ہوا۔ جس میں دو آرٹیکل بطور اداریہ کے چھپے تھے۔ اور ایک گمنام خط کسی خاتون کا۔

حکومت نے بہانہ بنا کر ''نوائے وطن'' پر پابندی لگا دی اور غلام محمد شاہوانی کو ہتھکڑیاں پہنا کر میونسپلٹی کی کچرہ گاڑی میں ڈسٹرکٹ جیل کوئٹہ اور بعد میں ٹرین سے مچھ سینٹرل جیل پہنچا دیا۔

اب میں جب جوانی اور نیم پختگی (نہ جانے اب بھی وہی ہوں کہ نہیں؟) کے اس عالم اور دور پہ پیچھے مڑ کر نگاہ ڈالتا ہوں تو بے حد افسوس ہوتا ہے۔ گل خان کی عظمت مجھے شرمسار کرتی ہے۔

ہماری نکتہ چینی (کیونکہ اسے تنقید کہنا میرے خیال میں ناجائز ہے) گل خان پر کبھی تو ذاتی حملہ تک پہنچ جاتی۔ ہم ان کے خان صاحب سے تعلقات پر جو کچھ کہتے تھے، وہ بدگمانی پر مبنی تھا۔ اور پھر ہمارا ہدف ملامت گل خان ہی تھا۔ غوث بخش بزنجو نہ تھا۔

گل خان نصیر شاعر تھے؛ جذبات اور امنگوں کے تابع۔ نوجوان اور خوبصورت۔ انہیں اچھا اور قرینے کا لباس اچھا لگتا تھا۔ بعض اوقات وہ لارڈ بائرن کی طرح فیشن خود ایجاد کرنے کی کوشش کرتے اور نوجوان اس کی پیروی بھی کرتے۔ وہ خاص قسم کے بوٹ اور پاپوش موچی کو بتا کر تیار کرواتے۔ قمیص اور واسکٹ اور ٹوپیاں ڈیزائن کرواتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب ان کی پیشی نوشکی میں پولیٹیکل ایجنٹ چاغی کے پاس ان کے دفتر میں تھی۔ یہ دفتر مشہور تاریخی پہاڑی جو روایتی طور پر سنگی قلات کے نام سے بھی مشہور تھی، پر واقع تھا۔ گل خان کو وہاں جیل سے

لایا گیا تھا اور ہمیں (میں، اکرم خان اور نہ جانے کون ان کے ہمراہ تھے) باہر بینچ پر انتظار کرنے کو کہا گیا۔ گل خان بھی ہمارے ساتھ باہر کھڑے تھے۔ اس سال نوشکی میں بارشوں کی وجہ سے فضا سرسبزی کی وجہ سے بہت صاف اور خوبصورت تھی۔ گل خان نہایت خوش اور خوبصورت لباس میں ملبوس، خاص قسم کی عینکیں، خاص قسم کا جیکٹ (واسکٹ اور خاص قسم کی ٹوپیاں، جاپانیوں کے اس دور کے قسم کی) بہت خوش اردگرد نوشکی کے دور، ریت کی طرف نگاہ کیے ہوئے تھے۔ وہ نقشہ میرے ذہن کے کیمرے میں اب تک ضبط ہے۔

گل خان نہ جانے شاعری کے موڈ میں ہوں گے۔ پھر ان کی پیشی ہوئی اور ہم ان کے ساتھ جیل واپس ہوئے۔ اُن دنوں وہ ایک طویل نظم تخلیق کر رہے تھے جو انہوں نے جیل کے احاطہ کے لان میں بیٹھ کر ہمیں سنائی۔ وہ نظم میرے خیال میں ''ہفت ہیکل'' تھی جو اُن کی اس دور کی نظموں میں شامل ہے۔ یہ رزمیہ اشعار ہیں۔ جن کا تعلق مینگلوں کے علاقہ میں فوجی کاروائی سے ہے۔

اُس وقت گل خان نصیر کو قلی کیمپ سے براہِ راست نوشکی پولیس جیل لے جایا گیا۔ کوئٹہ میں بس اڈہ آج کے میزان چوک پر واقعہ تھا۔ اب اس جگہ میونسپلٹی کی دومنزلہ عمارت کھڑی ہے۔ گل خان نصیر کو ملٹری اذیت گاہ سے اڈہ لایا گیا۔ ان کے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی تھی جس کا سرا ایک پولیس والے نے تھاما تھا۔ ہم موجود تھے انہیں ملنے کے لیے۔ نہ جانے میرے ساتھ کون کون تھے۔ ملک پناہ مرحوم (جو گل خان کے جانی دوست تھے) اور انجم قزلباش ضرور موجود ہوں گے۔ گل خان کو نوشکی بس کے ذریعے ہی لے جانے کا بندوبست تھا۔ وہی بس (ارباب عظیم کی) یا حاجی نیک محمد کی۔ جب بھی ہم مل کر کوئٹہ بزنجو سے ملنے کے لیے آتے۔ (کیونکہ ان کی جب بھی کوئٹہ آنے کی خبر ہوتی تو ہم ان سے ملنے کے لیے بیتاب ہوتے) کبھی اکرم خان اور میں ہوتے۔ اگر گل خان پہلے ہی کوئٹہ میں موجود ہوتے تو میں اور اکرم خان چلے آتے۔ بس کا کرایہ دو تین روپے ہوتا، جو ہمارے پاس نہ ہوتا۔ اکرم خان اپنے بقال سے قرض کر کے ساتھ آتا۔ خود یا مجھے اور گل خان نصیر کو بھجواتا۔

بس پر جب ہم نے گل خان کو اس حالت میں دیکھا۔ وہ نہایت نحیف اور کمزور تھے۔ آواز اُن کی ویسے بھی باریک تھی۔ کمزوری کی وجہ سے اور بھی باریک ہوگئی تھی۔ ان سے باتیں

ہوئیں۔ ان کا عزم اور جرات برقرار تھا۔ ان کی پامردی میں کوئی کمی نظر نہ آئی۔

گل خان نصیر میرے خیال میں بزنجو اور کئی ساتھیوں کے ہمراہ چھ ماہ تک قلی کیمپ میں رکھے گئے۔ وہاں نہ جانے کیسی شاعری ممکن تھی۔ ذہن پر تو قید لگانا ممکن ہی نہیں۔ مگر اس تخلیق کاری کو ریکارڈ کرنا مشکل کام تھا۔ کیسے اسے کاغذ اور قلم میسر ہوئے۔ اور کس طرح وہ ریکارڈ شدہ مواد سنبھالا گیا۔ قیدی دوستوں نے اسے محفوظ کر کے بعد میں پہنچایا ہوگا۔

قلی کیمپ کی شاعری گل خان نصیر کی بالکل نئی قسم کی شاعری تھی۔ گل خان جیسے میں نے عرض کیا، رزمیہ گو شاعر تھے اور نظم کے شاعر تھے۔ بڑی طویل نظمیں تخلیق کرتے رہتے تھے۔

ماہنامہ ''سنگت'' کوئٹہ۔ستمبر 1998

۲۵

گل خان نہ جانے نوشکی جیل میں کتنے ماہ رہے۔اس کے بعد انہیں نوشکی تحصیل میں نظر بند رکھا گیا۔

گل خان کی زندگی تو میں نے قریب سے دیکھی ہے۔ میں نے روس کے قومی شاعر الیگزنڈر پوشکن کی شاعری اور زندگی کے بارے میں بہت پڑھا ہے۔ان سب کے پڑھنے کے بعد گل خان اور پوشکن میں مجھے یہ مماثلت نظر آتی ہے۔انہیں بھی سینٹ پیٹرز برگ سے دور، ان کی جاگیر میں نظر بند کیا گیا تھا۔گل خان نصیر کے پاس جاگیر تو نہ تھی البتہ وہ شام کو ایک لاٹھی لے کر اردگرد کے کھیتوں، ندی نالوں میں پھرا کرتے تھے۔اور گنگنا کر شعر تخلیق کیا کرتے یا اپنے سماج کو بدلنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ ہم صبح (میں، آزاد، محمد حنیف جمالدینی) اپنے گاؤں سے پیدل چل کر ڈیڑھ دو میل طے کر کے ان کے پاس پہنچتے۔ دوپہر کو اکرم خان قرض کر کے دعوت کھلاتے، سبز چائے پیتے اور گل خان کو حقہ کے کش لگاتے باتیں کرتے سنتے۔کیا حسین لمحات تھے۔ پھر شام کے وقت بادلِ نخواستہ اپنے گاؤں روانہ ہوتے۔گل خان کافی دور تک ہمارے ساتھ چلتے۔

ان کا جی بھی ہم سے علیحدہ ہونے کو نہیں چاہتا تھا۔

گل خان نصیر کو بے کار کبھی بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ پڑھتے تو وہ شاید رات کو مگر دن کو اکثر وہ لکھتے رہتے۔ان کا خط نہایت صاف اور خوبصورت تھا۔انہیں اچھی اور خوبصورت ڈائری، خوبصورت اور اعلیٰ پین اور بال پین اور خود کار پنسل پسند تھے۔انہیں اکثر احباب ان چیزوں کے تحفے کراچی سے بھیجتے۔ایک مرتبہ شیفر کا ایک خوبصورت پین اکبر بارک زئی، قادر بخش نظامانی اور ان کے ساتھیوں نے کراچی سے بھیج دیا تھا۔ وہ بچے کی طرح اسے دیکھ کر خوش ہوتے اور اپنے اشعار ڈائری میں درج کرتے۔ وہ اکثر اپنے اشعار کی ایک سے زیادہ کاپیاں لکھ کر رکھتے۔شاید انہیں آئے دن کی گرفتاریوں اور ان قیمتی اشیا کے کھو جانے کا خطرہ ہوتا۔انہیں غریبوں اور عام انسانوں سے بہت محبت ہوتی۔ایک اندھا شعر کہنے والا غریب انسان جس کا نام عظیم تھا، گل خان انہیں بہت عزت اور احترام دیتے اور انہیں اپنا استاد کہتے۔میرے خیال میں وہ ان کے قبیلہ کا پہلوان (گویا) رہا ہوگا۔انہیں بلوچی کے کئی شعر اور داستانیں یاد تھیں۔ان سے گل خان نے کئی قدیم طویل نظمیں تحریر کی تھیں۔میرے خیال میں ریکی کے اشعار بھی شاید انہی سے سن کر لکھ دیے تھے۔

گل خان میں سیکھنے اور اپنی زبان اور شاعری کو نمو دینے کا بے حد شوق تھا۔اردو، فارسی، انگریزی شاعری سے انہوں نے کافی استفادہ کیا تھا۔ جہاں جاتے وہ ضرور کسی نہ کسی سے بلوچی اشعار سن کر لکھ لاتے۔اس طرح سے ان کی زبان رخشانی لہجہ سے بدلتی رہتی۔انہوں نے کئی بیاض اس طرح کی قدیم شاعری کی بھر دی تھیں۔اور انہیں کتابی صورت دینے کے متمنی تھے۔*بلوچی عشقیہ شاعری، رزمیہ شاعری، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی* ان کی ایسی کاوشوں کا ثمر ہیں۔ جام درک کا نام پہلی مرتبہ میں نے گل خان سے سنا تھا۔اس وقت تک جام درک کے بارے میں نہ کوئی کتاب تھی اور نہ ہی کسی بلوچی ماہنامہ یا اخبار میں کوئی مضمون یا درک کی کوئی نظم شائع ہوئی تھی۔گل خان نے جو اس وقت بتایا، ان کا اندازہ تھا کہ وہ مولہ اور زہری کے علاقے کا کوئی شاعر گزرا ہے اور بتایا کہ وہاں جام قبیلہ کے لوگ ہیں۔ یہ نام وہاں سننے میں اکثر آتا ہے۔گل خان نے یہ بھی بتایا کہ جام درک کے والد کا نام کرمو تھا۔

حیرانی کی بات ہے کہ مجھے گل خان ہی نے پہلی مرتبہ لانگ ورتھ ڈیمز کی وہ کتاب دی جس میں کتاب کی دونوں جلدیں یکجا شائع ہوئی تھیں۔ میرے خیال میں ڈیمز کی اس مشہور کتاب۔''Popular Poetry of the Baloches'' کو دو پبلشروں نے شائع کیا تھا۔صحیح یادنہیں۔ ایک کا نام فوکلور سوسائٹی آف بنگال اور دوسرا رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ کتاب لندن سے 1907 میں شائع ہوئی تھی۔ میرے پاس دونوں جلدی ہیں۔مگر ہرایک جداجدا۔ یہ مجھے آغاعبدالکریم خان کی بیگم نے عنایت کی ہیں اور آغاصاحب کوتحفتاً خان عبدالولی خان نے پیش کی تھیں۔ پہلی جلد پرپشتو میں انہوں نے آغاصاحب کے نام اپنی محبت کا اظہار کر کے اپنے دستخط کے ساتھ یہ نایاب کتاب آغاصاحب کوپیش کی تھی۔ یہ کتاب عرصہ سے آؤٹ آف پرنٹ رہی۔مگر چند سال پیشتر جناب بشیر احمد بلوچ صاحب نے وہی ایڈیشن جو گل خان نصیر کے پاس دیکھا تھا، اسی طرح اسے ری پرنٹ کر کے ڈیمز کے شائقین کے لیے اسے دستیاب بنایا۔اس وقت بشیر صاحب بلوچی اکیڈمی کے چیئرمین تھے اور ایوب بلوچ جنرل سیکرٹری۔

(اُمید ہے کہ مجھے ''سنگت'' کے محترم قارئین معاف فرمائیں گے۔ کیونکہ معذوری کی وجہ سے تحقیق کے قابل نہیں رہا۔ کتابوں کوسمیٹنا اور دیکھنا میرے لیے مشکل ہوگیا۔ جو کچھ میں لکھتا ہوں یادداشت کے بل بوتے پر۔ دیکھئے قدرت یہ سہولت کب تک میرے لیے رہنے دے گی)۔

ایک مرتبہ جب میں کراچی سے آیا تھا تو محترم بشیر احمد سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اپنا مسودہ کتاب جو وہ شائع کرنا چاہتے تھے، مجھے دکھایا۔شاید پڑھنے کو بھی دیا جو میں لٹ خانہ جا کر دیکھتا رہا۔ مجھے انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ میر گل خان نے مسودہ دیکھا ہے اور پسند کیا ہے۔اور اس کام میں میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ بعد میں بشیر احمد بلوچ نے وہ کتاب اپنے ہی خرچ سے چھاپ کر بلوچی اکیڈمی کی پہلی اشاعت کی صورت میں منظر عام پر لانے کی سہولت مہیا کی۔ کتاب کے خوبصورت گرد پوش پر بشیر احمد کی تصویر اور ان کے کوائف درج تھے۔ کتاب چھپی اور اس وقت کے حساب سے بڑے خوبصورت گیٹ اپ میں شائع ہونے وای دیدہ زیب کتاب تھی۔

چند سال قبل کچھ محترم ادیبوں نے بشیر احمد کی اس بڑی کاوش کی اہمیت کو کم کرنے کے

لیے کہا کہ بشیر احمد نے یہ اشعار ریڈیو میں بیٹھ کر لوگوں سے جمع کیے تھے۔ کمال ہے؟ ڈیمز نے بھی تو یہی کیا تھا۔ وہ پولیٹیکل سفیر ڈیرہ جات تھے۔مختلف بلوچ گویوں کو بلوا کر انہوں نے بلوچ کلاسیکل شاعری کو یکجا کیا۔ یہی کام گل خان نے کیا۔ میں نے کیا۔ یوسف گچکی، عطا شاد، گلزار خان نہ جانے کتنے اوروں نے کیا۔اور کتنے لوگ آئندہ کریں گے۔ اور یہ بلوچی زبان کے لیے نہایت ضروری ہے اور اہم خدمت ہے۔

ماہتاک ''سنگت'' کوئٹہ۔ اکتوبر 1998

۲۶

گل خان نصیر کے بارے میں یہ زور دے کر کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ وہ اپنے دور کے سب سے زیادہ کمیٹڈ شاعر تھے۔ جیسے کہ انہوں نے اپنی ایک طویل نظم ''استمان ءِ شاعر'' (عوام اورلوگوں کا شاعر) میں عوامی شاعر کی خصوصیات بیان کی ہیں۔گل خان بعینۂ خود ایسے شاعر تھے۔ وہ اپنے عوام کے لیے شاعری کرتے تھے۔ انہوں نے دہقانوں، مزدوروں طالب علموں یا چرواہوں، بے علم اور ستم زدہ مرد اور خواتین، جہالت اور روایت پرستی کے شکار، روزمرہ کی مشکلات، بیماریوں اور افلاس میں مبتلا انسانوں پر مشتمل اپنے عوام کے لیے شاعری کی ہے اور ان آفات اور مشکلات کو دور کرنے کے لیے جدوجہد کا راستہ بھی واضح اور یقین سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے واضح اور برملا کہا ہے۔ چھپا کر نہیں کہا ہے۔ تاکہ ان کے کہے کو سمجھا جائے۔

''گرند'' کے دیباچہ میں گل خان نے واضح طور پر اس شاعر میں امتیاز اور فرق کرنے کے بارے میں بیان کیا ہے جو رومان پرستی اور عشق حسن، گل وبلبل کی شاعری کرتا ہے۔ اور وہ شاعر جو اپنے تباہ حال اور ستم رسیدہ عوام کے لیے شاعری کرکے اسے جدوجہد اور عمل کا راستہ بتاتا ہے۔گل

خان نے ایسی شاعری کی ہے۔اس قسم کی شاعری گل خان کو تیسری دنیا کے ادیبوں اور شاعروں کی صف میں نمایاں کردیتی ہے جنھوں نے گل خان ہی کی طرح قید و بند اور ظلم و جبر کی صعوبتیں اپنے عوام کے لیے سہیں۔ پابلو نرودا، ناظم حکمت...... کردوں کے وہ مشہور شاعر جو ایران کے بدنام ترین جیل ایوین میں تیس سال گزار کرنا کام انقلاب کے نتیجہ میں ہزاروں اسی قسم کے قیدیوں کے ہمراہ رہا ہوئے تھے۔ ان کا نام افسوس ہے کہ اب ذہن میں نہیں آرہا۔ اسی طرح گل خان نصیر اور آزاد جمالدینی دونوں مشہور ایرانی انقلابی شاعر ابوالقاسم لاہوتی کی فارسی شاعری سے بہت متاثر ہوئے۔ نصیر اور آزاد دونوں نے بلوچی میں ان کی شاعری کی نعم البدل بلوچی غزلیں لکھیں۔ مجھے یاد ہے کہ گل خان کے لیے کامریڈ نظامانی (قادر بخش) لاہوتی کا خوبصورت دیوان لائے تھے جو سوویت یونین میں شائع ہوا تھا۔ اسی طرح جناب انجم قزلباش لاہور سے لٹ خانہ کے لیے کئی اچھی کتابیں لائے جو فارسی میں اور انگریزی میں چھپی تھیں۔ ان میں دو کتابیں ابوالقاسم لاہوتی کی تھیں۔ ایک کتاب لاہوتی کا دیوان تھا۔ وہی ایڈیشن جو نظامانی گل خان کے لیے لائے تھے۔ اور دوسری کتاب فارسی میں الیگزینڈر پشکن، روس کے قومی شاعر کے کلام سے انتخاب کرکے ابوالقاسم لاہوتی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ایک بہت اچھی کتاب انگریزی میں میکسم گورکی کی تھی، جس کا نام تھا؛Articles and Pamphlets۔ یہ کتاب کھوگئی۔ اب نایاب ہے جس کا مجھے بے حد ملال ہے۔ یہ تحفے انجم صاحب ہمارے لیے لاتے تھے۔

گل خان نصیر کا میرے نزدیک بلوچی میں وہی مقام ہے جو ترکی میں ناظم حکمت، لاطینی یا ہسپانوی میں پبلو نرودا۔ فارسی میں لاہوتی اور اردو میں فیض احمد فیضؔ کا ہے۔

سندھی کے عظیم شاعر شیخ ایاز (جس کو نظامانی نے شاہ لطیف ثانی کہہ کر ان کے کلام کی تعریف کی تھی) پشتو کے اجمل خٹک، اردو کے فیض احمد فیضؔ ، اور بلوچی کے گل خان نصیر نے کامریڈ سوبھو گیانچندانی اور ڈاکٹر حسان صاحب کی کوششوں سے اکٹھا ہوکر سکھر میں ترقی پسند ادب کی ایک انجمن ''عوامی ادبی انجمن'' کی بنیاد رکھ دی تھی۔ یہ انجمن اب بھی کراچی میں باقی ہے اور اس کے وارث اب نور محمد شیخ رہ گئے ہیں۔ انہی کی کوششوں سے بالخصوص لعل بخش رند کی حکمت سے گل

خان نصیر کے بارے میں اس انجمن کی جانب سے دو کتابیں شائع ہوئی تھیں۔

لعل بخش رند نے تو اپنے پیسوں سے محنت کر کے گل خان نصیر کی بلوچی اور اردو شاعری کے دو تین آڈیو کیسٹ تیار کروائے۔ ان کے پاس تھا ہی کیا۔ بس جذبۂ شوق اور عشق ایسے کام کرواتی ہے۔

گل خان نصیر پر میرا ارادہ ایک کتاب لکھنے کا تھا۔ جس میں ان کی زندگی پر تحقیق کر کے تفصیل سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا۔ اور ان کی علمی، ادبی کاوشوں پر سیر حاصل بات کی جاتی اور ان کی شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا جاتا۔ پر زندگی کے حالات نے یہ امید، ناامیدی میں تبدیل کر دی۔ اب بس لٹ خانہ کے حوالے سے جو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ کہہ رہا ہوں۔

جیسے میں نے عرض کیا کہ نیپ حکومت کے دوران میری اپنے ان دو سینئر ساتھیوں، گل خان نصیر اور غوث بخش بزنجو سے ملاقات نہ ہوئی، نہ انہوں نے یاد کیا۔ جب ان کی حکومت ختم کی گئی اور گل خان پر ان کی آزاد خیالی اور انقلابی فکر کی وجہ سے ستم ڈھا کر ان کی فکری اور سیاسی شہرت کو قتل کرنے کے لیے ایک بہت ہی بدرنگ منصوبہ بنا کر انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے پس پشت سامراج، مقامی استحصالی قوتوں اور بدبخت بلوچی انتقام جوئی اور نوابوں اور سرداروں کی بری نیت کارفرما تھی۔ گل خان کے قریب ترین رفیق بزنجو صاحب نے بلوچ سیاست میں جو بہت ہی ٹھیک نہج پر پروان چڑھ رہی تھی، ان فیل پا سرداروں کو کھپا کر ایسی صورتحال پیدا کر دی جہاں وہ خود بھی ان کی نذر ہو گئے۔ اور گل خان کو ان کا ہدفِ انتقام بنایا۔

گل خان کی اس جھوٹے مقدمے میں پیشیاں اکثر اس وقت کے سیشن کورٹ میں ہوتی تھیں۔ ایک پیشی کے دوران میں، ملک پناہ کے پاس بیٹھا تھا۔ ہمارے مخلص ترین ساتھی ملا سعداللہ زہری نے آ کر بتایا کہ گل خان نصیر کو مچھ سے پیشی کے لیے کورٹ لایا گیا ہے۔ چنانچہ میں ان سے ملنے کے لیے کورٹ گیا۔ گل خان پیشی کے انتظار میں بٹھائے گئے تھے۔ ان کے پاس ان کے دوست اور ہم فکر براہوئی کے بے باک اور نامی گرامی شاعر رئیس نبی داد لانگو بیٹھے ہوئے تھے۔ اس طرح کئی سالوں کے بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ گل خان کو اندر ہی اندر کوئی روگ کھائے جا رہا تھا۔

وہ اس وقت سے سینے کے مرض میں مبتلا تھے۔ وہ کوئٹہ آ کر ایک ہوٹل میں رہائش پذیر تھے اور اپنی تاریخ کی بہت اہم اور ضخیم دوسری جلد لکھ رہے تھے اور اس کی اشاعت کا بندوبست کر رہے تھے۔ گویا وہ عرصہ سے بیمار تھے۔ گرانڈیل، خوبصورت اور صحت مند اور باہمت گل خان نصیر کی صحت روز بہ روز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ جب وہ نیپ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد مارشل لا حکومت اور بھٹو حکومت کے قائم کردہ حیدرآباد کیس کے دوران جیل میں دن گزار رہے تھے۔ اسی دوران پانچ سال کے عرصے میں گل خان نے مزید شاعری کی اور کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا منصوبہ بنایا تھا۔ گل خان نے بڑی محنت کر کے اپنی بیشتر شاعری کو کلیات کی صورت میں قلمبند کیا اور انہیں ضخیم رجسٹروں میں اپنے خوبصورت خط سے نہایت صاف ستھرا ترتیب دیا تھا۔ اسی دوران دوستوں نے جیل میں ان کی ایک خوبصورت تصویر لی تھی۔ بعد میں ان کے جانی اور قریبی دوست لعل بخش رند کی کوششوں سے اسی فوٹو گراف سے کراچی کے کسی ہم فکر آرٹسٹ نے نہایت خوبصورت پورٹریٹ بنا دیا۔

ماہتاک ''سنگت'' کوئٹہ۔ نومبر 1998

۲۷

80 کے عشرے ہی میں لعل بخش، نور محمد شیخ، رحیم بخش آزاد اور ان کے ساتھیوں نے چاکیواڑہ، لیاری میں، لیاری سینٹر میں گل خان کی یاد میں ایک نہایت پرشکوہ تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس تقریب کی صدارت اور مہمان خصوصی کے لیے میر غوث بخش بزنجو کو جو گل خان کے قریب ترین دوست اور سیاسی جدوجہد میں قید و بند کی صعوبتوں میں شریک رہے تھے، کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جو ہر لحاظ سے موزوں و مناسب تھے۔ مجھے اور پروفیسر بہادر خان رودینی کو بھی بلوچستان یونیورسٹی سے گل خان پر مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس تقریب میں کئی اور نہایت ہی محترم شخصیات بھی مدعو تھیں، جنھوں نے گل خان پر اظہار کیا' یا ان پر شعر پڑھے یا ان کی بلوچی نظموں کو اپنی شاعری میں منظوم پیش کیا۔ ان محترم اور گرامی شخصیات میں بزنجو کے علاوہ قمر ہاشمی مرحوم، اردو کے اہم اور ترقی پسند شاعر انور احسن صدیقی جنھوں نے گل خان نصیر کے قلی کیمپ کی اذیت گاہ میں کہی ہوئی طویل نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا، سنائیں۔ ملک کے مشہور ادیب ڈاکٹر محمد علی صدیقی، نور محمد شیخ، رحیم بخش آزاد، جناب لعل بخش رند، میں اور بہادر خان صاحب اپنے لکھے ہوئے مقالے نہیں پڑھ

سکے۔ کیونکہ رات گئے دیر ہو رہی تھی۔ آخر میں بزنجو صاحب نے گل خان نصیر اور ان کی شاعری پر بہت اچھی اور پیاری باتیں کہیں۔ ہم دونوں نے (میں نے اور بہادر خان نے) زبانی گل خان پر اظہار کیا۔

لیاری کے لوگوں نے بڑی تعداد میں اس طویل تقریب میں شرکت کی۔ بہت صبر، تحمل اور احترام سے یہ سب کچھ سنا۔

تقریب کے اختتام پر میں نے گل خان کا مذکورہ بالا پورٹریٹ جو سٹیج پر سجایا گیا تھا اور مجھے بہت پسند آیا تھا۔ لعل بخش رند سے اپنی اس پسندیدگی اور اس تمنا کا اظہار کیا کہ ان کا یہ پورٹریٹ مجھے عنایت کیا جائے۔ لعل بخش نے جو ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے ہیں، اس مرتبہ بھی نہایت خوشی سے اسے میرے حوالے کیا۔ بعد میں لعل بخش نے دوسرے مقالوں کے ساتھ ہمارے ان دو مقالوں کو بھی شائع کیا تھا۔

میں نے پورٹریٹ اٹھایا اور بہادر خان کے ہمراہ اپنے ہوٹل چلے گئے اور صبح اسے سینے سے لگا کر بس میں کوئٹہ پہنچایا۔ اور یہاں یونیورسٹی میں اپنے مہمان خانہ میں اسے سجایا۔ بعد میں جب میں یونیورسٹی سے فارغ ہوا اور یونیورسٹی والا مکان خالی کر کے اپنے بیٹوں کے بنائے ہوئے گھر میں منتقل ہوا تو گل خان نصیر کا وہ پورٹریٹ نئے گھر کے مہمان خانے میں نصب کیا۔

اس مہمان خانہ میں گل خان کے علاوہ میرے لیے اور ایک اور متبرک تصویر بھی آویزاں تھی۔ وہ تصویر حضرت بیٹ نیکہ کی تھی۔ اس سے قبل ایک پورٹریٹ بنگالی زبان کے عالمی شہرت کے نوبل انعام یافتہ شاعر گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کا بھی تھا۔ جو دوستین میرے لیے ڈھاکہ سے لائے تھے۔ ٹیگور کی شکل حضرت رحمان بابا (پشتو کے قابلِ احترام شاعر) کی شبیہ سے ملتی جلتی ہے۔ مگر جب ہم نئے گھر میں منتقل ہوئے تھے تو ناقدر شناسوں نے ٹیگور کے پورٹریٹ کسی طاقِ نسیاں میں ڈال دیا تھا۔

گل خان کی یہ تصویر مجھے بہت پسند ہے۔ یہ تصویر مچھ جیل کے کسی سیل میں لی گئی تھی اور گل خان سیمنٹ کے اس چبوترے پر بڑی شان سے بیٹھے تھے، جو سونے کے لیے سیلوں میں عموماً

ہوتے ہیں۔گل خان ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھ کر اپنی بیاض کے لیے سپورٹ بنا کر مخصوص انداز میں اپنے خوبصورت قلم سے اور خوبصورت خط میں سوچتے اشعار قلمبند کرتے نظر آرہے تھے۔

بعد میں یہ تصویر اور بیٹ نیکہ کی تصویر دونوں میں نے ایوب صاحب کے حوالے کیں تا کہ وہ اپنے نئے انسٹیٹیوٹ آف بلوچستان سٹڈیز میں رکھیں کیونکہ میرے خیال میں ایسی ہستیوں کی یادگاریں ایسے ہی قومی اداروں میں رکھی جائیں جہاں انہیں عالم اور قدردان لوگ دیکھ سکیں۔

میرے خیال میں اگست 1993 کا مہینہ تھا کہ براہوئی اکادمی نے ایک بین الاقوامی شاندار کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔ جناب صلاح الدین مینگل اکادمی کے چیئرمین تھے۔محترم کارینا جہانی کو بھی شرکت کے لیے دعوت دی تھی۔کارینا جہانی کو یونیورسٹی کیمپس کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔انہوں نے انگریزی میں گل خان نصیر اوران کی قومی شاعری پر بڑا اچھا مقالہ پڑھا۔بعد میں کارینا نے خواہش ظاہر کی کہ نوشکی جا کر گل خان کے مقبرہ پر حاضری دیں۔میں اسی سال فالج کی بیماری میں مبتلا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ دوستین مجھے اور آپ دونوں کو نوشکی لے جائیں گے۔ چنانچہ ہم دونوں دوستین کی جیپ میں نوشی روانہ ہوئے۔عین دوپہر کو ہم نوشکی پہنچے اور سیدھا گل خان کے مزار کی طرف روانہ ہوئے۔وہاں پہنچ کر ہم نے حاضری دی۔میں تو اترنے کے قابل نہ تھا۔دور سے فاتحہ پڑھا۔کارینا اور دوستین قبر کے پاس گئے اور کارینا نے اس کا عکس لیا۔بے حد گرمی تھی۔ میں کارینا کے لیے پریشان تھا کہ سوئیڈن کے برفیلے علاقے کی خاتون نوشکی کے ریگستان میں بیمار نہ ہوجائے۔ایک رات ہمارے گاؤں میں رہ کر اگلے روز واپس ہوئے۔کارینا نے اپنے اس دورہ کو بامقصد بتایا اور بہت خوش اور مطمئن ہوئیں۔

جناب ڈاکٹر جوزف الفین بائین نے اپنی مشہور کتاب An Anthology of Classical and Modern Balochi Literature جو 1990 میں جرمنی میں چھپی ہے، دیگر جدید بلوچی شعرا کے کلام سے انتخاب کر کے گل خان نصیر کی سب سے زیادہ یعنی بارہ طویل نظمیں منتخب کر کے شائع کی ہیں۔اس میں اصل ٹیکسٹ اوران کے انگریزی ترجمے دیے ہیں۔ بلوچی نثر کا بھی کافی ذخیرہ کتاب میں ہے۔

گل خان نصیر کی مندرجہ ذیل نظمیں دی گئی ہیں۔

1- استمانہ شاعر (عوام کا شاعر)

2- بلوچستان...... (بلوچستان)

3- بانک آزاتی (محترمہ آزادی)

4- شیر گال کاریت (شیر بولتا ہے)

5- بش ءِ ہارو ہیروپ (سیلاب کی تباہ کاریاں)

6- اشتر (اونٹ)

7- سیاہیں جمران تہہ پہ تہنان (گھنگور گھٹائیں)

8- ڈیوا (دیا)

9- پُلنگ (چیتا)

10- چار بندیں شیئر (رباعیاں)

11- چار بیتگ (رباعیاں)

12- دستیں و شیرین حصہ اول، دوم پنجم، ہفتم اور حصہ سوئم، چہارم، ششم کے خلاصوں کے ساتھ۔

ان اشعار میں سے بیشتر گل خان نے اپنے خط میں تیار کر کے لندن بھیجے تھے جنہیں ترجمہ کے لیے الفین بائین مجھے یونیورسٹی بھیجتے رہے ہیں۔میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ان کا ترجمہ کیا اور انہیں بھیجے۔کچھ خود انہوں نے 1978 میں گل خان کی حیدر آباد سے رہائی کے بعد کوئٹہ میں ان کے گھر جا کر ان کی زبانی ریکارڈ کر کے خود انہی سے ترجمہ کروائے تھے۔

ماہنامہ "سنگت"، کوئٹہ۔دسمبر 1998

۲۸

مرحوم قادر بخش نظامانی کا تعلق بھی لٹ خانہ سے کافی رہا۔ اور میرا تو ان سے تعلق آخر دم تک رہا۔ آخری مرتبہ جب وہ کوئٹہ مجھ سے اور اپنے دیگر احباب سے ملنے آئے تھے، وہ شاید 1995 کا سال تھا۔ یعنی اپنی وفات سے چند ماہ پہلے۔ مجھے ان کا سنِ وفات ٹھیک طرح یاد نہیں۔ میری بیماری کا عجب عالم ہے۔ بہت ماضی کے حالات اور نام اور وقت اور ماہ و سال زیادہ بہتر یاد آتے ہیں۔ قریب تر کا عالم ایسا نہیں۔ اس سال (1995) مجھے میرے بیٹے حب لے گئے تھے، میرے داماد عزیز رند کے یہاں۔ تاکہ میرا کراچی میں چیک اپ کرایا جائے۔ نظامانی صاحب اس سے پہلے کوئٹہ آ کر ہم سے مل کر گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا اکلوتا بیٹا دوستین اور دوستین کا انگریز دوست جوڑا، اور دوستین کے ساتھ ان کی دو ہمشیرائیں محترمہ طاہرہ اکبر (میرے پیارے اور محبوب دوست اکبر بارکزئی کی بیگم) اور ان کی چھوٹی بہن شاہناز (ڈاکٹر شاہ بخش لاشاری کی بیگم) اور ان کا بچہ مہران ساتھ آئے تھے۔ طاہرہ، شاہناز اور مہران کو ہم نے اپنے گھر میں ٹھہرایا تھا اور دوستین ان کے والد اور ان کے انگریز دوست ایم پی اے ہاسٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔

لیکن جب میں حب میں تھا، وہاں نظامانی صاحب اور ان کے ایک عزیز ڈاکٹر اور ہمارے ایک اور پیارے دوست عبدالرسول نظامانی، عزیز رند کے گھر مجھ سے ملنے آئے تھے۔ یہ ان کی محبت تھی۔ پھر جس دن لندن واپس جا رہے تھے، آخری مرتبہ انہوں نے کراچی ایئرپورٹ سے ٹیلیفون پر مجھ سے بات کی، الوداع کہا اور لندن روانہ ہوئے۔ کسے پتہ تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات اور بات چیت ہوگی۔ اس کے چند ماہ بعد ان کے بیٹے نے لندن سے مجھے اطلاع دی کہ قادر بخش نظامانی صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ اور ان کی میت کراچی لا رہے ہیں۔ میں خود تو کراچی نہیں جا سکا۔ البتہ اپنے بیٹے دوستین کو ان کے بیٹے کے پاس کراچی تعزیت کے لیے بھیجا۔

قادر بخش نظامانی صاحب کے بارے میں بہت کچھ میں نے اس کتابچہ میں لکھ دیا تھا جو ڈاکٹر شاہ محمد نے سوبھوگیان چندانی کی زندگی اور سیاسی مصروفیات کے بارے میں شائع کیا۔ سوبھو صاحب کا اصرار تھا کہ اس کتابچہ کا پیش لفظ مجھ سے لکھوایا جائے چنانچہ میں نے ان کی محبت کے جواب میں پیش لفظ لکھ کر دیا۔ چونکہ میری پہلی ملاقات کامریڈ سوبھو اور کامریڈ نظامانی سے ایک ساتھ ہوئی تھی اور وہ جب تک بلوچستان میں چند روز رہے، میں ان کے ساتھ رہا اور بعد کی ملاقاتیں کراچی اور سندھ کی بھی اس میں تحریر ہیں۔ اس لیے میں نے بہت کچھ نظامانی صاحب کے بارے میں اُس کتابچہ کے پیش لفظ میں لکھ دیا ہے۔ اب اس سب کی تکرار اچھی نہیں لگتی۔ مگر میرا تو نظامانی سے کافی عرصہ تعلق رہا ہے جبکہ ہم کولیگ اور ہمکار بھی رہے ہیں۔ لہٰذا کچھ لکھنا باقی ہے۔ اس لیے لٹ خانہ کے حوالہ سے ہی یہ سب کچھ لکھنا مناسب ہے۔

قادر بخش نظامانی کا نام سب سے پہلے میں نے گل خان نصیر سے سنا۔ میرے خیال میں 1953 کا سال تھا۔ جب ہم دونوں نوشکی میں تھے اور سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ نصیر صاحب نے مجھے علیحدگی میں لے جا کر رازدارانہ طور پر پوچھا، ''آپ قادر بخش نظامانی کو جانتے ہیں؟'' میں نے نفی میں جواب دیا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ وہ بہت مشہور سیاسی شخصیت اور پروگریسو ہیں اور میر غوث بخش بزنجو کے پرانے دوست اور ساتھی رہے ہیں۔ میر گل خان نے بتایا کہ وہ بلوچستان آئیں گے اور ہم سب سے مل کر سیاسی تنظیم تشکیل دیں گے۔ اس کے بعد 1954 میں

نظامانی اور سوبھو واقعی بلوچستان پہنچے اور میں نے پہلی مرتبہ ان دو حضرات کو دیکھا۔ نظامانی کا نام مجھے ماسٹر کریم بتایا گیا۔ ان سے مجھے متعارف مرحوم عبدالصمد درانی نے کرایا۔ نظامانی اور سوبھو، نال بزنجو صاحب کے پاس جانا چاہتے تھے۔ مجھے انہوں نے ساتھ لیا۔ ہم قلات پہنچے۔ وہاں میر گل خان نصیر اپنے بڑے بھائی میر لعل بخش کے پاس رہا کرتے تھے۔ پروگرام تھا کہ انہیں بھی ساتھ نال بزنجو کے پاس لے جائیں گے۔ مگر نظامانی صاحب کی متلون مزاجی اور نازک طبعی آڑے آ گئی۔ وہ علی الصبح میر لعل بخش کے باغ کے کچے سیب کھا کر مریض ہوئے۔ ڈائریا سے گھبرا کر واپس کوئٹہ جانے کے لیے کہا۔ چنانچہ میں اور سوبھو صاحب ان کو ساتھ لے کر کوئٹہ پہنچے۔ یہاں ایک شام گرلز کالج کوئٹہ کے سبز چمن میں ان کے ساتھ پارٹی کے بارے میں نشست ہوئی۔ میرے خیال میں عبدالصمد درانی (ٹھیک یاد نہیں) گوہر خان زرک زئی، شورش بابو، گل خان نصیر (ٹھیک یاد نہیں)، نظامانی اور میں اس میں شامل تھے۔ بات یہ ہوئی کہ ہم نے مل کر کمیونسٹ پارٹی کو بلوچستان میں منظّم کرنا ہے۔ اس کے بعد کئی اور احباب سے مل کر سوبھو اور نظامانی کراچی واپس ہوئے۔

ازاں بعد ہماری پھر ایسی کوئی میٹنگ نہ ہوئی اور نہ ہی ہم نے اس معاملہ کو آگے بڑھایا۔ ممکن ہے اوروں نے بڑھایا، مگر مجھے اس کا علم نہیں۔ اس طرح میرا نظامانی صاحب سے تعلق پیدا ہوا۔ میرے خیال میں ہمارے بارے میں (لٹ خانہ کے بارے میں) بزنجو صاحب نے سوبھو اور نظامانی کو بتایا ہوگا۔ مگر سوبھو خود لٹ خانہ آئے۔ خدائیداد، انجم، کمال خان سے ملے۔ ان سے باتیں کیں۔ ان کی اور کمال خان کی بحث ہوئی۔ مگر نظامانی صاحب شاید صرف مجھ سے رابطہ رکھنا چاہتے تھے۔

کئی ماہ بعد پھر نظامانی صاحب لٹ خانہ تشریف لائے۔ مجھ سے ملے۔ اور پھر مجھے ساتھ لے کر شہر سے باہر پیدل لے گئے۔ ہم مردار پہاڑ کی طرف نکلے اور پہاڑی پر چڑھتے گئے۔ اس سفید نشان تک جہاں کوئی فقیر کسی غار میں کبھی رہا کرتا تھا۔ مگر چونکہ نظامانی بوٹ پہنے ہوئے تھے، لہٰذا پہاڑی پر چڑھنا ان کے لیے دشوار تھا۔ ہم واپس ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہری پور ہزارہ جا کر شہزادہ عبدالکریم خان اور محمد حسین عنقا سے جیل میں ملاقات کر کے آئے تھے۔ انہوں نے شہزادہ عبدالکریم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط دیا جو بلوچ نوجوانوں کے نام تھا۔ میں نے خط پڑھا۔ آغا

صاحب نے اس میں تلقین کی تھی کہ ترقی اور عوام کا واحد راستہ مارکسزم اور سوشلزم ہے۔ بلوچ نوجوانوں کو اگر اپنے لوگوں کو استحصال سے آزاد کرنا ہے تو اسی راہ پر چل کر جدوجہد شروع کریں اور انہوں نے زور دے کر لکھا تھا کہ اس کے لیے مارکسزم کا مطالعہ لازمی ہے۔

نظامانی نے بتایا کہ وہ چند روز وہاں رہ کر ان سے اور عنقا سے خط و کتابت کرتے رہے ہیں اور سیاسی تبادلہ خیال کرتے رہے ہیں۔ (خطوط کے ذریعے)۔ مجھے اب یاد نہیں کہ وہ خط میرے علاوہ میرے دوسرے ساتھی، انجم قزلباش، خدائیداد، سردار بہادر خان، غلام محمد شاہوانی نے پڑھے کہ نہیں۔ کمال خان شیرانی اُن دنوں لٹ خانہ میں موجود نہ تھے۔ ملک محمد پناہ نے اس کے بارے میں سنایا نہیں، یاد نہیں۔

نظامانی صاحب ایک روز اچانک صبح کے وقت لٹ خانہ آئے۔ وہ شاید گذشتہ روز کراچی سے آئے تھے۔ اسی سال یا گزشتہ سال سٹالن کا انتقال ہوا تھا۔ سوویت یونین میں سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی اکیسویں کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کانگریس میں سٹالن پر سخت تنقید ہوئی تھی۔ یعنی بعد از مرگ واویلا۔ سٹالن کی زندگی میں دنیا بھر کے کمیونسٹ اس کی پرستش کر رہے تھے۔ وہ دوسری عالمی جنگ کے ہیرو کی صورت میں عالمی سطح پر چھا گئے تھے۔ سٹالن پر تنقید اس وقت کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک روز جناح روڈ کوئٹہ میں سیاسی بحث کے دوران کسی نے سٹالن پر نہ صرف تنقید کی بلکہ اسے برا کہا۔ بابو عبدالکریم شورش موجود تھے، ان سے یہ باتیں برداشت نہ ہوئیں اور انہوں نے اس شخص کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔

سٹالن کی مقبولیت پرستش کی حد تک تھی۔ کمیونسٹ دنیا میں ان کی پرستش ہو رہی تھی۔ اکیسویں کانگریس پر کمیونسٹوں نے اس کو عقیدت مندی سے نکال باہر کیا۔ اور ایک متحدہ لیڈرشپ کو جنم دیا، جس میں خروشچیف، بلگانین اور مولوٹوف، بعد میں **کوسیجن** شامل تھے۔ سٹالن کو پارٹی کی تاریخ میں جو بالشویک پارٹی کے نام سے شائع ہوئی تھی، ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا۔ اور انہیں لٹریچر کی تعلیم سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ کمیونسٹ دنیا میں یہ بھونچال سے کم نہ تھا۔ کانگریس کی اس روئیداد کو جو خروشیف جو کہ اس وقت سوویت پارٹی کے سیکرٹری جنرل تھے، نے کانگریس میں پڑھ کر سنایا۔

ظاہر ہے سوویت یونین کی پارٹی کانگریس میں دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیوں کے لیڈر موجود تھے۔ کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ البتہ کسی منچلے نے ایک پرزہ پر چند حروف لکھ کر روسٹرم تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ اس میں خروشچیف سے سوال کیا گیا تھا کہ اسٹالن کی زندگی میں وہ کیوں خاموش رہے اور انہوں نے تنقید کیوں نہیں کی۔ خروشچیف نے یہ پڑھ کر جواب دیا تھا کہ میں نے بھی اسی طرح خوف سے خاموشی اختیار کی تھی جس طرح اب آپ نے بغیر نام بتائے اور چھپ کر یہ پرزہ مجھ تک پہنچایا ہے۔

خروشچیف کی اس پوری رپورٹ کا مکمل متن امریکہ کے سب سے مشہور روزنامہ نیویارک ٹائمز میں شائع ہوا تھا۔ اور قادر بخش نظامانی صاحب نیویارک ٹائمز کا یہ شمارہ لٹ خانہ پہنچا گئے۔ اور مجھے پڑھنے کے لیے دیا۔ میں نے بعد میں بڑے غور سے اسے پڑھ ڈالا۔ شاید دوسرے احباب نے بھی پڑھا۔

قادر بخش نظامانی صاحب ان دنوں سوویت یونین کے سفارت خانہ کے دفتر اطلاعات میں ملازم تھے۔ میرے خیال میں نیویارک ٹائمز کے شمارے کی کاپیاں وہاں پہنچائی گئی تھیں۔ اور دفتر کے ذمہ دار افسران کی منشا سے یہ تقسیم ہو رہی تھیں۔

اس کے بعد کمیونسٹ پارٹیوں میں شخصیت پرستی کو بُرا قرار دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد قادر بخش نظامانی صاحب سے کس وقت ملاقات ہوئی، یاد نہیں۔ وہ ضرور لٹ خانہ بھی آ کر گئے۔ ایک ہوٹل میں وہ قیام کر رہے تھے۔ وہاں ان دنوں بلوچی کے دو معروف ادیب بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ سید ظہور شاہ ہاشمی اور عبدالصمد امیری تھے۔ ان سے ملنے گیا تو نظامانی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ تہران، ایران جا رہے تھے۔ ان دنوں ایران میں انقلابی کیفیت تھی۔ تودہ پارٹی اور ڈاکٹر محمد مصدق کی پارٹی نے مل کر عوام کی قوت سے شہنشاہ ایران محمد رضا کو ایران چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور وہ ملک چھوڑ کر روم چلے گئے تھے۔ نظامانی صاحب نے اس بابت زیادہ کچھ نہیں بتایا۔

میرے خیال میں ایران سے واپسی پر بھی وہ لٹ خانہ آئے تھے۔ انہوں نے ایک

کتاب مجھے پڑھنے کو دی، جو فارسی میں تھی۔ وہ جدید فارسی ادب کے مشہور زمانہ ترقی پسند ادیب بزرگ علوی کا مشہور ناول چشمہایش (اُس کی آنکھیں) تھا۔ بزرگ علوی کا نہ جانے اس سال یا گذشتہ سال 85 سال کی عمر میں جرمنی میں جلاوطنی کے عالم میں انتقال ہوا۔

کتاب مجھے بہت پسند آئی۔ مگر اس وقت میں جدید فارسی سے بہت زیادہ بلد نہ تھا۔ کچھ پڑھ لی۔ پھر وہ ساتھ کراچی لے گئے۔ یہ کتاب میں نے سویڈن میں اپسلا یونیورسٹی میں محترمہ کارینا جہانی کی کلاس میں دیکھی۔ وہ پڑھ رہی تھیں۔ گذشتہ سال میں نے اُن سے اس کتاب کا مطالبہ کیا تو انہوں نے از راہِ کرم و محبت اس کی فوٹو کاپی کروا کر مجھے بھیج دی۔ کتاب میں نے پڑھ لی ہے۔ بہت پسند آئی۔ پھر پڑھنے کو جی کرتا ہے۔ اب ان کے دیگر ناول پڑھنے کی تمنا ہے، جس میں ایک اور مشہور ناول ''چمہ دان'' (سوٹ کیس) ہے۔ اس کے لیے بھی کارینا ہی کو درخواست کرنا پڑے گی۔ کیونکہ اب ایران میں ایسی کتابیں دستیاب نہیں جو روشن خیالی کو فروغ دیں۔

قادر بخش نظامانی نے کچھ عرصہ بعد ایک پروفارما کراچی سے بھیجا۔ اس کی کئی کاپیاں تھیں۔ اس میں ہدایت یہ تھی کہ ان پر کوئٹہ میں خاص و عام لوگوں سے دستخط لے کر ان کو واپس بھجوا دیں۔ پروفارما میں شہزادہ عبدالکریم اور ان کے ساتھیوں اور خان عبدالصمد اچکزئی کی رہائی کا تقاضا تھا۔ جو طویل عرصہ سے جیل میں بند تھے۔ حالانکہ وہ لوگوں کی بھلائی، جمہوریت اور پریس کی آزادی کے لیے لڑتے آئے تھے۔

غلام محمد شاہوانی نے ''نوائے وطن'' میں اس سے متعلق اداریے لکھے۔ میں نے اور ڈاکٹر خدائیداد نے یہ پروفارما لے کر لوگوں سے اس پر دستخط لینا شروع کیے، جو کچھ ہم سے ہو سکا کیا اور شاید واپس کراچی بھیج دیے۔ (اس سب کی تفصیل مجھے یاد نہیں)۔

قادر بخش نظامانی کا کردار، بلوچستان کی سیاست میں شروع سے ہی رہا ہے۔ بعد کی معلومات سے پتہ چلا کہ قادر بخش تقسیم سے پہلے سندھ بلوچستان کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری رہ چکے تھے۔ عالمی جنگ دوم کے دوران پارٹی کی پالیسی سے اختلاف کیا۔ اور اس جنگ کو عوامی جنگ سمجھ کر پارٹی کی پالیسی کا ساتھ نہیں دیا۔ کہتے ہیں بعد میں پارٹی نے اسی مؤقف کو صحیح قرار دیا۔ ویسے

بلوچستان کے حوالے سے نظامانی بلوچستانی سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کرتے رہے۔ یوسف علی خان، عبدالصمد خان، اسلم اچکزئی، محمد حسین عنقا اور بعد میں غوث بخش بزنجو بھی ان کے ساتھ ملے۔ کراچی میں مختلف اخبار اور صحافتی سرگرمیوں میں نظامانی کا رول اہم رہا۔ ویسے جیسے کہ انہوں نے لکھا ہے اور میر بزنجو کہتے رہے۔ 1934 میں کمیونسٹ پارٹی کی اجازت اور سفارش سے وہ کوئٹہ آکر نال سے ہوتے ہوئے ایران کریم بخش سعیدی کے پاس راسک گئے اور وہاں سے شاید سرخس کے راستے ایران کی سرحد پار کرکے ترکمانستان سے ہوتے ہوئے ماسکو گئے۔ اور وہاں نہ جانے ایک سال یا زیادہ عرصہ ماسکو کے قریب پارٹی سکول یا اکیڈمی میں پڑھتے رہے۔ لیکن نظامانی کی طبیعت میں جیسے کہ میں سمجھتا ہوں (شاید غلط سمجھ رہا ہوں گا) قرار نہیں تھا۔ وہ متلون مزاج تھے۔ جلد دل برداشتہ ہوجاتے۔ اپنے مقصد سے نہیں، ہمکاروں سے۔

قادر بخش جو جی میں آتا برملا کہتے۔ بہت سارے لوگ ان کی ایسی طبیعت کا ساتھ نہیں دے سکے۔ خوش آمد نہ انہیں آتی تھی اور نہ پسند کرتے تھے۔ نہایت ذہین اور ایک دم عمل پر آمادہ ہوجاتے۔

دلچسپ بات ہے جب روس جا رہے تھے تو کوئٹہ میں میر شہباز خان نوشیروانی سے ایک سائیکل طلب کی کہ اس پر چڑھ کر نال جائیں گے۔ جب یہاں لندن سے کوئٹہ آئے تھے تو بہت سارے پرانے اور نئے دوستوں سے ملنے کی کوشش کی۔ ان کے پرانے احباب تو اکثر فوت ہوچکے تھے۔ ایک اکبر خان اچکزئی سے ملے۔ جو خان صمد خان کے عزیز اور ان کے ہمکار اور شاگردوں میں سے تھے۔ یوسف علی خان کے مقبرے جاکر فاتحہ دی اور اس کی ویرانی اور بربادی پر لوگوں کو متوجہ کیا۔ میر شہباز خان نوشیروانی جواُن کے اور خان صمد خان اور یوسف علی خان کے پرانے ساتھی رہے تھے، مگر بعد میں مسلم لیگ میں قائداعظم کے ساتھ ہوئے، کے بارے میں مجھ سے پوچھا۔ میں نے ان کے بارے میں معلوم کیا۔ وہ سردیوں میں اکثر خاران جاتے ہیں۔ اس وقت موجود نہ تھے اور خاران چلے گئے تھے۔ بعد میں جب وہ ملے تو میں نے قادر بخش کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے بہت افسوس کیا کہ ملاقات نہیں ہوسکی۔ پھر ہنس دیے اور بتایا کہ نظامانی نے جھالاوان جانے کے

لیے مجھ سے سائیکل مانگی تھی۔ اس زمانے میں آمدورفت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، سوائے اونٹوں کے۔ نظامانی نے روس جاتے ہوئے بلوچستان (مغربی اور مشرقی) دونوں میں اونٹ کے ذریعے سفر کیا۔

ماہتاک ''سنگت''، کوئٹہ۔ جنوری 1999ء

۲۹

کراچی میں نوجوانی کے زمانہ میں ایک تصویر کھنچوائی تھی جس میں قادر بخش، بزنجو اور کریم بخش سعیدی (بعد میں حاجی بنے) تینوں ساتھ تھے۔ ان کے گھر میں یہ تصویر بہت عرصے تک آویزاں رہی۔

قادر بخش نظامانی نے ہر دور میں بلوچستان کی سیاسی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔ مگر ہر دفعہ بلوچستان کے سیاسی رہنماؤں نے ان سے نہ صرف کنارہ کشی اختیار کی بلکہ ان کی کردارکشی بھی کی۔

شہزادہ عبدالکریم خان نے برصغیر کی تقسیم کے وقت مکران کو ریاست قلات سے علیحدہ کرنے پر بغاوت کی اور پاکستان چھوڑ کر سرحد پار کر کے افغانستان اور پاکستان کی سرحد پر کیمپ میں پہنچے تو قادر بخش نظامانی اور سندھ ہاری پارٹی کی ایک نامی گرامی شخصیت جناب مولانا عزیز اللہ جتوئی ان کے ہمراہ ہوئے اور وہ شہزادہ کریم کے کیمپ میں چھپ کر پہنچے۔ محمد حسین عنقا ان کے پرانے کامریڈ تھے، ان کی مدد کو پہنچے۔ ان دونوں نے اپنے نام بدل دیے تھے۔ نظامانی کا نام یوسف اور جتوئی صاحب کا شاید نور محمد تھا۔ انہیں افغان گورنمنٹ کے ساتھ گفت وشنید کے لیے اور شہزادہ

کریم کا ایلچی بنا کر ملک سعید کے ساتھ افغانستان بھیج دیا گیا۔ جتوئی واپس سندھ چلے گئے تھے۔ اس کی تفصیل میر عبدالواحد کرد نے اپنی یادداشتوں میں تحریر کی ہے۔ جواب تک نہیں چھپی ہیں۔ جب ملک سعید اور نظامانی واپس ہوئے تو نہ کیمپ باقی تھا نہ باغی لوگ۔ انہیں قلات کے قریب ہربوئی کے پہاڑوں کے پاس گرفتار کرلیا گیا تھا۔ بارڈر کراس کرتے ہوئے ملک سعید ملیشیا کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ رات کا وقت تھا، ملک سعید کے شور مچانے پر نظامانی (یوسف) خبردار ہو کر نکل بھاگے اور چھپ چھپ کر سندھ پہنچے۔ جب بغاوت کا مقدمہ چلا تو قادر بخش نظامانی کا پتہ نہ چل سکا۔ اور نہ ہی وہ اس وقت ہاتھ آئے۔ جب مقدمہ ختم ہوا اور سب کو سزائیں ہوئیں، نظامانی نمودار ہوئے۔ شک کی بنا پر یا نہ جانے کس خیال سے انہیں گرفتار کیا گیا۔ چند ماہ سکھر جیل میں رکھے گئے۔ اتفاق سے ملک سعید بھی اسی جیل میں سزا کاٹ رہے تھے۔

قادر بخش نظامانی ایک لحاظ سے میرے نظریاتی استاد رہے ہیں۔ انہوں نے میری ذہنی تربیت میں بہت مدد کی تھی۔ یہی باتیں جناب غوث بخش بزنجو صاحب اپنے بارے میں نظامانی کے حوالے سے کیا کرتے تھے۔

نظامانی صاحب کی باتوں سے پتہ چلا تھا کہ وہ بلوچستان کے نامور، بہت مشہور اور بلوچستان اور بلوچوں کی سب سے پہلی سیاسی تنظیم کاری کے بانی نواب یوسف علی خان عزیز کے ابتدائی رفیقوں میں شامل رہے ہیں۔ ان کی تصدیق ہر لحاظ سے ہوتی ہے۔ سب بلوچ سیاسی رہنما کارکن یہ تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ویسے حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ بلوچوں میں اس مہم کا آغاز جناب عبدالعزیز کرد نے کیا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے مستنگ میں سیاسی لکھے پڑھے اور ملازمین میں پوشیدہ تحریک اتحاد بلوچاں کے نام سے کام کیا تھا۔ بعدازاں جب یوسف علی خان کو لاہور کے کسی روزنامہ میں ایک مقالہ ''فریادِ بلوچستان'' کی اشاعت پر سرداری جرگہ نے سزا سنا دی۔ ایک سال قید اور دس ہزار روپے جرمانہ۔ انہیں مستنگ میں قید میں رکھا گیا تھا۔ یہاں عبدالعزیز کرد ان کے رفقا ملک فیض محمد اور عبدالکریم شورش اور ان کے ساتھیوں کا ان سے رابطہ ہوا۔ چنانچہ سزا کی مدت گزار کر جب یوسف عزیز رہا ہوئے تو انہوں نے کھل کر باقاعدہ ان رہنماؤں کے

ہمراہ سیاسی تحریک کا آغاز کیا۔اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ برٹش بلوچستان میں سیاست کی خشتِ اول محترم عبدالصمد خان شہید نے رکھی تھی۔ پھران سب کا آپس میں ملاپ ہوا۔

لگتا ہے کہ قادر بخش نظامانی ان سے پہلے بائیں بازو کی سیاست سے سندھ میں رہتے ہوئے رابطہ میں آچکے تھے۔یوسف علی خان کی سیاسی تنظیم کاری سے پہلے نظامانی اور محمد حسین عنقا کراچی میں باہم ملے تھے۔معلوم ہوتا ہے کہ عنقا صاحب اور نسیم تلوی صاحب کراچی میں اخبار نکالنے کی غرض سے گئے تھے۔ بلوچستان میں اخبار نکالنا تو کجا اخبار پڑھنا بھی جرم تھا۔ اخبار پڑھنا بھی F.C.R کے ضابطے کے تحت قابلِ سزا ہوا کرتا تھا۔تو عنقا صاحب نے اخبار کے لیے کراچی میں بہت کوشش کی تھی۔ چنانچہ شورش صاحب کے پاس جو فائل تھی اور جسے ہم نے جامعہ بلوچستان کے مرکز مطالعہ پاکستان کے لیے جناب کرار حسین صاحب کی مدد سے خرید لیا تھا تا کہ محقق حضرات اس سے استفادہ کرسکیں۔اس فائل میں مختلف اخبارات کے چند ایک شمارے موجود تھے۔ ظاہر ہے اس وقت تمام ہفت روزہ یا پندرہ روزہ اخبار ہوا کرتے تھے۔ یہ تھے البلوچ، بلوچستان، اتحاد بلوچاں، ینگ بلوچ وغیرہ وغیرہ۔

انہی دنوں عنقا صاحب بھی نظامانی کے زیر اثر بائیں بازو کی سیاست سے متاثر ہوئے۔ اور ایک طرح کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوئے۔اس وقت سندھ صوبہ بمبئی سے منسلک تھا۔اور سندھ کمیونسٹ پارٹی اسی صوبہ کی پارٹی تھی۔اور پھر اس کا دائرہ ان دو حضرات (عنقا اور نظامانی) کی وجہ سے بلوچستان تک پھیل گیا۔اسلم اچکزئی صاحب بھی اسی پارٹی سے منسلک ہوئے اور جیکب آباد میں زندگی گزاری۔

بہر کیف یہ سب باتیں اندازے سے لکھ رہا ہوں اور یہ تمام مسئلہ محتاجِ تحقیق ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے بائیں بازو کی سیاست کو بلوچستان میں پھیلانے میں قادر بخش نظامانی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔اور سوویت یونین سے بلوچستان کے لوگوں کی اثر پذیری پر اس کا دخل رہا ہے۔ویسے اس سے پہلے ابتدا مصری خان کھیتران اور ان کے رفقانے کی تھی۔ترکمانستان کے بلوچ زعما کریم خان اور سفر خان بھی ان کے ہمراہ 1920 کے مسلم اور مشرقی اقوام کی کانفرنس باکو میں

ایک ساتھ تھے۔پھر تحریک خلافت اور بلوچستان سے افغانستان اور پھر سوویت یونین ہجرت کرنے کے ارادے سے لوگوں کی افغانستان نقل مکانی ان سب باتوں نے بلوچستان کے لوگوں کو سوویت یونین اور بالشویک انقلاب کا مداح بنایا۔ہم نے تو بچپن ہی میں بالشویکوں، امان اللہ خان، مصطفیٰ کمال کی تعریفیں سنیں۔اور اپنے عام لوگوں میں ہجرت کے سال کے حوالے سنے۔لوگ جب کوئی واقعہ یاد دلاتے تو کہتے ”مہاجر یانی سالا“ مہاجرین کا سال......کا حوالہ دے کر بیان کیا کرتے۔

ہمارے قبیلہ اور گاؤں سے بھی چند ایک ہجرت کر کے گئے تھے۔

وقتاً فوقتاً نظامانی صاحب سے گفتگو کے دوران پتہ چلا ہے کہ ان کا قبیلہ نظامانی، میران سندھ (تالپوروں) کی حکومت کی عسکری قوت میں ہراول کا کام دیتا رہا ہے۔اور جب سندھ کی یہ حکومت ختم ہوئی تو انہیں بھی زک اٹھانا پڑی۔قادر بخش کے اجداد انہی لوگوں میں سے تھے۔ٹنڈو قیصر اُن کا گاؤں ہے۔شاید قیصر خان ان کے دادا رہے ہیں۔ بلوچی روایت کے مطابق ان کے ایک نواسے کا نام اب بھی قیصر خان ہے۔غلام محمد نظامانی کے بیٹے، جواب سب لندن میں رہتے ہیں۔قادر بخش نظامانی نے سندھ میں ایک کتابچہ لکھا ہے جس کا نام ہے؛ جنگ میانی۔میانی وہ آخری رزم گاہ ہے (حیدرآباد ڈسٹرکٹ میں) جہاں انگریزوں نے تالپوروں اور نظامانیوں کو آخری شکست دی۔اس کتابچہ کو پڑھ کر بلوچی کے مشہور شاعر مرحوم مراد ساحر نے اسی نام سے یعنی جنگ میانی کے عنوان سے بلوچی میں ایک طویل نظم لکھی ہے۔جو شاید ان کے پہلے شعری مجموعہ ”پاہار“ میں شائع ہوئی ہے۔میر پور خاص کے میر، اکثر نظامانیوں ہی میں رشتہ کرتے ہیں۔عبدالرسول نظامانی ان کے رشتہ دار ہیں اور قادر بخش نظامانی کی وفات کے بعد میر علی بخش تالپور کی نواسی سے شادی ہوئی ہے۔

قادر بخش ہی سے پتہ چلا تھا کہ ان کے والد نہایت دیندار عالم انسان تھے۔اور وہ مولانا عبیداللہ سندھی اور ان علما کی تحریک ترک موالات اور خلافت سے بہت متاثر تھے۔عبیداللہ سندھی افغانستان میں امان اللہ خان کے زمانے میں مہاجرین کے زعما میں سے تھے۔اور مولانا کفایت اللہ وغیرہ کے رفقا سے تھے اور روایت ہے کہ سوویت یونین ہو کر آئے تھے۔اور جناب لینن سے دیگر ہندوستانی رہنماؤں کے ہمراہ ملاقات کر چکے تھے۔جبکہ سب جانتے ہیں مولانا عبیداللہ ان مسلم علما

میں سے تھے جو نہ صرف سیکولر تھے بلکہ ترقی پسندی کے علاوہ سوشلزم کے نہایت مضبوط مداحوں میں سے تھے۔

شاید اسی ماحول نے قادر بخش کو بچپن ہی سے بائیں بازو کی جانب مائل کیا تھا اور بعد میں وہ ان لوگوں میں شامل ہوئے جو بالشویک تحریک اور سوویت یونین کے حامی تھے اور لوگوں کو مارکسزم کی طرف راغب کیا کرتے تھے۔ جن میں سے خود مرحوم یوسف علی خان شامل تھے اور انہوں نے محمد امین کھوسہ کو یہی تلقین کی ہے۔ جو "الحنیف" کے خصوصی نمبر میں ان کے چھپے ہوئے خطوط سے معلوم ہوا ہے۔

قادر بخش نوجوان تھے۔ ایک طرف سندھ میں تالپوروں اور نظامانیوں کی برطانوی استعمار کے خلاف جنگ نے قادر بخش کو قومی جذبہ دیا۔ وہ نہایت مستعد قوم پرست بلوچ تھے۔ دوسری طرف بائیں بازو کی سیاست نے جو مولانا عبیداللہ سندھی اور سندھ بلوچستان میں اس کے اثرات، نے انہیں سوشلزم کی طرف راغب کیا۔ اس امتزاج کی وجہ سے وہ یوسف علی خان اور ان کے رفقا سے جاملے اور ان کی تحریک میں شامل ہوئے۔

ماہتاک "سنگت" کوئٹہ، مارچ 1999

۳۰

جیکب آباد اور حیدر آباد میں دو بلوچ یا بلوچستان کانفرنسیں ہوئیں۔ لگتا ہے ان دونوں کانفرنسوں میں قادر بخش نظامانی اور محمد حسین عنقا دیگر ساتھیوں کے ہمراہ شامل تھے۔ صرف شامل نہ تھے بلکہ ان کا اہم رول رہا ہوگا۔ اس میں ایک سعیدی کی شرکت کا بھی ذکر ہے۔ جناب ڈاکٹر عنایت اللہ بلوچ نے اپنی خوبصورت اور مستند تاریخ میں ان کانفرنسوں کے بارے میں تحقیق کر کے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ ڈاکٹر عنایت اللہ کی یہ کتاب The Problem of Greater Balochistan (عظیم تر بلوچستان کا مسئلہ) کے نام سے چھپی ہے، جو ڈاکٹر صاحب کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے حقائق کو معلوم کرنے کے لیے کس قدر کوشش کی ہے۔ یہ کتاب چونکہ ہیڈلبرگ یونیورسٹی جرمنی میں لکھی گئی ہے، اس یونیورسٹی کا نام اور مقام دنیا بھر میں شہرت کا حامل ہے۔ اس کے ساتھ استاد اور علما بھی جید ہیں۔ کتاب میں ہر بات اسناد اور حوالے کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ان کانفرنسوں میں ایران سے ایک سعیدی کی شرکت کا ذکر ہے۔ میرے خیال میں یہ سعیدی قادر بخش نظامانی کے

دوست کریم بخش ہی ہوسکتے ہیں۔ جو ان حالات میں ان کے رفیق بنے تھے۔ بعد میں بزنجو صاحب بھی ان کی رفاقت میں شامل ہوئے۔ ان کی ایک یادگار تصویر تینوں کی.....قادر بخش..........کریم بخش اور غوث بخش..........ایک گروپ فوٹو..........نظامانی صاحب کے گھر میں اکثر آویزاں رہتی تھی۔ جب قادر بخش نے سوویت یونین جانے کا عزم کیا تھا تو وہ کوئٹہ سے نال (غوث بخش کے پاس) پھر وہاں سے اونٹ کے ذریعہ راسک ایران اور پھر شاید سرخس کے راستے ترکمانستان ہوتے ہوئے ماسکو پہنچے تھے۔

کراچی اس صدی کے تیسرے عشرے میں بلوچستانی سیاسی جلاوطنوں اور سیاسی کارکنوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ برطانوی افسروں نے تو ابھرتی ہوئی سیاست کو جلاوطن کر دیا تھا۔ مگر کراچی میں یہ سیاست خوب پروان چڑھ رہی تھی۔ اس میں ہر طبقے کے عناصر شامل ہو رہے تھے۔ علما، انگریزی لکھے پڑھے جوان.....محنت کش.....اور کاروباری لوگ.....محمد حسین عنقا.....نظامانی.....نسیم تلوی کے علاوہ لیاری کے دانشور اور علما اس تحریک سے جو یوسف علی اور عبدالعزیز کرد اور عبدالصمد اچکزئی کے نام سے پہچانی جاتی ہے، متاثر ہو رہے تھے۔ لیاری کے مشہور عالم مولوی محمد عثمان صاحب اور ان کے دیگر علما احباب.....عبدالصمد سربازی، (بہت سارے اور حضرات بدقسمتی سے مجھے ان کے نام یاد نہیں آرہے..... مجھے اس کا افسوس ہے.....ان کی فکر اور خدمات کی ناقدری نہیں بلکہ بدقسمتی ہے.....) مولوی خیر محمد ندوی صاحب، بلوچی کے نامور ادیب اور محقق عبدالصمد امیری کے والد محترم اور کئی علما.....اور بہت مشہور بلوچی قوم پرست اور لیاری کے سیاسی رہنما غلام محمد نور دین صاحب بھی اس تحریک کے روحِ رواں رہے تھے۔

مجھے یاد ہے جب میں دوسری کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ 1932ء کی شاید بات ہے۔ جب میں نیا نیا سکول میں بٹھایا گیا تھا تو نوشکی میں ہمارے لوئر مڈل سکول میں مولوی محمد عثمان صاحب کراچی سے تشریف لائے تھے۔ وہ نوشکی اپنے اخبار کے لیے خریدار ڈھونڈنے آئے تھے۔ مجھے ان کی پگڑی جو پشاوری تھی جسے نوشکی میں صابونی لنگی کہا کرتے تھے۔ ان کی خوبصورت اور چھوٹی داڑھی یاد ہے۔ چالیس پینتالیس برس کے لگ بھگ تھے۔ ان کے اخبار کا نام میرے خیال میں ''البلوچ''

تھا یا ''اتحادِ بلوچاں''۔ اسی طرح ہمارے سکول میں نسیم تلوی صاحب بھی آئے تھے۔ وہ بھی ایسے ہی مقصد کے لیے۔

غلام محمد نور دین کا نام بہت مشہور ہے۔ اسی طرح مولوی عثمان صاحب۔ یہ سب سامراج دشمن اور آزادی پسند اور ترقی خواہ انسان تھے۔ لوگوں کے اور بالخصوص غریب اور پسماندہ بلوچستان کے لوگوں کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس زمانے میں کراچی کا لیاری کا علاقہ خصوصاً چاکی واڑہ اور گل محمد لین بلوچ سیاسی کارکنوں کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ محمد حسین عنقا، قادر بخش نظامانی اور نسیم تلوی ایسی ہی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ پرانے اخبارات کی فائلوں اور عبدالصمد خان مرحوم کے خطوط سے ان باتوں کا پتہ چلتا ہے جو وقتاً فوقتاً پریس اور اخبارات کے معاملات میں..........عنقا، قادر بخش اور تلوی سے خطوط کے ذریعے مشورہ کرتے۔

عنقا اور نظامانی کے تعلقات نہایت قریبی اور گہرے تھے۔ جو بہت دیر تک جاری رہے۔ اور بعد میں بلوچ لیگ کی صورت میں نمودار ہوئے۔ ویسے عنقا صاحب بلوچی کے ادیب تھے۔ اور ڈاکٹر عنایت اللہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے قادر بخش سے مل کر ایک بلوچی اکیڈمی بھی تشکیل دی تھی۔ اور بلوچی زبان میں پڑھانے کا پروگرام بنایا تھا۔

۳۱

قارئینِ کرام''سنگت'' سے معافی کا طلب گار ہوں...........کافی عرصہ سے آپ کولٹ خانہ کے بارے میں انتظار میں رکھتا آیا ہوں۔ اور یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ ذہنی کیفیت نے اس قابل ہی نہیں رکھا کہ قلم اٹھا کر چند صفحات سیاہ کرسکوں۔ اب بھی کیفیت بدستور رہی ہے۔لیکن ایک ایسے انساں کے بار بار کہنے پہ مجبور ہوکر پھر لکھنا شروع کیا ہے۔ وہ انسان جناب ڈاکٹر شاہ محمد مری ہیں۔ان سے بے حد محبت ہے۔محبت کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ دعا کریں لٹ خانہ اپنے اختتام تک جاری رہ سکے۔

عبداللہ جمالدینی

1954 کا سال تھا۔اپنے محترم اور بزرگ ساتھیوں سے اختلاف کر کے ایک پارٹی کا پروگرام بنا کر اس کا اعلان کر دیا اور اس کا منشور بھی چھاپا۔ یہ پارٹی'' دیماروُک اولس'' کے نام سے بنی۔اُن دنوں ہفت روزہ'' نوائے وطن'' کوئٹہ...........گل خان نصیر کی ادارت سے نکل کر غلام محمد شاہوانی کی ادارت میں آیا۔اور مجھے بدستور نائب مدیر رکھا گیا۔'' دیماروُک الس'' کا منشور بطور

اداریہ کے غلام محمد نے لکھ کر اخبار میں شائع کیا۔ ساتھ ہی اخبار میں اس پمفلٹ کو جو'' ہمارا بلوچستان'' کے عنوان سے پہلے شائع کیا تھا...........دوبارہ چھاپا۔

انہی دنوں مرحوم سید ظہور شاہ ہاشمی اور جناب عبدالصمد امیری صاحب بھی کوئٹہ تشریف لائے تھے۔ وہ بلوچی زبان کے لیے اپنے پروگرام کے تحت کام کے لیے کراچی سے نکل کر دورہ کر رہے تھے۔ وہ گل خان نصیر سے بھی ملے اور ہم سے بھی۔انہوں نے'' بلوچی سر چمک'' کے نام سے ادبی انجمن کراچی میں بنائی تھی۔ جناب قادر بخش نظامانی صاحب بھی کوئٹہ آئے تھے اور تہران جانے کا ان کا پروگرام تھا۔ ایران انقلاب کے لیے تیار ہو رہا تھا۔اور ایسے وقت میں اکثر نظامانی صاحب کو انقلابی دورے پڑ جاتے تھے۔وہ بے چین ہو جاتے۔

میں شیر محمد، بہادر خان تین کا ٹولہ کوہلو کے لیے روانہ ہوئے۔ بہادر خان کوہلو سے چند عرصہ پہلے تحصیلداری کے عہدے سے مستعفی ہوئے تھے۔اور ہم مشرقی بلوچستان کا دورہ کرنا چاہتے تھے۔ بہادر خان کوہلو میں تحصیلدار رہے تھے اور وہاں کے لوگ ان کے اوصافِ حمیدہ سے بخوبی آگاہ تھے۔وہ دورانِ ملازمت جہاں بھی رہے لوگوں میں مقبول رہے تھے۔اب'' دیماروُک الس'' کے صدر بنائے گئے تھے اور کنوینگ باڈی کے رہبر تھے۔

کوہلو دیکھنے کا عرصہ سے شوق تھا۔مست توکلی کے بارے میں اور ان کی شاعری کے اوصاف پہلے ہی سن چکا تھا۔اور ان کی شاعری نے مجھے مریوں اور ان کی سرزمین کی خوبصورتی کا گرویدہ بنایا تھا۔کوہلو میں شیر محمد کے گھر مہمان تھے۔ان کے بھائیوں، رشتہ داروں سے ملے۔کوہلو کی تحصیل دیکھی۔تاج محمد مری کے گاؤں گئے۔انہوں نے دعوت کی تھی۔صورت خان کا گاؤں بھی وہیں ہے۔وہ اور شیر محمد ایک ہی خاندان سے متعلق تھے۔مگر ان دنوں حسب بلوچی روایت دونوں خاندانوں میں فتح خانزئی اور شربت زئی میں ناراضگی اور ناچاکی تھی۔بہر کیف یہ لوگ بہادر خان کے دوست تھے۔ان کے لیے یعنی بہادر خان کے لیے دونوں برابر تھے۔

شیر محمد مری نے مست توکلی کی آرام گاہ پر لے جانے اور دکھانے کا بندوبست کیا جو کوہلو تحصیل سے 20 میل کے فاصلہ پر ہے۔گھوڑے کی سواری سے نابلد تھا۔بچپن میں جبکہ ہمارا بھی

گھوڑا ہوا کرتا تھا، سواری کی تھی اور اس سے گرا بھی تھا۔ مست توکلی کی زیارت متاثر کن تھی اور وہاں جگہ جگہ مری مرد وزن کی عقیدت مندی کے نشانات تھے۔ سمو سے متعلق مست توکلی کی محبت کے آثار بھی وہیں ملے۔

کچھ دن (دو تین روز رہ کر) گھوڑوں پر سڑک کے راستے بارکھان روانہ ہوئے۔ راستے میں جاندران اور اس کے آس پاس کے علاقہ کو دیکھا۔ سردار انور جان کھیتران کے مہمان تھے۔ پھر رکھنی سے ہوتے ہوئے فورٹ منرو بس کے ذریعے گئے۔ فورٹ منرو کو مقامی لوگ نمرو کہتے ہیں۔ یہ کوہِ سلیمان کی آخری جنوبی شاخ پر واقعہ ہے۔ یہاں کا نظارہ نہایت حسین ہے۔ بارش ہوئی تو فضا نکھر گئی۔

فورٹ منرو میں ایک محرر اور ایک ماسٹر یار محمد صاحب اور لیویز کے دفعدار کمال خان ہمارے ہم خیال ساتھی تھے۔ ان کے ہاں مہمان ہوئے۔ وہ بہت جوشیلے بلوچ تھے۔ ان کا تعلق لغاری قبیلہ کی ہدیانی شاخ تھا۔

اگلے روز وہاں کے کمشنر سردار میر عطا محمد خان لغاری سے ملاقات کی۔ بہت ہی شریف اور سنجیدہ انسان تھے۔ ان میں بڑائی نہیں تھی۔ بڑی داڑھی ان کی تھی اور خاکی بوشرٹ اور پینٹ میں تھے۔ معلوم ہوا وہ سردار فاروق لغاری کے چچا تھے۔

اگلے روز سخی سرور کی زیارت کے راستے بس سے ڈیرہ غازی خان روانہ ہوئے۔ کوہِ سلیمان کا یہ حصہ بھی بہت خوبصورت اور دلچسپ ہے۔ کوہِ سلیمان کے گرد بلوچ اور پشتون قبائل آباد ہیں۔ پشتون والا حصہ کمال خان شیرانی کے ہمراہ ڈیرہ اسماعیل خان سے ژوب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر ایک ماہ کمال خان شیرانی کے گھر رہ کر کوہِ سلیمان کے دامن کا خوب نظارہ کیا تھا۔ وہاں سے تختِ سلیمان خوب نظر آتا ہے۔ وہ حصہ اس عظیم اور باوقار پہاڑ کا نہایت سرسبز و شاداب اور بہت خوبصورت ہے۔

ڈیرہ غازی خان پہنچے تو ماسٹر محمود خان بزدار کو ڈھونڈتے رہے۔ وہ ہفت روزہ ''بلال'' ڈیرہ غازی خان کے ایڈیٹر تھے۔ میں ان سے سکول کی طالب علمی کے زمانہ سے واقف تھا۔ جب وہ

پشین سکول میں میرے اساتذہ سے ملنے آتے اور ان کے یہاں ٹھہرتے۔ ان اساتذہ کا تعلق ڈیرہ غازی خان کے علاقہ تونسہ شریف سے تھا اور وہ بلوچ تھے۔

جناب محمود خان بزدار صاحب جواب مولانا بلال کے نام پر مشہور ہیں، نے ہمیں اپنے اخبار کے دفتر میں ٹھہرایا۔ بڑی محبت سے ملے اور خدمت کی۔ وہ نہایت مخلص اور مہربان انسان ہیں۔ شاید اب تک حیات ہیں۔

ڈیرہ غازی خان میں کئی لوگوں سے ملاقات کی۔ اس وقت ہم یہی سوچتے تھے کہ ڈیرہ کے بلوچوں اور بلوچی علاقوں کو بلوچستان سے ملایا جائے اور اس طرح انہیں اس کے لیے قائل کیا جائے۔ مگر یہ منشا ناکام ہوا۔ ایک نوجوان وکیل کھوسہ نے ہمیں صاف بتایا کہ پنجاب کا ترقی یافتہ صوبہ چھوڑ کر ہم کیوں بلوچستان کے پسماندہ علاقہ میں شامل ہوں۔ اس کے لیے ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

کچھ دن ڈیرہ غازی خان میں رہ کر واپس سخی سرور............ رکھنی............ رڑکن کے راستے لورالائی روانہ ہوئے۔ لورالائی پہنچے تو فضا بدل گئی تھی۔ میں بھول گیا کہ کوہلو ہم لورالائی سے ہو کر گئے تھے۔ اور وہاں ایک دو روز ایک پشتون (کاسی) ملازم کے یہاں قیام کیا تھا۔ بعد میں سی آئی ڈی نے انہیں پریشان کیا تھا اور اب وہ مجبور ہو کر ہمیں اپنے پاس ٹھہرا رہے تھے۔ ان کے انداز سے واضح تھا۔ وہاں ایک دو رات رہ کر پھر کوئٹہ اور لٹ خانہ پہنچے۔

۳۲

لٹ خانہ کے شب و روز حسبِ دستور تھے۔ رات کو غلام محمد شاہوانی، انجم قزلباش، خدائیداد، اگر کمال خان شیرانی، بہادر خان اپنے اپنے علاقوں سے آئے ہوئے ہوتے تو وہ بھی شامل ہوتے۔ حبیب اللہ، مستری محمد غوث اپنے ٹھکانے آ جاتے۔ محمد اکبر نوشیروانی، عبدالرزاق ڈراسی اور بعض اوقات غلام جان شاہوانی کے ماموں محمد حیات اور اگر آس پاس کے ہمسایہ جنہیں ہم سے دلچسپی ہوتی، آتے اور خوب گپیں ہوتیں۔ بلکہ خوش گپیاں۔ ہر قسم کا تبادلہ خیال ہوتا۔ سب خوش اور بہت خوش ہوتے۔ ہنستے اور غلط حالات اور ماحول کا مذاق اڑاتے۔ بہر کیف، میرے خیال میں اس وقت کوئٹہ میں ہم اپنے کو سب سے زیادہ خوش بخت، خوش نصیب اور خوش ترین انسان تصور کرتے تھے۔ اگر چہ بہت سارے لوگ ہمارا مذاق اڑاتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ بلوچستان کے چند لکھے پڑھے نوجوانوں نے اپنی زندگیاں تباہ کر دی ہیں۔ ملازمت میں رہتے تو لوگوں کے لیے کچھ کام کرتے۔

فکرِ ہر کس، بہ قدر ہمت اوست

سرکار نے ہمیں نشانہ بنایا تھا۔ دن رات سی آئی ڈی پیچھے رہتی، ہم بے پرواہ تھے۔ پاکستان بھر میں اس نئی فکر نے نوجوانوں کو متاثر کیا تھا۔

نوجوانی بھی عجیب نعمت ہے۔ ناداری اور نیستی کی کوئی فکر نہ تھی۔ بچوں، اہلِ خانہ اور گھر بار کا کوئی خیال نہ تھا۔ صحت مند تھے۔ تھکاوٹ اور دن بھر کی سرگرمیوں سے نہ تھکتے، نہ آزردہ خاطر ہوتے...... پُرعزم، باہمت اور لگن سے سرشار تھے۔

لٹ خانہ میں ہر ایک، خوش گپیوں کے بعد کسی نہ کسی اچھی کتاب، رسالہ اور اخبار کو لے کر پڑھنے میں مصروف ہوتا۔ دن کو طلبا اور ہم فکر لٹ خانہ آتے جاتے اور کتابیں پڑنے کے لیے لے جاتے اور خوش رہتے۔ پڑھ کر کتابیں واپس کرتے، پھر اور لے جاتے۔ روز بہ روز ان کی فکر میں شگفتگی اور جدت پیدا ہوتی۔

یہ دور بھی عجیب دور تھا۔ انقلابوں، آزادی کی تحریکوں، استعمار اور سامراج، طبقاتی جدوجہد کا دور۔ جہاں کہیں لوگ ظلم و جبر کے خلاف لڑتے ان سے ہمدردی تھی اور ان کی بہادری کے گن گاتے۔

قریب ہی ایران میں انقلابی سرگرمیوں اور جدوجہد میں شدت آ گئی۔ پروگریسو قوتوں میں ابھار تھا۔ ایران سے پروگریسو لٹریچر آتا۔ پتہ چلا کہ شہنشاہ کو دیس نکالا ملا۔ ان قوتوں نے مل کر اسے ملک بدر کر دیا اور وہ اٹلی چلے گئے۔ ڈاکٹر محمد مصدق کی تودہ پارٹی اور حزبِ جمہوریت ملی ایران ان قوتوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ حزب، تودہ اور ڈاکٹر محمد مصدق کی پارٹی اور لوگوں کے جمِ غفیر نے شاہ کو باہر کر دیا تھا۔ ڈاکٹر حسین فاطمی ڈاکٹر مصدق کی صدارت میں وزیر خارجہ بنے۔ سب نے مل کر اپنا کام یہ کرنا چاہا کہ ایران کی سب سے بڑی دولت تیل کو برطانوی کمپنیوں سے چھین کر ملی بنائیں۔ حسین کاظمی کا بڑا پرچا تھا۔ استعماری قوتوں کو آگ لگ گئی۔ تیل سامراج اور ان قوتوں میں شاہ رگ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے کیوں کر ہاتھ سے جانے دیتے۔ یہاں ایران کے عوام عجیب خواب دیکھ رہے تھے۔ غربت سے چھٹکارے کا خواب۔ ناخواندگی اور امراض اور ہر طرح کے عفریتوں سے نجات کے خواب۔ یزدان اور اہرمن کی جنگ زوروں پر تھی۔

امریکی سی آئی اے جو پہلے ہی سے ایسے حالات کو تباہ کرنے کے لیے منظّم اور آمادہ تھی۔ فوراً شاہ کی حمایت کے لیے آن پہنچی۔ ڈلس جو سی آئی اے کا مضبوط اور چالاک سربراہ تھا، فوراً روم پہنچا اور شاہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا، ”مرد بنو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ایسے انقلاب کو تباہ کردیں گے“۔ چنانچہ سی آئی اے نے ایسا ہی کیا۔ ایران کے جنرل زاہدی کی پوری مدد کی اور ہتھیاروں کے علاوہ ڈالر کی تھیلیاں اس کے حوالے کیں اور اسے بتایا کہ غنڈوں، بدمعاشوں، قاتلوں اور وہاں کے بدنام چاقو کشوں کو تہران کے بازاروں میں ڈالر اور چاقو دے کر قتلِ عام کا بازار گرم کرو اور جہاں کہیں کوئی ترقی پسند، انسان دوست اور وطن پرست اور عوام دوست ملے یا مزاحمت کرے، اس کی آنتیں باہر نکال دو۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایران کے بڑے شہروں میں خون کی ندیاں بہیں۔ جنرل زاہدی نے ڈلس کی مدد سے تودہ اور مصدق کا انقلاب تباہ کردیا۔ حسین اعظمی کو عدالت ہی میں چھرا گھونپ کر مار دیا گیا۔ تودہ کے لیڈروں کو تیر باران (Firing Squad) کے آگے گولیاں برسا کر ختم کیا۔ پارٹی لیڈروں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ڈاکٹر محمد مصدق کو پسِ زنداں ڈال دیا تا آنکہ وہ فوت ہوئے۔

ڈاکٹر خدائیداد اور تو کچھ نہ کرسکے۔ ارواح شاد کی کسی ایرانی رسالہ میں شائع شدہ تصویر کا پنسل سکیچ بنایا اور لٹ خانہ کی ایک دیوار پر آویزاں کردیا۔

انھی ایام میں ایک نوجوان کوئٹہ میں نمودار ہوئے اور نوائے وطن کے دفتر پہنچے۔ یہ خوبرو نوجوان امان اللہ بارکزئی (باران زئی) تھے۔ وہ نہایت ذہین اور بے قرار نوجوان تھے۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ بلوچ تاریخ کی ایک بہت ہی مشہور شخصیت سردار دوست محمد خان (دوز محمد خان) باران زئی کے پوتے ہیں۔ ان کے والد کا نام میر یعقوب خان ہے اور والدہ کی طرف سے وہ ایک اور مشہور بلوچ شخصیت کریم بخش سعیدی کے بھانجے ہیں۔ سعیدی کا ذکر قادر بخش نظامانی اور غوث بخش بزنجو کے حوالے سے بار بار آیا ہے۔ اسی طرح یوسف علی مگسی کے حوالے سے بھی اکثر ان کا ذکر ہوتا ہے۔ ان اسناد نے انہیں بہت اہم بنایا اور ان رشتوں کی وجہ سے وہ باشعور اور سیاسی فکر کے حامل ہوئے۔ نہ جانے کیسے انہیں نوائے وطن اور لٹ خانہ کی خبر ملی ہوگی۔

محمد مصدق اور حزب تودہ کی ناکامی کی وجہ سے وہ تہران یونیورسٹی (کیونکہ وہاں تحصیلِ علم کررہے تھے اور حزب تودہ کی طلبا شاخ سے متعلق ہوئے تھے) سے زاہدان کی راہ کوئٹہ پہنچے تھے۔ وہاں طلبا کے پاس انہیں نوائے وطن کے کچھ شمارے ملے تھے۔ اس سے انہیں پتہ چلا ہوگا۔

امان اللہ بارک زئی کا پروگرام تھا کہ وہ ایک ٹائپ رائٹر حاصل کرکے افغانستان کی راہ سرحد پار کرکے کہیں باہر یورپ میں اپنی حزب کے رفیقوں سے جا کر ملے۔ مگر اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب نہ ہوسکے اور نہ ہی ہم ان کی کوئی مدد کرسکے۔ مگر بعد میں انہیں کوئٹہ اور بلوچوں کی رفاقت اور لٹ خانہ کا ماحول راس آئے۔ جب ہم کراچی منتقل ہوئے؛ آزاد جمالدینی، میں، غلام محمد شاہوانی (جو سردار خان گشکوری کے ہمراہ ان کی بلوچ تاریخ کی اشاعت میں مددگار کی حیثیت سے گئے تھے)۔ وہاں امان اللہ سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ وہ آزاد جمالدینی کے مشہور مجلّہ، ماہنامہ بلوچی کے دفتر میں آتے اور اس میں قلمی اشتراک کرتے۔ سردار خان کے توسط سے ان کا تعارف مشہور بلوچ انقلابی لیڈر جمعہ خان بلوچ سے ہوا تھا۔

ان دنوں شاہ ایران کے خلاف بغداد سرگرم عمل تھا۔ ایران سے کئی حکومت مخالف بلوچ زعما بغداد پہنچے تھے۔ جن میں میر عبدی خان مشہور تھے جو امان اللہ اور حاجی کریم بخش سعیدی کے قریبی رشتہ دار تھے۔ چنانچہ سردار خان، جمعہ خان اور امان اللہ نے خفیہ پروگرام بنایا کہ اس صورتحال سے استفادہ کیا جائے۔ جمعہ خان کراچی چھوڑ کر بغداد پہنچ گئے۔ امان اللہ بارکزئی جاتے جاتے شاہ ایران کی خفیہ ایجنسی ساواک کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ امان اللہ کو بڑی اذیتیں نصیب ہوئیں۔ اور ان کی شخصیت کو ساواک نے مسخ کرکے چھوڑ دیا۔ امام خمینی کے انقلاب میں ہی امان اللہ فرار ہوکر کراچی آئے۔ بہت عرصہ کراچی میں رہنے کے بعد بالآخر ایران کی موجودہ حکومت سے ان کا سمجھوتہ ہوا۔ کوئٹہ کے راستے یران اور پھر اپنے گھر سراوان گئے۔ اب وہاں موجود ہیں اور خاموشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ دو محترم اساتذہ کی بہت ہی مخلصانہ اور ہمدردانہ وابستگی لٹ خانہ اور اس کے مکینوں سے تھی۔ ایک استاد محترم چوہدری عطا محمد صاحب تھے۔ (یہ وہ چودھری عطا محمد

صاحب نہ تھے جو سنڈیمن سکول کے نامی گرامی اور ہاکی کے مشہور کھلاڑی تھے۔ بعد میں محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر ہوئے)۔ یہ چودھری صاحب مشرقی پنجاب کے جالندھر کے مہاجر تھے۔ وہ کوئٹہ میں استاد ہوئے۔ انہیں لٹ خانہ کے قریب میکانگی روڈ کے پاس ایک گلی میں متروکہ مکان الاٹ ہوا تھا۔ مکان کیا تھا، سابقہ رام گڑھ کے ہندو یا سکھ بیچارے کا مکان جلایا گیا تھا۔ اس جلے ہوئے مکان کی تین چار فٹ کی دیواریں باقی تھیں۔ کیونکہ تقسیم ہند سے پہلے کوئٹہ میں زلزلہ کے بعد زلزلہ پروف مکانات تعمیر ہوئے۔ جنہیں چھ یا سات ٹائپ کے مکان کہا جاتا تھا۔ لٹ خانہ ہی کی طرح تین چار فٹ پکی اینٹوں کی ایک اینٹ کی دیواریں بنا کر پھر چادریں لگادی جاتی تھیں اور ان میں سیمنٹ اور کنکریٹ بھر دی جاتی تھی۔ اوپر گتوں کی سیلنگ اور پھر چادر کی چھت ہوتی۔ یہ بھی فساد میں جلا دیے گئے۔ اور جو باقی بچا تھا وہ غریب مہاجرین کو الاٹ کر دیے گئے۔ چودھری صاحب کے حصے میں ایسا مکان ہی آیا تھا۔

چودھری صاحب ازراہِ محبت لٹ خانہ کے ساتھیوں کے لیے دعوت کرتے۔ دال، روٹی اور چاول۔ میں، خدائیداد، اور انجم وہاں جا کر کھاتے۔ ان کی ایک خوبصورت بچی تھی، جسے وہ کاکی کہہ کر پکارتے اور پیار کرتے۔ ان کے شاید دو لڑکے تھے، جو پڑھتے تھے۔ چودھری صاحب اکثر لٹ خانہ آتے تھے۔ وہ تپ دق کے مریض رہ چکے تھے۔ اب علاج کر کے بہتر ہوئے تھے۔ پھیپھڑوں میں تناؤ اور سختی پیدا ہوئی تھی۔ سانس مشکل سے لیتے۔ چہرے پر چیچک کے نشانات تھے۔ بال سیاہ سفید تھے۔ چھوٹی سی داڑھی رکھتے تھے۔ پھر ان کا تبادلہ مستونگ کے ہائی سکول میں ہوا۔ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ فکری اور سیاسی شعور اپنے شاگردوں کے ذہنوں میں منتقل کیا کرتے۔ ان سے اپنے بیٹوں جیسا سلوک کیا کرتے۔ ان شاگردوں میں کئی ہونہار اور ذہین نوجوان پیدا ہوئے۔ ان میں روشن خیالی نے نشوونما پائی۔ ان میں ایک مشہور سیاسی کارکن عبدالحق اور ان کے بھائی ڈاکٹر لطیف محمد شہی ہیں۔ اسی طرح بلوچستان کے نامی گرامی سیاسی لیڈر میر محمود جان گُرد تھے۔ جب کبھی مستنگ سے آتے تو لٹ خانہ ضرور آتے اور اپنے روشن خیال شاگردوں کو لٹ خانہ جانے اور لٹ خانہ والوں سے ملنے اور ان کی فکر سے استفادہ کرنے کی تلقین کیا کرتے۔ ان کے شاگرد جب

مستونگ ہائی سکول سے میٹرک پاس کر کے کوئٹہ کے کالج کے ہاسٹل میں پہنچتے تو اکثر لٹ خانہ آتے۔ کتابیں لے جا کر پڑھتے اور طلبا میں اپنے ہم خیال پیدا کرتے۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ چودھری صاحب کے ایک بیٹے نے انجینئرنگ پاس کیا۔ اور ایس ڈی او اور اس سے بھی بڑے عہدے تک پہنچے۔ بدقسمتی سے عین جوانی میں ان کا ایک حادثہ میں انتقال ہوا۔ اس کا شدید صدمہ چودھری صاحب کو ہوا۔

کاکی بڑی ہوگئی تھی۔ اس کا رشتہ کسی قابل نوجوان سے ہوا جو کسی اچھے عہدے پر فائز ہو کر اسلام آباد بھیجے گئے۔ آسودہ حال تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ چودھری صاحب کو ساتھ اسلام آباد میں رکھیں لیکن چودھری صاحب نے گوارا نہ کیا اور کراچی جا کر اپنے انجینئر بیٹے کے خریدے ہوئے گلشن اقبال کے اس پلاٹ میں رہنے لگے، جو خالی پڑا تھا۔ اس میں ایک جھونپڑی بنا کر رہنے لگے۔ اس میں ایک نہال خانہ (نرسری) بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اور اسی میں مصروف رہے۔

ستر کے عشرے میں جب میں پھر کراچی سے آ کر کوئٹہ میں رہنے لگا۔ (افسوس کہ میں کراچی میں جتنا عرصہ رہا مجھے علم نہیں ہوا کہ چودھری صاحب وہیں ہیں۔ نہ ان کو پتہ چلا کہ میں کراچی میں ان کے قریب لیبر کالونی میں رہا کرتا تھا۔ بعد میں یہ معلوم ہوا تو مجھے بہت دکھ اور شرمندگی ہوئی کہ میں نے کسی سے کوئٹہ میں ان کے بارے میں نہیں پوچھا تھا)۔

ایک روز جا گئے ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر انجم قزلباش سے ملنے جانا ہوا تو انہوں نے ایک پرزہ محترم چودھری عطا محمد صاحب کا پڑھنے کو دیا۔ اس چھوٹے سے پرزہ پر انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ہم ان کی نرسری کے لیے چند پودے دیے ہوئے ایڈریس پر بھیج دیں۔

اُن کا حکم سر آنکھوں پر۔ چنانچہ پروگرام بنا کر میں، انجم صاحب اور عبدالحق محمد شہی نے محکمہ زراعت کے نہال خانہ جا کر مطلوبہ پودے حاصل کر کے فوراً ان کے دیے ہوئے ایڈریس پر بھجوا دیے۔

چند روز بعد میں اور محترم عبدالحق محمد شہی نے کراچی جانے کا تہیہ کیا۔ ایڈریس ساتھ لیا۔

کراچی جا کر عبداللہ جان کاسی کے یہاں ٹھہرے۔ وہاں میرے عزیز ترین دوستوں میں سے سلام صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ سی مین کمپنی کے کارخانہ میں کام کرتے تھے۔ کام سے فارغ ہو کر وہ اکثر عبداللہ جان کاسی کے پاس جایا کرتے۔ وہ ان کے کارخانہ کے قریب سائٹ پر حبیب چوک کے پاس تھے۔ سلام صاحب سے گزارش کی کہ ہمیں چودھری صاحب کے ایڈریس کے مطابق ان سے ملنے کے لیے لے جائیں۔ سلام صاحب نے بڑی تلاش کے بعد وہاں پہنچا دیا۔ پلاٹ جواب نرسری میں بدل دیا گیا تھا، اس کے عین سامنے ایک پان بیڑی سگریٹ والے کا خوانچہ تھا۔ ان سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ چودھری صاحب اس وقت پاس ہی کسی ہوٹل میں کھانا کھانے چلے گئے تھے۔ ہم وہاں ان کا انتظار کرتے رہے۔ رات کا وقت تھا۔ تھوڑی دیر بعد چودھری صاحب تشریف لائے۔ ہمیں دیکھ کر حیران ہوئے۔ اور بے حد خوشی سے ہم دونوں سے یکے بعد دیگرے لپٹے اور چومتے رہے۔ بے حد خوش تھے۔ ہمیں نرسری کے احاطہ میں لے گئے۔ وہاں گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی میں لے گئے۔ اور خود ہمارے لیے چائے لینے چلے گئے۔ سلام صاحب ساتھ تھے۔ حال احوال کے بعد ہم نے جانے کی اجازت چاہی۔ چودھری صاحب نے کھانا کھلایا۔ بہت ہی لطف آیا۔ وہاں پاس ہی جھونپڑی میں دس دس پونڈ کے دو ڈالڈا گھی کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ فرمانے لگے، یہ تم دونوں کے لیے ہیں، یہ ساتھ لے جاؤ۔ ہم نے معذرت کی۔ اسے خوامخواہ کی تکلیف قرار دیا۔ مگر چودھری صاحب کہاں مانتے۔ آخر مجبوراً اپنے اپنے ڈبے لے کر چودھری صاحب سے اجازت مانگی۔ انہوں نے پھر نہایت پیار سے ہمیں رخصت کیا۔ ہم سیدھے سٹاپ پہنچے۔ اور بس میں بیٹھ کر سائٹ عبداللہ جان کاسی کے یہاں پہنچے۔ وہ گھی کے ڈبے دیکھ کر حیران ہوئے۔ اور پوچھا کیا یہ کوئٹہ لے جاؤ گے؟ ہم نے کہا جی ہاں۔ یہ محبت کی نشانی ہے ہمارے معزز اور معمر ساتھی کی۔

بس چودھری عطا محمد سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد نہیں مل سکے۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ زندگی کے بقیہ ایام انہوں نے کیسے گزارے۔

دوسری محترم شخصیت تمکین احمد صاحب کی ہے۔ (اُس وقت ہمیں معلوم نہ تھا کہ ان کے نام کے ساتھ لفظ عباسی کا اضافہ بھی ہے۔ یہ تو اب پتہ چلا ہے)۔

تمکین صاحب بھی ٹیچر تھے۔ نوجوان اور خوبرو اور پرکشش۔ جس کی وجہ سے خدائیداد صاحب انہیں تمکین کے بجائے نمکین کہہ کر پکارتے۔

تمکین صاحب کا خاندان بھی تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان پہنچا تھا۔ تمکین صاحب کا کہنا ہے کہ ان کا تعلق دہلی کے قریب بلند شہر سے تھا۔ وہ نہایت ہی کم عمری میں پاکستان پہنچے۔ شاید تعلیم بھی یہیں پاکستان میں مکمل کی اور ٹیچر ہوئے۔ اس دوران وہ کوئٹہ پہنچے۔ ان کی لٹ خانہ والوں میں سے سب سے پہلے غلام محمد شاہوانی سے ملاقات ہوئی۔ ایک روز وہ لٹ خانہ آئے۔ انہوں نے بوشرٹ اور پینٹ پہنا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ میں نے انہیں لٹ خانہ کے وڈ وہٹ میں لے کر جا بٹھایا۔ وہاں ایک دوسرے پر رکھے ہوئے ہمارے بستروں پر انہوں نے تکیہ لگایا اور بیٹھ گئے۔ کتاب میں نے اٹھا کر دیکھ لی تو پینگوئن کی چھاپی ہوئی لیو ٹالسٹائی کی مشہور کتاب ''اینا کرانینا'' تھی۔ یہ کتاب بہت بعد میں نے اس وقت پڑھی جب میں یونیورسٹی میں استاد لگا۔ بے حد پسند آئی۔ ٹالسٹائی کے افسانے میں نے بہت پڑھے تھے۔

پتہ چلا کہ تمکین صاحب کو ادب اور ترقی پسند ادب سے لگاؤ ہے اور شاید دیگر مضامین کے علاوہ انگریزی پڑھاتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ تمکین صاحب کئی سال داؤد ہائی سکول قلات میں پڑھاتے رہے ہیں۔ اور ان کے شاگردوں میں کئی ایسے شاگرد تھے جنہوں نے بعد میں نام پیدا کیا اور بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان میں سے سرفہرست پروفیسر بہادر خان رودینی ہیں۔ جو بعد میں بلوچستان یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ ہوئے۔ بہادر خان صاحب نہایت خلیق، مخلص، محترم، غریب پرور، دیانتدار اور انسان دوست استاد رہے ہیں۔ یونیورسٹی میں ان کا شمار بہترین استادوں میں ہوتا رہا ہے۔ میری ان سے بہت ہی زیادہ قربت رہی ہے۔ اور میں انہیں ہمیشہ باصلاحیت اور بامقصد اور محترم و مہربان پاتا رہا ہوں۔

دوسری شخصیت جسے تمکین احمد کی شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے وہ یعقوب بزنجو کی ہے۔ وہ بھی نہایت مخلص، مہذب، مہربان اور انسان دوست انسان ہیں۔ ان سے بھی کافی عرصہ سے تعلق رہا ہے اور انہیں ہمیشہ ایک سا پایا ہے۔ ایسے کئی اور شاگرد تمکین صاحب کے ہوں گے جن

سے میرا تعلق نہیں رہا ہے۔

تمکین صاحب نہایت مخلص، مہربان، انسان دوست، اپنے اصولوں کے پکے، اور نہایت دیانتدار انسان ہیں۔ اور یہی اوصاف انہوں نے اپنے شاگردوں میں منتقل کیے ہیں۔ وہ بلوچستان کے ڈائریکٹر آف سکول کے عہدے کو پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ ان کی تمام سروس بے داغ رہی ہے۔ انہوں نے محکمہ تعلیم میں رہ کر تعلیم کو بڑھاوا دینے اور سنوارنے میں محنت کی۔

ان کی اب بھی اپنے ہم فکر دوستوں سے رفاقت ہے۔ ''سنگت'' کے سنگتوں میں بدستور شامل ہیں اور اس کی مجلس ادارت میں شریک ہیں۔

ایک اور محترم استاد کا بھی تعلق ہمیشہ لٹ خانہ سے رہا ہے۔ وہ محترم استاد جناب بدرالحسن ہیں۔ ان سے پہلی ملاقات جیکب آباد سندھ میں ہوئی۔ وہ وہاں کے ہندو کامریڈوں کے ساتھ تھے۔ جو اکثر لٹ خانہ آتے جاتے اور ان سے ہمیشہ رابطہ رہا۔ جو اب ہندوستان منتقل ہوئے ہیں مگر ان میں سے جو زندہ ہیں ان سے اب تک رابطہ ہے۔ جب بھی پاکستان تشریف لاتے ہیں لٹ خانہ والوں سے جن جن سے مل سکتے ہوں، ملنے آتے ہیں۔ شیام کمار کے توسط سے ان کے محبت نامے، پیار کے پیغام اور سلام ملتے رہتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھار سوغات بھیج کر دوستی اور محبت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

بدرالحسن صاحب نہایت شائستہ، مہذب، علم دوست، انسان دوست اور محبت والے اور مہربان ساتھی ہیں، مرنجان مرنج۔ بلکہ اکثر دوستوں کی مصیبتیں اپنے سر اٹھاتے رہے ہیں۔ وہ جب بھی کوئٹہ میں تھے تو لٹ خانہ تشریف لاتے خصوصاً خدائیداد اور ہم سب سے انہیں لگاؤ رہا ہے۔ وہ بھی بہت ہی نیک اور دیانتدار انسان ہیں۔ سردیوں میں کراچی میں، گرمیوں میں کوئٹہ ہوتے ہیں۔ فالج کے مریض ہیں۔ اس لیے جب حال ہی میں کوئٹہ تشریف لائے نہ میں ان کے پاس جاسکا، نہ وہ میرے پاس آسکے۔

ماہتاک ''سنگت''، کوئٹہ نومبر 1999

۳۳

عبداللہ جان کاسی سے متعلق بہت کچھ لکھ سکتا ہوں۔ مگر طوالتِ داستان مانع ہے۔ کیونکہ اس داستان کو خاتمے تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ قارئین کا بہت وقت ضائع کرتا رہا ہوں اور ان کو بور بھی کیا ہوگا۔ میں ہر دفعہ قلم چھوڑنے کی کوشش کرتا ہوں مگر میرے ساتھ فطرت نے مجھے چین نہ لینے کے لیے ایک عجیب ذہن وابستہ کیا جو دم لینے نہیں دیتا۔ وہ شخصیت ڈاکٹر شاہ محمد مری کی ہے۔ ان سے انکار میرے لیے مشکل ہے۔

سو عبداللہ جان کے بارے میں چند اور صفحات سپردِ حکم کروں گا۔ جو ان کی شخصیت کو مزید واضح کرسکیں گے۔

کراچی کی سبزی منڈی کو محترم (مرحوم) قادر بخش نظامانی کے بلاوے پر الوداع کہا۔ حالانکہ سبزی منڈی تو دولت کی منڈی ثابت ہوسکتی تھی میرے لیے اور ملک عثمان کے لیے کیونکہ ان کی تجویز اور مشورے پر اور میری مالی مشکلات اور بچوں کی مجبوریوں نے مجھے یہ کام کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ورنہ نہ میری طبیعت اور نہ فکر و خیال اس کام کے لیے آمادہ تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم دوست کیوں

سرکاری ملازمت چھوڑتے اور بیوروکریسی پر لعنت بھیج کر یہ مشکل زندگی اختیار کرتے۔ وہ بھی تو سبزی منڈی سے دولت منڈی ثابت ہونے میں کچھ کم کارگر نہ تھی۔ اگر اب تک رہتے تو کئی کاروں، بنگلوں اور بینک بیلنس کے مالک ہوتے۔ مگر میں تھا کہ اس زندگی سے بیزار تھا۔ منڈی اور دلالی کے کام سے فارغ ہوکر اپنے ساتھی سے (اپنے ہمکار لیاری والے دوست سے) جدا ہوکر یونیورسٹی روڈ کے اس پار ٹیلوں پر اداس جا کر بیٹھتا اور اپنی اس زندگی پر روتا۔ یہ جگہ آج کل گلشن اقبال کے نام سے زندگی کے شور وشغب اور ریل پیل سے اٹی پڑی ہے۔ یہیں آج کل میرے محترم اور گرامی قدر انور احسن کا مکان واقع ہے اور جو تنہائی کے عالم میں اولاد کے بغیر اپنی محترم اور وفا شعار بیوی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

عبداللہ جان کاسی نے تو میری غربت اور مفلسی کا مداوا کیا تھا۔ مجھے اپنے کارخانے کا منیجر کیا تھا۔ مگر میں وہاں بھی ٹک نہ سکا۔ ایک واقعہ کا ذکر کروں گا بے جا نہ ہوگا۔

میں کچھ عرصہ منگو پیر میں گل خان نصیر اور میر گوہر خان زرک زئی کے ہمراہ سردار عطا اللہ خان کے مہمان خانہ میں رہتا تھا۔ اس زمانے میں عطا اللہ خان منگو پیر میں ایک متروکہ جائیداد میں ایک ہندو سیٹھ کے مکان میں اپنے والد کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔ یہ گھر ان کے والد نے حاصل کیا تھا۔ عطا اللہ خان جیل میں تھے۔ ہم نیپ کے ساتھی وہاں ان کے مہمان خانہ میں رہتے تھے۔ کچھ تو ان کے بوڑھے والد کا دل رکھنے کے لیے اور ان کے ساتھ دوستی بنانے کے لیے۔ جب تک ان کا مقدمہ چل رہا تھا تو شیخ عزیز اللہ کے پاس جا کر ان کی راہنمائی اور مدد کرتے۔ (پھر بات بہت لمبی ہورہی ہے)۔

میں عبداللہ جان کے کارخانہ میں ان کے بنگلے میں ان کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کے بچے کوئٹہ میں ملک عثمان کے گھر میں رہتے تھے اور وہ اُن کو پڑھانے کے ذمہ دار تھے۔ شاہی قلعہ سے چھوٹنے کے بعد وہ مجھے اپنے پاس لے کر آئے اور مجھے نصیحت کی کہ اب ذرا سیاست سے وابستگی کم کردو اور کچھ اپنے آپ پر اور اپنے بچوں پر ترس کھاؤ۔ لہٰذا میرا دوستوں سے ملنا جلنا کم ہوا۔ دوستوں کو شاید میری یہ بات نہ پسند آئی۔ ایک روز قادر بخش نظامانی کے گھر سے مجھے میر گوہر خان

زرک زئی نے ٹیلیفون پر بتایا کہ ہم روز تمہاری قبر کے پاس سے گزرتے ہیں اور تمہارے لیے فاتحہ پڑھتے ہیں۔ مطلب میں نے ان سے جدائی اختیار کرکے موت کو لبیک کہا تھا اور میری مثال مردہ کی تھی۔ بات تو کسی حد تک درست تھی۔ لیکن بعد میں میر گوہر خان خود عطا اللہ کے گھر ٹک نہ سکے۔ جب سرکار کے ایک آفیسر نے راجہ احمد خان کے کہنے پر انہیں سردار دودا خان کی جگہ سردار بننے کی دعوت دی۔ دودا خان سے سرکار ان دنوں ناراض تھی اور وہ جیل میں تھا۔ سرکار اور سردار کی یہ آنکھ مچولیاں ہر وقت دیکھنے میں آتی تھیں۔ بہرکیف میں جل بھن کر رہ گیا۔ ضمیر نے ملامت کی۔ اس طرح میں نے عبداللہ جان کے کارخانے اور گھر کو الوداع کہا تھا اور کوئٹہ ایک سال غربت کے دن گزارنے کے بعد ملک عثمان کے مشورے پر سبزی منڈی میں گھر بسانے کی کوشش کی۔ مگر یہاں بھی جی نہ لگا۔

کہتے ہیں خدا مسبب الاسباب ہے۔ شاید میرے لیے پاکستان کے ایوب خان اور سوویت یونین کے ارباب بست وکشاد کے تعلقات نسبتاً اچھے کردیے گئے۔ ایوب خان کے سوویت یونین کے دورے میں یہ طے پایا تھا کہ سوویت پریس انفارمیشن سے دوبارہ ایک مجلّہ ''طلوع'' کے نام سے شائع کیا جائے۔ سو یہ فیصلہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا پریس انفارمیشن کے لوگ اور نظامانی صاحب مجھے دوبارہ اُسی کام کے لیے لے جانا چاہتے تھے۔

نظامانی صاحب ایک صبح ہماری کوٹی (ایک خستہ حال کٹیا) میں آئے اور مجھے بتایا کہ آپ کو بلایا جارہا ہے۔ میری تو آنکھیں کھل گئیں۔ زندہ ہوا اور میں نے فوراً جانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔

سبزی منڈی سے فارغ ہوکر میں ''طلوع'' میں کام پر گیا۔ عبداللہ جان سے بدستور تعلقات بھائیوں جیسے تھے۔ بلکہ میں انہیں اپنا محسن سمجھتا تھا۔ عبداللہ جان بھی انتہائی مخلص اور محبوب انسان تھے۔ شیر محمد اور خیر بخش ان کے پاس بھی جاتے تھے اور مجھے ملنے کے لیے پریس آیا کرتے تھے۔

اُس دور کی سیاست بھی دلچسپ اور بے چینی کی سیاست تھی۔ ایک طرف چینی اور روسی مسئلہ تھا۔ انہیں ایک مرتبہ نظامانی صاحب نے چھوٹے اور بڑے بھائی کے نام سے یاد کیا تھا۔ جب بھی چینی ہمارے آفس آتے تو نظامانی کہتے چھوٹے بھائی بڑے بھائیوں سے ملنے آئے ہیں۔

بالآخر چھوٹے اور بڑے بھائی کے درمیان جائیداد (میراث) پر خفگی اور جھگڑا ہوا۔ چھوٹا بھائی زیادہ گستاخ ہوا اور بڑے بھائی کو سوشل سامراج کے نام سے یاد کرنے لگا۔ اور سُرخوں میں کوئی روسی اور کوئی چینی ہوا۔

اُدھر ویت نام کی آزادی کی جنگ زوروں پر تھی۔ عبداللہ جان کے پاس ایک کتاب دیکھی۔ Peoples War Peoples Army جنرل گیاپ کی۔ ہم نے یہ کتاب پڑھ لی۔ ادھر کیوبا کا ننھا ملک بھی آزاد اور انقلابی ملک کے بطور وجود میں آیا تھا۔ کاسترو اور چے گویرا نے مل کر انقلابی جنگ لڑی تھی اور بعد میں چے گویرا نے تمام لاطینی ممالک میں انقلاب برپا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور دنیا بھر کا دورہ کر رہا تھا۔ نوجوان انقلابی ان سے بہت متاثر تھے۔ مجھے بھی *گرانما* (Granma) کے پرچے دفتر میں ملا کرتے تھے۔ کاسٹرو کے لمبے چوڑے مضامین پڑھا کرتا تھا۔ کچھ دن بعد چے گویرا کی ڈائری بھی شائع ہوئی۔ پڑھنے کو ملی۔ نہ جانے میں غبی ہونے کی وجہ سے اسے سمجھ نہ سکا۔ مزہ نہیں آیا۔ بعد میں مجھے چے گویرا کی تحریک، ان کی ذاتی رومانس اور مہم جوئی معلوم ہوئی۔ ان کے ساتھ کاسٹرو کی فکر نے اب تک سوشلزم کو برقرار رکھا ہے اور عوام الناس کیوبا پر امریکی جارحیت کے باوجود خوش حال اور سلامت ہیں۔ اس سے پہلے میں نے نظامانی سے حاصل کر کے کاسٹرو کا کتابچہ پڑھا تھا۔ کس طرح اس نے گرفتاری کے بعد عدالت میں بیان دیا تھا۔ بے حد مزہ لیا۔ میں نے، عبداللہ جان اور ملک عثمان تینوں نے یہ کتاب پڑھی۔ چھوٹی تھی مگر ہمیں جذبہ دینے کے لیے بہت ہی کارآمد: ''تاریخ مجھے معاف کرے گی''۔ پھر ماؤزے تنگ کے فوجی مضامین بھی پڑھے تھے۔ ایریٹیریا میں بھی انقلابی تحریک چل رہی تھی۔ افریقی ممالک میں انقلابی ابھار تھا۔ لومبا کو قتل کر دیا گیا تھا۔ ایسے ماحول میں نوجوان جوش میں نہ آتے تو اور کیا کرتے۔

لندن میں ایک گروپ نے جوش میں آ کر ایک منصوبہ بنایا کہ پاکستان میں بھی ایریٹیریا کی طرز پر قبائلی لوگوں اور لیڈروں کے توسط سے انقلاب لایا جائے۔ پاکستانی حکام کی عوام دشمنانہ اور غلط پالیسیوں کے سبب بلوچستان میں بے چینی تھی۔ دوسری طرف ون یونٹ بنا کر بلوچستان، سندھ اور سرحد کو بےزار کر دیا گیا تھا۔

تندوری کے واقعہ سے بلوچستان میں مزاحمت کی تحریک کی ابتدا ہوئی۔ پاکستان کے ظالم حکمرانوں نے فوجی نادان اور جاہل سپاہیوں کو اپنے عوام پر گولیاں چلانے کے لیے آمادہ کیا۔ مہم جو فکر (میں خود بھی اسی فکر سے آزاد نہ تھا) کی نادانی سے بلوچستان کے قبائل میں مصیبتوں کے دور کا آغاز ہوا۔ لندن کے نوجوان گروپ نے جو اسی فکر کے علم بردار تھے، یہی سوچا کہ اس طرح کے مہم جویانہ انقلاب کے لیے حالات سازگار ہیں۔ بلوچستان میں کامیاب ہو کر اسے تمام ملک میں پھیلایا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے شیر محمد کے ساتھ رابطہ کیا۔ اور مری قبائل میں ماؤازم کے عمل کو پھیلانے کی کوشش کی۔

شیر محمد تو ہمارے لٹ خانہ کے دنوں کے ساتھی تھے۔ انہوں نے ہم سے باقاعدہ رابطہ کیا، میر علی بخش تالپور کے توسط سے۔ ان کے خطوط ملتے رہتے تھے، مجھے اور عبداللہ جان کو۔ عبداللہ جان مخلص انسان تھے وہ ہمیشہ بلوچوں کی سیاست کا ساتھ دیتے رہے۔ اور بلوچ زعما کا ان کے پاس آنا جانا رہتا۔ حسبِ ضرورت مالی اعانت کرتے۔ اس طرح سرحد کے اجمل خٹک صاحب بھی ان کے پاس آتے۔ ان کے ساتھیوں کی بھی اسی طرح مدد کرتے۔ انہیں ہم پر اور ملک عثمان پر کورا اعتماد تھا۔ جو ہم کرتے یا کہتے، وہ اسے مانتے۔

شیر محمد نے اپنے پہاڑوں پر بیس (Base) بنائے۔ ان کے پاس نوجوان انقلابی آتے جاتے۔ وہ اپنے ذاتی مطالبات کے لیے بھی خط بھیجتے۔ عبداللہ جان کاسی ہی اس قابل تھے یا پھر میر علی بخش ان کی فہرست کے مطابق ان کی ضرورت کی چیزیں خرید کر بھیجتے۔ وہ جو بھی چیز مانگتے اعلیٰ اور بہترین کوالٹی کی۔ ایک مرتبہ ہمیں خوب ہنسی آئی جب انہوں نے رولیکس (Rolex) گھڑی مانگی تھی۔ عبداللہ جان اور علی بخش نے کہا اب تک خود ہم نے اسے استعمال نہیں کیا تو پہاڑوں میں اس کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ صرف ٹائم ہی دیکھنا ہے، وہ کوئی سی گھڑی بتا سکتی ہے۔ ہم اب حیران تھے کہ یہ کیسا انقلاب ہوگا جب کہ ہوچی من ویت نام میں چپلوں میں پھرا کرتے تھے۔ بہرکیف ہمیں بھی ہوش نہ آیا اور ان کی باتوں میں آ گئے۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انہوں نے وہیں بیٹھ کر ایک لمبا چوڑا تھیسز بلوچی میں (شاید)

لکھ دیا اور مجھے کہا گیا کہ میں اس کا اردو میں ترجمہ کرلوں۔ آخر کار میں نے ایسا ہی کیا۔ اس میں نہایت دلفریب باتیں لکھی تھیں۔ مارکس کے حوالے اس میں کافی تھے۔جس سے وہ زیادہ دلکش معلوم ہوا۔ اس میں یہاں تک لکھا تھا کہ ہم نے (نہ جانے اب یاد نہیں) اتنے ہزار میل آزاد کردیے ہیں۔

اس خودفریبی ،جس میں میں خود شامل رہا ہوں اور کافی عرصہ تک یہ فریب اپنے نوجوانوں اور لوگوں کو دیتے رہے۔ہمیں اس وقت یہ فریب نہیں بلکہ حقیقت معلوم ہوتی اور خیال تھا کہ ایسا ہوگا۔ میرا مقصد عبداللہ جان کی سادگی اور ان کے خلوص کے بارے میں بتانا ہے جو وہ لٹ خانہ والوں سے وابستہ کر چکے تھے۔

کچھ عرصے بعد جب (جب کہ اکثر حکومت وڈیروں، نوابوں اور سرداروں اور خوانین کے مابین ہوا کرتی ہے) ان میں اور حکومت میں کمپرومائز ہوا۔ اور بڑے لوگوں کی آسودہ حالی (کئی غریبوں کو مروا کر ان کے گھر بار برباد کرنے کے بعد) بحال ہوئی۔ تو اچانک معلوم ہوا شیر محمد صاحب (جنہیں بعد میں میرے خیال میں نواب اکبر خان بگٹی نے جنرل شیروف کا لقب ازراہِ تمسخر دیا۔ مگر اب عام خاص لوگوں میں جنرل شیروف کے لقب سے ان کے نام کا حصہ بن چکا ہے) نے پہاڑوں سے اپنے خطوط کے ہمراہ کچھ تصویریں بھی بھیج دی تھیں۔ ان میں ایک مارٹر توپ کی تصویر، ایک بہت بڑے پلے ہوئے گرانڈ (بھیڑ) اور ایک سفید پوش مری عورت جو شاید ان کے لیے روٹی پکاتی ہوگی۔ یہ تصویریں بھیج دی تھیں۔ نہ جانے جب ان کے اور اکبر خان کے مابین اقتدار کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور اکبر خان پیپلز پارٹی اور صدر بھٹو کے ہم نوا ہوئے اور گورنر بھی۔ یہ تصویریں اخبارات میں چھپیں۔ میرے خیال میں مارٹر، گرانڈ کی اور چند بندوق بردار مری جوانوں کی۔

کمپرومائز کے بعد شیر محمد اور خیر بخش دونوں کراچی پہنچے۔ دونوں عبداللہ جان کے ہاں ان کے کارخانے کے احاطے میں ان کے بنگلے میں ٹھہرے۔ نہ جانے بیس روز یا ایک ماہ۔

میں نے جو شیر محمد کے تھیسـز کا ترجمہ کیا تھا اردو میں، اس کی اشاعت بائیں بازو والوں میں ہوئی۔ خصوصاً ان سرکلز میں جو مسلح جدوجہد کے حامی تھے۔ جب شیر محمد کی آمد کا پتہ چلا تو

لوگ یعنی ایسے لوگ جن کی میں نے وضاحت کی ہے جوق در جوق عبداللہ جان کے یہاں آتے رہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ طارق عزیز شو کے (جو اس وقت جوان تھے) کے میز بان بھی پہنچے اور شیر محمد کے پاؤں کے پاس بیٹھے ہوتے تھے۔ کیونکہ شیر محمد کا کہنا تھا کہ ان کی کمر میں تکلیف ہے اور نیچے بیٹھ نہیں سکتے اور مری قبائلی روایات کے برعکس ان کے قبیلہ کے (سردار) نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ مگر وہاں مری نہیں تھے۔ بلکہ خوش فہم مسلح جدوجہد کے حامی دانشور۔ یہ صورت حال مزید ان کے لیے دلکش تھی۔

عبداللہ جان نے بڑی خدمت کی۔ چونکہ ایسی نشستوں کو اوپن کرنا سیاسی طور پر جائز نہ تھا۔ عبداللہ جان خود خدمت کیا کرتے۔ چائے لاتے اور بوتل انقلابیوں یا انقلاب کے حامیوں کو پیش کرتے۔

یہ تھے عبداللہ جان۔ بعد میں کچھ عرصہ بعد عبداللہ جان بیمار ہوئے۔ انہیں دل کا بھی عارضہ تھا۔ اور ٹانگ میں بھی تکلیف تھی۔ چند سال کے بعد فیکٹری فروخت کر کے کوئٹہ منتقل ہوئے۔ اور مشن روڈ پر اپنے مکان میں رہتے تھے۔ یہاں بھی میں ان کے پاس جاتا۔ سیاسی لیڈروں اور ورکروں کا ان کے پاس آنا جانا ہوتا۔ مگر وہ بلوچ لیڈرشپ سے مایوس ہو چکے تھے۔ میرے سوا کوئی بلوچ ان کے پاس نہیں جاتا (سیاسی) ماسوائے ملا سعد اللہ کے جو وہ بھی ملا ہونے کے باوجود بائیں بازو کی سیاست میں شامل تھے، ان کے پاس جاتے۔ ان دنوں میں بھی کراچی چھوڑ چکا تھا۔ اور خوش قسمتی سے یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے ملازم ہو چکا تھا۔ مگر اس کے باوجود میرا آنا جانا شیر محمد کے پاس ہوتا۔ کیونکہ ان کا مسلح جدوجہد کا پروگرام بدستور جاری تھا۔ اگرچہ ملتوی کر دیا گیا تھا۔

کوئٹہ میں عبداللہ جان کاسی نے تقریباً سیاست سے دلچسپی چھوڑ دی تھی۔ میں، کمال خان اور ملک عثمان ان کے پاس آتے جاتے۔ ان کی صحت اچھی رہتی تھی۔

میرے چچا یونیورسٹی کیمپس میں میرے ساتھ رہتے تھے۔ بھائی آزاد صاحب بھی جب بہت بیمار ہوئے تو یہیں منتقل ہوئے۔ اور جب دونوں فوت ہوئے اور بیمار تھے، عبداللہ جان بیمار پرسی اور فاتحہ کے لیے گھر آئے۔ ان کے بھائی اور ملک عثمان تو نوشکی فاتحہ کے لیے آئے تھے۔

ایک شام کو عبداللہ جان کا سب سے چھوٹا بیٹا میر ایمل کاسی گھر آیا اور مجھے کہا ابو بلا رہے

ہیں کھانے پر۔ میں ان کے ساتھ گاڑی میں چلا گیا۔ میر ایمل کاسی ان دنوں یونیورسٹی میں انگلش میں ایم اے کررہے تھے۔ بہت ہی مؤدب خوبصورت اور پیارا بیٹا تھا عبداللہ جان کا۔ یونیورسٹی میں جب بھی فارغ ہوتے تو میرے دفتر میں مجھے ملنے آتے۔ ان دنوں نوجوان لڑکے افغانستان کے راستے سوویت یونین یا دیگر سوشلسٹ ممالک پڑھنے کے لیے جاتے۔ میرے دو بیٹے بالاچ خان اور دوستین بھی گئے ہوئے تھے۔ ایک ماسکو میں تھا اور دوسرا صوفیہ، بلغاریہ میں تھا۔ یہ سب میر ایمل کے دوست اور بچپن میں کراچی میں اکٹھے رہے تھے۔ میر ایمل نے مجھے بتایا کہ آپ کے بیٹے کیوں ماسکو پڑھنے گئے ہیں۔ وہاں کیا پڑھائی ہوگی، یورپ اور امریکہ جاسکتے تو جاتے ورنہ یہیں پڑھتے۔

جب ہم ان کے گھر پہنچے تو عبداللہ جان کو انتظار میں پایا۔ ان کے مہمان خانہ میں کمال خان شیرانی اور ان کے سیاسی رفیق ڈاکٹر کلیم اللہ خان بیٹھے تھے۔ عبداللہ جان نے کمال خان کے لیے کھانا کیا تھا تو مجھے بھی بلایا تھا۔

میں نے میر ایمل کی بات عبداللہ جان کو بتائی۔ انہوں نے کہا کہ میرا بیٹا آج کل ایسی ہی باتیں مجھ سے بھی کرتا ہے نہ جانے اسے کیا ہوگیا ہے۔

عبداللہ جان بعد میں بہت بیمار ہوئے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ انہیں کینسر ہے۔ ہم ایک روز ان سے چندہ لینے گئے۔ شیام کمار، جعفر خان، ملک عثمان شاید کچھ اور لوگ۔ وہ بہت علیل تھے۔ ان سے پیسہ لینا تھا۔ ہم ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی میں شرکت کے لیے کراچی میں ایک بہت بڑی تعداد کا ڈیلی گیشن لے جارہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہوتا تو کچھ بھی نہیں مگر تم ساتھ آئے ہو تو مجبور ہوں۔ ایک ہزار کا چیک دیا۔ اور کینسر کی بیماری کے باوجود رخصت کرتے وقت گیٹ تک ساتھ آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ علاج کے لیے کراچی جائیں۔ انہوں نے جواب دیا، کینسر لاعلاج ہے مرنا ہے ہی پیسے کیوں ضائع کروں۔ کسی اور اچھے کام میں یہ لگاؤں گا۔

جب میں یورپ گیا اور واپس آیا تو عبداللہ جان فوت ہوچکے تھے۔ ان کے نام سے سول ہسپتال میں شعبہ حادثات قائم ہوا، جواب تک موجود ہے۔

ماہنامہ ''سنگت''، کوئٹہ۔ جنوری 2000

۳۴

سوچ رہا تھا کہ لٹ خانہ کی اس طویل داستان کو کس طرح اختتام تک پہنچاؤں۔ ایسے کام میں ہاتھ ڈال دیا ہے کہ شاید میرا اپنا خاتمہ ہو جائے مگر اس کا خاتمہ کچھ مشکل ہے۔ کیونکہ کئی اور شخصیتیں ہیں جن کے بارے میں ضمیر لکھنے پر مجبور کررہا ہے۔ ان کا کسی نہ کسی حوالے سے لٹ خانہ سے تعلق رہا ہے۔ ویسے لکھتے وقت اب تک کہیں نہ کہیں ان کا ذکر ہوا ہے۔ مگر جی کرتا ہے کہ کچھ ایسی شخصیتیں ہیں جن کے بارے میں کچھ زیادہ تفصیل سے لکھا جائے۔ اور لکھتے وقت کچھ ایسی باتیں آجاتی ہیں جو کسی طرح ان پر تنقید ہے۔ جب لکھ دیتا ہوں تو بعد میں خیال آتا ہے کہ خود تو کچھ نہ کرسکا، ان پر تنقید کرنا کچھ زیادتی ہے۔ بہرکیف لکھتا ہوں۔ اب جبکہ عبداللہ جان کاسی کے بارے میں لکھا تو ملک عثمان کاسی کے بارے میں نہ لکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پھر صمد خان کی عظیم شخصیت میرے نزدیک اس قابل اور ضروری ہے کہ کچھ تفصیل سے ان کے بارے میں لکھوں جس نے اپنی زندگی قبل از وقت اس سرزمین کے لیے جس پر میں رہ رہا ہوں اور ہمارے عوام پر قربان کردی۔ اور چند منحوس ہاتھوں نے بدبخت ہوکر ان کی جان لی۔ ان کے بارے میں نہ لکھنا سراسر بے ایمانی اور بے

انصافی ہوگی ۔اس طرح شیر محمد کے بارے میں لکھتا چلا آ رہا ہوں۔اسی طرح ان کے ساتھ خیر بخش مری جوایک دوسرے سے ہر حال میں وابستہ رہے ہیں اور بعد میں بدقسمتی سے ایک دوسرے سے بدرنگی سے جدا ہوئے یا جدا کردیے گئے ۔کیونکہ اس بارے میں دونوں رائے ہیں۔اسی طرح غوث بخش بزنجو، غلام محمد شاہوانی ، بہادر خان بنگلزئی ،عبدالواحد کرد، آزاد جمالدینی ،اور ایک حوالے سے اکبر بارک زئی جو کہ اگرچہ لٹ خانہ کے وقت سکول میں پڑھتے ہوں گے ،مگر بعد میں آزاد جمالدینی، غلام محمد شاہوانی ، خیر بخش مری ، غوث بخش بزنجو، گل خان نصیر وغیرہ سے وابستہ رہے اور ان کی فکر وہی رہی ہے جولٹ خانہ کے شروعات کی فکر اورلٹ خانہ والوں کے بعد کی فکر جب وہ نیپ کی وجہ سے قوم پرستی کی بائیں بازو اور ترقی پسندانہ ڈگر پر چلے ۔(اگر اسے ترقی پسندی کہا جا سکتا ہوتو)۔ بہر کیف وہ تو اپنے خیال اور فکر سے اس راستے پر چلنا چاہتے تھے ۔مگر حالات نے انہیں نہیں چلنے دیا۔اس طرح ملنگ سعد اللہ ایک ایسی شخصیت ہیں جو تا دم آخر ہمارے ساتھ رہے ۔مگر چونکہ چھوٹے اور غریب آدمی تھے، بڑی سیاسی شخصیت نہ بنی ان کی ۔نہ سردار تھے نہ بڑے اور بائیں بازو کے لکھے پڑھے دانشور مگر ان کی عوام دوستی ، یا قوم پرستی اور اپنے بساط کے مطابق قربانیوں کو کم از کم میں نظر انداز نہیں کرسکتا۔اس طرح شہزادہ عبدالکریم اور محمد حسین عنقا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شہزادہ تھے مگر بعد میں درویش اور گم نام ہوکر اس دنیا کو چھوڑ گئے ۔

مجھے یقین نہیں کہ میری موجودہ صحت اور اس کے حالات اس قدر موقع دیں گے کہ میں ان کے بارے میں لکھ سکوں۔ابھی تو لٹ خانہ کے ابتدائی اور اصل فکری ساتھیوں کے بارے میں تفصیل سے نہ لکھ سکا۔اور میں نے اپنے آپ کو بری طرح ان لوگوں میں پھنسا دیا ہے۔اس الجھن سے نکلنے کا اب یہی طریقہ ہے میرے لیے کہ چند شخصیات کے بارے میں لکھنے کی ضرورت نہیں ۔کیوں کہ ان کے بارے میں پہلے ہی کئی مرتبہ سیمیناروں ،ان کی برسیوں اور مختلف ادبی کتابوں کے دیباچوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے ۔مثلاً غلام محمد شاہوانی ،گل خان نصیر، آزاد جمالدینی ،غوث بخش بزنجو، عنقا صاحب، اکبر بارک زئی چند حضرات کے بارے میں جو کتابیں چھپی ہیں وہاں ان کے بارے میں کتابوں کے تعارفی مضمونوں یا تبصروں میں ۔اب ان کے بارے میں لکھوں گا جن

کے بارے میں نہیں لکھا ہے ۔اور چند ایک کے بارے میں مختصراً لکھوں گا ۔اورلٹ خانہ کا تتمہ Epliogueیا Conclusion لکھ کر اس سلسلے کا خاتمہ کر دوں گا۔

ویسے میرا خیال ہے کہ ہر لکھنے والے کو لکھنا چاہیے۔تاکہ وہ لوگوں کو معلومات بہم پہنچائے ۔ترقی کے لیے یہ ضروری ہے۔آگے قاری کا شعور اسے قبول یا رد کرے۔ جو اسے معلوم ہے اسے پڑھنے کی ضرورت نہیں اور جو نہیں وہ کہیں سے ڈھونڈ کر حاصل کر سکے گا۔

اب مجھے پڑھنا ہی چاہیے۔ جو زندہ رہنے کے لیے، میرے لیے ضروری ہے۔علم کی تشنگی کو دور کرنے کے لیے اور وقت گزارنے کے لیے ۔کیونکہ چل پھر میں نہیں سکتا۔کسی اور طرح وقت کاٹنا میرے لیے ممکن نہیں ۔ پڑھنا ہی میرے ذہن کو مصروف اور مجھے آسودہ رکھ سکتا ہے ۔اور یہی مجھے کرنا چاہیے۔

میں نے ’’لٹ خانہ‘‘ پر لکھنا اس لیے شروع کیا کہ میرے بہت سارے احباب نے کہا کہ لٹ خانہ کے بارے میں لکھنا چاہیے ۔کیونکہ ان کے خیال میں صوبہ بلوچستان میں ترقی پسندی اور خصوصاً ترقی پسند ادب کو ترقی دینے کی یہ ایک تاریخ ہے ۔ میں نے متعدد دوستوں کو اس پر لکھنے کے لیے کہا۔اور میرے خیال میں وہ مجھ سے ہر لحاظ سے اس کام کے لیے بہت بہتر تھے۔فکری لحاظ سے اور تحریری لحاظ سے ۔سب سے بہتر تو انجم قزلباش تھے ۔مگر وہ وقت سے پہلے مفلوج ہو گئے ۔نہ لکھنے کے قابل رہے نہ باتیں کرنے کے قابل ۔سید کامل القادری تو بہت پہلے وفات پا گئے تھے۔ سائیں کمال خان تو ایسا کام کرنا ہی نہیں چاہتے ۔اسے وہ خودنمائی سمجھتے ہیں ۔جس سے وہ کوسوں دور ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ میں کسی قسم کا ’’ٹر‘‘ نہیں بننا چاہتا۔ چنانچہ ان کی پارٹی پشتونخواہ ملی عوامی پارٹی نے انہیں الیکشن میں کھڑا کر کے منسٹر بنانا تھا جو وہ نہ بنے ۔اسی طرح سینیٹر بن سکتے تھے ۔انکار کیا ۔اب یہ لکھنے کا کام یعنی ایڈیٹر، یہ بھی ایک ’’ٹر‘‘ ہی ہے، اسے وہ بھی پسند نہیں کرتے ۔ ڈاکٹر خدائیداد صاحب نے بھی اسے کرنے کے لیے آمادگی کا اظہار نہیں کیا۔

چنانچہ مجھے ہی کرنے کے لیے کہا گیا۔سب سے پہلے امام علی نازش صاحب نے کہا تھا اور ان کے ساتھی صوفی عبدالخالق نے ۔ پھر میرے بہت ہی عزیز دوست اور بھائی اکبر بارک زئی

صاحب نے مجھے کہا کہ آپ اپنی یادداشتیں لکھیں۔ میں نے آزاد جمالدینی کے مجموعہ اشعار کی کتاب ''رژن'' کا دیباچہ لکھا تو اس میں کراچی میں ادبی کاموں کی یادداشتیں تھیں۔ جن کا اور جن لوگوں کا تعلق آزاد جمالدینی کے بلوچی مجلّہ ''ماہتاک بلوچی'' سے تھا۔ پھر میں نے اکبر بارک زئی کی بلوچی شاعری کا مجموعہ ''روچہ کے کشت کنت ؟'' کا دیباچہ بھی اسی طرز پر لکھا۔ یعنی یادداشتوں کی صورت میں۔ ان کی شاعری کا علمی اور ادبی طور سے جائزہ نہ لکھ سکا، جو انہیں پسند نہ ہوا۔ انہوں نے بھی کمال خان کی طرح اسے اپنی تعریف قرار دے کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ کام عطا شاد مرحوم بہتر کر سکتے تھے۔ اور واقعی وہ کر سکتے تھے۔ مگر عطا شاد مرحوم نے اپنے آپ کو شراب کے حوالہ کر دیا تھا۔ وہ صرف بہترین اشعار تخلیق کر سکتے تھے۔ ایسے کام کے لیے مجبوری کا اظہار کرتے رہے۔ وہ تو اپنے بلوچی اشعار یکجا نہیں کر سکے۔ اوروں نے ان کے لیے یہ کام کیا۔ اور برسوں بعد ان کے بلوچی اشعار کے مجموعے چھپے۔

میں نے اپنے آپ پر ظلم کر کے نہ جانے کیوں یہ ذمہ داری قبول کی۔ شاید اس لیے کہ میں کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس طرح ڈاکٹر شاہ محمد مری جیسے جابر انسان کے ہاتھ لگا، جو ایڈیٹر ہیں اور جبر بھی کرتے ہیں......مگر نام میرا چیف کے طور پر لکھتے ہیں......نہ بابا......نہ میں چیف ہوں، نہ ایڈیٹر......میں تو ایک نالائق اور غریب انسان۔ نہ شہرت کا متلاشی ہوں اور نہ دولت کا۔ دولت اس میں کیا خاک ہاتھ آسکتی ہے۔ وقت ضائع کرنا ہوتا ہے۔ وہ وقت جو شاہ محمد پیسے کمانے کے لیے خرچ کر سکتے ہیں۔ مگر ''سنگت'' کو وہ وقت دے رہے ہیں۔ بس یہ Thankless Job یعنی کارِ نامشکور۔ نوجوانوں کو باشعور کر دینے کے طور پر گوارا کیا ہے۔ پرچہ تو ان کا مقبول اور اچھا ہے۔ شعور دے رہا ہے مگر شعور کو کون پسند کرتا ہے۔ سچائی، سچائی کہہ کر لوگ نہیں تھکتے۔ مگر کوئی جب سچ کہنا شروع کر دے تو لوگ ناراض ہو جاتے ہیں۔

ایسے انسان دوست دوستوں کا حکم سر آنکھوں پر جو اپنی تمام زندگی کمٹمنٹ (اپنے نیک مقاصد سے وابستگی) پر آمادہ ہوں اور ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنی نادانی، کم عملی اور بیماری کے باوجود اس کام کا آغاز اس وقت کیا جب مجھ پر فالج نے حملہ کیا اور

میں ہسپتال میں تھا۔ اس وقت شاہ محمد مری نوکیں دور کی ادارت کر رہے تھے جو کبھی بلوچستان کے مایہ ناز عوام دوست دانشور مرحوم بابو عبدالکریم شورش کا یادگار مجلّہ تھا۔ جس کی ادارت کچھ وقت آزاد جمالدینی کیا کرتے تھے۔ ناداری اور افلاس کے باوجود وہ نہایت انہاک سے کام کیا کرتے تھے۔ شورش کی بات یاد ہے۔ حافظ کا یہ مصرع بیجا نہ ہوگا، اگر اسے میں یہاں استعمال کروں؛

قرعہ فال بہ نام من دیوانہ زدند

اس بڑھیا اور بیوہ کی کٹیا Widow's Hut میں رہ کر ہم کیا کچھ سوچ سکتے تھے اور بعد میں ہم میں سے ہر ایک کیا کچھ بنا۔ یہ وہ داستان ہے۔

ہمارے پیش نظر یہ تھا کہ ہم اپنے مظلوم، غریب اور بے آسرا عوام کی خدمت کے قابل بنیں اور اوروں کو بنوائیں۔ ان میں سماجی سیاسی شعور پیدا کریں۔ اور نوجوانوں میں آگاہی پیدا کر کے اس مفلوک الحال کو جو بقول وکٹر ہیوگو اور اس قول کو جسے شاہ محمد نے ''سنگت'' میں اپنی ایک تحریر میں بیان کیا تھا کہ جہالت تمام انسانی کمزوریوں کا بوجھ ہے جسے غریب عوام اٹھائے پھرتے ہیں (اسے ٹھیک طور پر بیان نہیں کر سکا)۔ جب تک غریب عوام کے سر سے اسے نہیں اتارا جاتا، بنی نوع انسان کی ترقی ممکن نہیں۔ ہم سب کا یہ خیال تھا کہ بلوچستان کے عوام میں اور نوجوانوں میں شعور اور فکر پھیلا کر اس مقصد کو کامیاب بنائیں۔ اس وقت ہم میں کسی طرح کی امتیازی فکر نہ تھی۔ نہ قومیت کی، نہ مذہب و فرقہ کی، نہ زبان و نسل کی...... ہمارے ان مقاصد کے پسند کرنے والے ہندو، عیسائی، مسلمان، پشتون، بلوچ، ہزارہ، پنجابی یہاں تک کہ باہر کے عیسائی مبلغ بھی لٹ خانہ آیا جایا کرتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ تبلیغ کر کے ہمیں عیسائی بناتے بلکہ ہماری انسان دوستی اور غریبوں کے لیے خدمت کے جذبہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے۔ لٹ خانہ میں (مجھے یاد ہے) دوپہر کے کھانے میں انہیں مدعو کر کے (ظاہر ہے ہمارے پاس کیا تھا، سوائے آلو کے جو خدائیداد اور انجم پکا کر ان کے اور ہم سب کے آگے رکھتے) اور کمال خان ان سے ہمارے خیالات اور مقاصد کا اظہار کرتے اور محو گفتگو ہوتے۔

یہ تھا ہمارا رشتہ، ہماری وابستگی ہر انسان کے ساتھ اور اس کے لیے ہی یہ ساری تگ و دو

تھی...... ہماری مصروفیات فکری ونظری پرچار، مطالعہ اورادبی سرگرمیاں نوائے وطن اور پشتو ماہنامہ کی اشاعت۔

انہی ایام میں شہزادہ عبدالکریم خان کے مقدمہ بغاوت میں سزا یافتہ لوگ رہا ہوتے گئے۔کم سزا یافتہ ناخواندہ لوگوں سے ہماری واقفیت نہیں تھی۔البتہ لکھے پڑھے ملازمین جو گئے تھے، ان میں سے پہلے شخص جو رہا ہوئے وہ میر محمد خان رئیسانی تھے۔رئیسانی صاحب بہت ہی جوانی میں اس سیاسی تحریک سے متاثر ہوئے تھے۔وہ گریجویٹ تھے اوراس کے بعد ریاست قلات میں نائب تحصیلدار لگے تھے۔ اسی دوران انہوں نے شہزادہ عبدالکریم اوران کے ہمراہیوں کے ساتھ افغانستان کے بارڈر جا کر کیمپ لگایا۔اور جب سب گرفتار ہوئے تو وہ بھی گرفتار کیے گئے۔سنٹرل جیل مچھ میں مقدمہ چلا تو انہیں بھی سزا ہوئی، تین سال کے لیے۔سزا بھگت کر نکلے تو انہیں لٹ خانہ کے بارے میں جیل ہی میں عبدالواحد کرد جو ہمارے کالج کے مانے کے دوست اور ساتھی تھے، ان سے معلومات حاصل ہوئیں۔ان کے بعد ان کے گھر کی حالت خراب ہو چکی تھی۔انتہائی پریشانی کی حالت میں لٹ خانہ پہنچے تھے۔نوجوان، حساس اور بیروزگار، پریشان نہ ہوتے تو اور کیا ہوتے۔

کوئٹہ کے کمشنر نواب زادہ اسلم تھے۔انہیں ملازمت کے لیے درخواست دی۔انہوں نے انہیں عرضی نویسی کی اجازت دی۔ یوں وہ چمن اور پشین میں عرضی نویسی کرتے رہے۔لٹ خانہ والوں سے جو کچھ ہوسکتا تھا ان سے ہمدردی کی۔کمال خان شیرانی اور میں نے بعد میں ان کی والدہ اور بچے بس کے ذریعہ پشین بھجوادیے۔

ماہتاک ”سنگت“، کوئٹہ۔فروری 2000

۳۵

ملک عثمان کے بارے میں لکھنے سے طوالت کی وجہ سے جی گھبرا رہا تھا۔مگر لکھنا ضروری تھا تبھی تو سب سے آخر میں انہیں رکھنا پڑا۔ اس سے پہلے ان کے ساتھ کئی اوروں کے بارے میں لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اس کے بعد تمت بالخیر یا اختتامیہ لکھنا تھا۔مگر روز بروز اس عزم بالخیر میں کندی اور پستی کے آثار معلوم ہو رہے ہیں۔کیونکہ: چوشد ہفتاد جانت آید از کار۔

مگر میں تو اب ہفتا دوہشت کو پہنچا ہوں۔ یہ شاید جدید سائنس کی برکت سے۔مگر ہمارے یہاں لوگ زندگی کے اچھے حالات نہ ہونے کے باوجود سینچری بنا کر ایک سو بیس، تیس کو جا پہنچے ہیں۔

1954 کے وسط میں یعنی جولائی کا مہینہ تھا۔کراچی میں مون سون کا زور شور تھا۔کراچی کینٹ سٹیشن پر احباب نے الوداع کیا۔میں اپنے مختصر خاندان کے ساتھ ریل کے راستے چل پڑا۔ بہت سہانا موسم تھا اور ملیر اور اس سے آگے کا علاقہ بارش کی وجہ سے بے حد خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ بالکل ماروی کا ملیر لگ رہا تھا۔یحیٰی خان اور پھر ایوب خان کے یکے بعد دیگرے تختہ الٹانے کے عمل

نے تباہی مچادی تھی۔سوویت سفارت خانہ کے شعبہ اطلاعات میں جہاں میں کام کررہا تھا، میری غیر موجودگی میں کافی ہاؤس کے پاس واقع بندر روڈ کے ساتھ قریب بیس وکٹوریہ روڈ پر سیروز پریس میں پولیس اور سی آئی ڈی نے ہلہ بول کر سوویت اطلاعات کے ماہانہ ''سوویت یونین'' جو کہ شائع ہو چکا تھا، دفتر لے جانے کے لیے تیار کیا گیا تھا، اٹھا کر لے گئے۔نہ جانے مجھے کیوں گرفتار نہیں کیا گیا۔شاید سفارت خانہ میں ملازمت کی وجہ سے دوست یہی سمجھتے تھے۔بہر کیف میں بچ گیا حالانکہ متواتر پیچھا کیا جاتا تھا۔ اور پھر سی آئی ڈی کی نظر ہر وقت رہتی تھی۔ چلو اچھا ہوا ورنہ میری بیوی، چھوٹی اور اکلوتی بیٹی، آزاد کا بیٹا جسے میں نے گاؤں سے منگوایا تھا۔ یہ دیہاتی لوگ پریشان ہو جاتے۔مگر سلام صاحب (میرے دکنی دوست) مجھے یقین ہے کہ انہیں خیریت سے کوئٹہ یا میرے گاؤں پہنچا دیتے۔

اس بد بخت مارشل لا نے اس مملکت خدائیداد کا انجر بنجر کر کے رکھ دیا۔کیا خوب سماج آگے بڑھ رہا تھا۔برصغیر کی تقسیم بے حد نا خوشگوار تاریخی واقعہ تھا جس سے سوائے اہلِ ثروت اور اپنی عاقبت سنوارنے والوں، دولت حاصل کرنے والوں اور جاہ طلب لوگوں کے علاوہ، دونوں بازوؤں کا زیان ہوا۔دونوں اب دن بہ دن غربت کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ہر قسم کی تباہ حالیوں سے دو چار ہیں۔اگر اس حقیقت کو بھی کوئی نہیں مانتا تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سورج نہیں نکل سکتا۔البتہ ابتدا میں چند سال صرف چند سال، یعنی اس بد تمیز مارشل لا لگنے سے پہلے ملک اچھا چل رہا تھا۔سماج میں ترقی نظر آ رہی تھی۔'

'سوویت خبریں'' بند ہونے کے بعد میں دفتر میں بے کار رہا۔ضمیر نے کہا اب کراچی میں رہنا بے معنی ہے۔انقلابی تو تھا ہی۔بھوک اور بے روزگاری سے نہیں گھبراتا تھا۔سوچا بلوچستان میں جو ہم خیال ساتھی ہیں وہ سب تو جیل میں پڑے ہیں۔انجم اور کامل القادری کو تو شاہی قلعہ لاہور بھیجا گیا تھا۔غلام محمد شاہوانی 2 ستمبر 1958 میں وفات پا گئے تھے۔بزنجو صاحب، گل خان، ملا سعد اللہ، بہادر خان بنگلزئی، حاجی سلطان احمد بنگلزئی، گوہر خان زرک زئی اور ان کے کئی اور ساتھی جونامور لیڈر نہ تھے، مگر سب سے زیادہ مصیبتیں انہوں نے سہیں۔مصیبت میں تو سب تھے۔کیونکہ

بلوچستان میں پہلی فوجی اذیت گاہ قلی کیمپ میں قائم کی گئی تھی۔اور ان کے جلاد شیر علی باز تھے۔نہ جانے بریگیڈیئر تھے یا کرنل، سختی اور مردم آزاری میں شہرت پیدا کی انہوں نے۔اور ان کی رہنمائی اور مدد کے لیے ہمارے نوشکے اور چاغی ملیشیا کے ایک صوبیدار ہمراہ کر دیے گئے تھے۔وہ بھی بہت قابلِ نفرت سمجھے گئے۔ مجھے سرکاری نوکری چھوڑنے کے بعد اب یہ دوسری غیر سرکاری نوکری چھوڑنی پڑی۔بہر کیف، کیا تو کچھ نہیں۔صرف دوستوں کے سامان (ان اشیا کی جن کی اجازت شیر علی باز نے دی تھی) قلی کیمپ پہنچایا کرتے تھے۔میر عبدالواحد کرد کوئٹہ آیا تو ملک عثمان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ان کی دعوت کھائی۔وہ بھی مستعفی سرکاری افسروں میں سے تھے۔لٹ خانہ سے ان کو گہرا لگاؤ رہا تھا۔ترقی پسند اور انسان دوست تھے۔ان کو میری بے کاری کی خبر اچھی لگی اور عبداللہ جان کاسی سے مل کر انہوں نے منصوبہ بنانا شروع کیا۔

لٹ خانہ کے چھٹ جانے سے پرانا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ڈاکٹر خدائیداد، اب صاجی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔عبداللہ جان کاسی کے پاس سکھر گئے تھے۔ میں بہت پہلے مکران کی یاترا کرتے ہوئے کراچی ماہنامہ بلوچی کے دفتر بڑے بھائی آزاد کے پاس پہنچا تھا۔ اور بعد میں قادر بخش نظامانی کی مدد سے سوویت دفتر اطلاعات میں ملازم ہوا تھا۔آخر کب تک کوئٹہ رہ سکتا تھا۔بچوں کو گاؤں پہنچایا اور کبھی کبھار کوئٹہ دوستوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آتا جاتا۔1959 کے دسمبر میں مجھے ملک محمد عثمان کا پیغام ملا کہ میں یکم جنوری 1960 کو ضرور ان سے ملنے کوئٹہ جاؤں۔چنانچہ میں کوئٹہ گیا، ان کے گھر۔پتہ چلا کہ انہوں نے ایک میڈیکل سٹور جس کا نام انہوں نے ''چلتن میڈیکل سٹور'' رکھا تھا، جو قندھاری بازار میں ہے۔اس طرح لٹ خانہ کے بعد بلوچستان میں دوسری مرتبہ کاروبار کے نام پہ شروع ہونے والا یہ میڈیکل سٹور سیاست کا اڈہ بن گیا۔اس مرتبہ ساتھی ملک عثمان تھے۔

یکم جنوری 1960 کی وہ رات کیا خوبصورت رات تھی۔ہم چلتن میڈیکل ہال کی خالی دکان کو بند کر کے چہل قدمی کے لیے جناح روڈ کی خالی سڑک پر گھومتے ہوئے روانہ ہوئے۔سخت سردی کی رات تھی۔بازار بند ہو چکے تھے۔پہلی مرتبہ ملک عثمان اور ان کے نیک دل اور خوش طبع

دوستوں کی محبت میسر ہوئی۔ میرے اور ملک عثمان کے علاوہ ستار جان (عبدالصمد درانی کے چھوٹے بھائی) نصر اللہ جان خلجی، واحد (ریلوے کے محکمہ میں ٹکٹ کلکیٹر تھے) اور شاید اکبر جان (ملک عثمان کے کوئٹہ کالج کے سابقہ کلاس فیلو) اور ان کے ہمراہ نسیم صاحب۔ میرا تعارف ملک صاحب نے پہلے ہی ان سے کرایا تھا۔ ان میں سے اکثر میرے نام سے واقف تھے۔ ستار جان سے تو عبدالصمد درانی کی وجہ سے برسوں سے آشنائی تھی۔ بے حد خوش طبع نوجوانوں کا گروپ تھا۔ ہنستے ہوئے اور مذاق کرتے کرتے ملک عثمان کے مکان واقع بھیک چند روڈ پہنچے۔ ملک صاحب کے بچے اور گھر والے کوئٹہ موجود نہ تھے۔ سردیوں میں انہیں اور اپنے بچوں کو عبداللہ جان کاسی نے اپنے یہاں سکھر بلا لیا تھا۔ نہ جانے ملک صاحب نے کس طرح لاندی کی دعوت کی تھی۔ لاندی کے چربی دار بڑے بڑے قتلے دسترخوان پر پھیلائے گئے۔ ملک صاحب کا چھوٹا بچہ خدمت گزار تھا۔ کوئلہ کا سٹو (کیونکہ اس وقت تک کوئٹہ میں گیس کا بندوبست نہ تھا) جل رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کان اور ناک گرم ہونے لگے۔ کھانا خوب کھایا اس کے بعد انار کھائے۔ اگلے روز نہا دھو کر چلتن میڈیکل ہال گئے۔ ملک صاحب نے یہ دکان پگڑی پہ لی تھی۔ اب یاد نہیں تیس ہزار میں یا ساٹھ ہزار میں۔ پہلے یہ دکان جنرل سٹور رہا تھا۔ یہ دکان، سٹور اور اس کے علاوہ جیل روڈ پر ایک اچھا خاصا بنگلہ۔ مالک دکان نہایت نفیس تھا اور پھر ملک عثمان کے حسنِ اخلاق کو دیکھ کر اور مہربان ہوا ہوگا۔ ملک عثمان کا اصل گھر سمنگلی میں تھا۔ اس گھر، اراضی اور باغات کا تعلق سمنگلی کے کاسیوں سے تھا جو ملک کے لقب سے یاد کیے جاتے۔ کوئٹہ کے کاسی ارباب کہے جاتے ہیں اور سرکیوں کے علاقہ کے بھی ملک کہے جاتے ہیں۔

سمن گل، ان ملکوں کے دادا تھے اور انہی کے نام سے ان کا گاؤں سمنگلی مشہور ہوا اور اب کوئٹہ میں ایئر پورٹ اور PAF کا بیس اسی نام سے ہے۔ ان مقاصد کے لیے حکومت کو اس علاقہ کے جو بیشتر کاسی ہیں۔ ان کی اراضی حاصل کرنے کی ضرورت ہوئی تاکہ یہاں ایئر پورٹ اور پی اے ایف کا ایئر بیس تعمیر کیا جائے۔ بہت عرصہ کی گفت وشنید کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ سرکار کو اراضی فروخت کی جائے۔ اور ایسا ہی ہوا ملک صاحب کو ان کی فروخت شدہ زمین کی رقم ملی اور انہیں ایک

میڈیکل سٹور کے کھولنے اور مجھے بلانے کی ضرورت پیش آئی۔ جب دکان میں داخل ہوئے تو پتہ چلا بہت سارا کام ملک صاحب نے خود اور دوسرے دوستوں کے ہمراہ کر دیا تھا۔ یعنی سٹور کی سابقہ الماریوں کا رنگ و روغن، چلتن میڈیکل ہال کا بورڈ، دروازوں پر کیمسٹ ڈرگ کے الفاظ ہر جانب سے لکھوائے گئے تھے۔ اس کے بعد ہمارے لٹ خانہ کے پرانے دوست اور ساتھی آدم علی حسن ریڈیو والے کے چھوٹے بھائی جن کی الیکٹرک سامان کی دکان سورج گنج میں اب بھی ہے، سیف الدین بوہرہ کو جا کر لائے۔ انہیں کہا گیا کہ دکان میں جتنی ٹیوبز کی ضرورت ہے، لگوا دی جائیں۔ تاکہ چلتن میڈیکل سٹور روشنی کا مینار نظر آئے۔ چلتن، نام ملک عثمان نے پہلے ہی سے سوچ کر رکھا تھا۔ وہ چلتن کو بلوچستان کا اہم پہاڑ سمجھتے تھے اور بلوچ، پشتون کا مشترکہ نشان تصور کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے چلتن پہاڑ کا ایک خوبصورت اور رنگین فوٹو جس میں برف سے اس کی چوٹیاں ڈھکی ہوئی تھی، کہیں سے ڈھونڈ کر پہلے ہی سے ایک طرف دروازے کے شوکیس میں رکھا تھا۔

ملک عثمان نے کاروبار شروع کروانے سے پہلے مجھے سیٹ کرنے کی کوشش کی۔ مجھے کہا دکان ہم دونوں کی مشترکہ ملکیت ہے (اگرچہ ہم دونوں میں ملکیت کا کوئی واضح تصور نہ تھا) ملک عثمان نے میرے لیے مکان کی تلاش شروع کی تاکہ میں اپنی فیملی جو بہت مختصر تھی، اسے منگوا سکوں۔ تلاش کے چند ماہ بعد اپنے ایک عزیز کے مکان کا پتہ چلا یا جو منو جان روڈ ہدہ میں واقعہ تھا اور اس رشتہ دار کا نام ہے ارباب تاج محمد اور جو ہدہ کے ارباب خیل کاسیوں سے ہیں۔ گھر بالکل اس مکان سے منسلک تھا۔ اسے ارباب تاج محمد نے اپنے سیبوں کے سٹور کے طور پر استعمال کیا تھا۔ طے یہ پایا کہ جب تک یہ سیب فروخت ہو سکیں گے مجھے انتظار کرنا ہوگا۔ اس وقت تک ملک صاحب نے مجھے اپنے گھر میں اپنے ساتھ رکھا۔ ملک صاحب نے مجھے ساتھ لے جا کر برٹش ویئر ہاؤس جو کوئٹہ کلاتھ مارکیٹ میں واقعہ تھا اور جو فیشن ایبل سرکاری ملازمین کے لیے برٹش (مانچسٹر) کے گرم کپڑے، سوٹ کے لیے منگواتا تھا اور فروخت کرتا تھا۔ ملک صاحب کو اچھے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا اور ہر لحاظ سے باذوق انسان تھے۔ میرے کوٹ کے لیے بہت خوبصورت انگلش گرم چیک کا کپڑا لیا اور پینٹ کے لیے گہرے سلیٹی رنگ کا گرم کپڑا اور مجھے ساتھ ٹیلروں کے پاس

لے گئے۔ نقشبند جو بلوچی سٹریٹ کا رہنے والا تھا، کوٹ انہیں سلوانے کے لیے دیا۔ اور پھر اسی ٹیلرز کی گلی میں کسی اور دکان میں لے جا کر کہ پتلون سب سے بہتر ولی محمد (سریاب کا شاہوانی تھا) سیتا ہے اور ملک صاحب اور اس کے احباب انہی دو سے اپنے گرم کپڑے اور سوٹ سلوایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ میرے لیے بوٹ اور ایک خوبصورت ٹائی بھی خریدی۔ اس دوران میں نے مختلف میڈیکل نمائندوں اور میڈیکل سٹورز سے ادویات کی مشہور کمپنیوں کے ایڈریس حاصل کیے۔ پھر ان کے بہت ہی عزیز اور پیارے دوست اکبر جان نے مشورہ دیا کہ بندر روڈ کے قریب ان کے بھائی اسلم جان کے پاس جاؤں اور ان سے کہوں کہ وہ مجھے کوپر Cooper سے جو تمام کمپنیوں سے واقف ہے، ملوادے۔ وہ میری ہر طرح سے مدد کریں گے۔ چنانچہ میں بھی نہایت مسرور اور ملک صاحب کے حسن سلوک اور پیار محبت سے ہپنا ٹائز Inspire ہو کر بڑے ذوق وشوق سے کراچی روانہ ہوا۔ وہاں بندر روڈ پر واقعہ جاگیردار ہوٹل میں قیام کیا۔ ایک ہفتہ میں تمام بڑی بڑی کمپنیوں کو ڈھونڈ نکالا اور اہم ادویات کے آرڈر پیش کیے۔ اہم ادویات کے بارے میں ملک صاحب کو معلومات دیں۔ سلیم میڈیکل ہال، کوئٹہ میڈیکل ہال، بابر میڈیکل ہال اور رازی فارمیسی کے مالک خود آ کر ملک صاحب کو ہر قسم کا مشورہ فراہم کرتے۔ ملک صاحب کی ہر جگہ اور ہر انسان نہایت احترام سے عزت کرتا۔

کوپر Cooper سے اسلم جان نے ملوایا اور مجھے اپنے گھر لے گئے جو پارسی کالونی میں تھا۔ ماما پارسی سکول کے عقب میں ہوشنگ کوپر Cooper تھے۔ بہت بوڑھے اور نہایت تجربہ کار اور نہایت ہی انسان دوست آدمی تھے۔ گھر میں مجھے اپنی فیملی۔ بچوں، بچیوں سے ملوایا اور بتایا کہ میرے محترم دوست اسلم جان کے عزیز ہیں۔ غرض بوڑھے کوپر Cooper نے ہر لحاظ سے مجھے مشورے دیے اور میری ہر طرح مدد کی۔ زندگی میں کسی زرتشتی پارسی گھر میں میرا داخل ہونے کا پہلا اور آخری واقعہ تھا۔ پارسی کس قدر ملنسار، مہذب، انسان دوست لوگ ہیں!!۔

میں نہایت اطمینان سے اپنا کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر کوئٹہ واپس ہوا۔ ملک عثمان صاحب میرے انتظار میں تھے۔ وہ خود بولان میل سے مجھے سٹیشن سے اپنی گاڑی میں لے گئے۔ ان

کے بال تو میرے لیے ہمیشہ دلکش رہے۔ کرل (Crule) تھے اور سیاہ اور کوئٹہ کے قابل ہیئر کٹر نواب سے بنوایا کرتے۔ ملک صاحب کی ایک عجیب عادت تھی جس قدر سردی ہوتی وہ اس عادت سے دست بردار نہ ہوتے۔ بال ضرور روزانہ دھوتے۔ بالوں کا خوب خیال رکھتے۔

آخر ادویات کے پارسل آنے شروع ہوئے۔ اس وقت تک ملک صاحب نے ایک نہایت فرمانبردار شائستہ سیل مین ظہیر صاحب (ہندوستانی) کو دکان میں لگا دیا تھا۔ اس طرح امین الدین پیرامیڈیکل کالج کے ایک سند یافتہ ڈاکٹر یوسف صاحب کو بطور کوالی فائیڈ دکان میں لے آئے تھے۔ ہم سب دن بھر ملک صاحب کے ہمراہ پارسل جو ظہیر صاحب سٹیشن سے لے آتے کھولتے جاتے اور انہیں الماریوں میں سجاتے۔ اسی اثنا میں میرے گھر میں ادریس کی وفات کے بعد (جس کا ذکر میں نے پہلے ہی لٹ خانہ لکھتے وقت کیا تھا) دوسرا بیٹا جیئند خان پیدا ہوا۔ اس وقت تک تاج محمد نے بتایا کہ مکان خالی ہوا ہے۔ اسے چونا اور رنگ کر کے تیار کیا گیا ہے تا کہ میں اپنے بچے نوشکی سے کوئٹہ لے آؤں۔ چنانچہ ملک صاحب کے کہنے پر میں نوشکی گیا اور نہایت خوشی میں اپنی فیملی جیئند خان، ان کی بڑی بہن اور والدہ کو لے آیا۔ اور ملک صاحب کے گھر پہنچایا۔ کچھ روز وہاں رہ کر پھر ملک صاحب نے ہمیں اپنی کار میں منو جان روڈ ہدہ پہنچایا۔ جہاں ارباب تاج محمد نے ہمارے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ مکان میں کوئٹہ کے سیبوں کی خوشبو باقاعدہ برقرار تھی۔ پھر ملک صاحب نے اپنی بڑی بچی کو جو چھ سات سال کی تھی، سینٹ جوزف گرلز کالج میں داخل کروایا۔ میں نے لاکھ کہا کہ اس قدر خرچہ کی کیا ضرورت۔ گورنمنٹ گرلز کالج ہدہ ہی بہتر ہوگا۔ مگر وہ نہ مانے بتایا کہ میری اور عبداللہ جان کی بچیاں اسی سکول سینٹ جوزف میں پڑھتی ہیں، آپ کی بچی بھی یہیں پڑھے گی۔ تعلیم اور اعلیٰ تعلیم ضروری ہے۔ چاہے ہم خود تکلیف میں ہوں۔ پھر بچیوں کی تعلیم اور بھی ضروری ہے۔

دکان بھی خوب سیٹ ہوئی ہم (خصوصاً میں بھی) سیٹ ہوئے۔ دوست ڈاکٹروں نے ہماری طرف خصوصی توجہ دی اور ادویات کے لیے پریس کرپشن (چٹ) آنے شروع ہوئے اور ہم نہایت لگن سے مل کر کاروبار کرنے لگے۔

ماہنامہ ''سنگت''، کوئٹہ۔ جولائی 2000

۳۶

ملک عثمان کاسی کو سیاست سے بہت لگاؤ تھا۔ لہٰذا چلتن میڈیکل ہال میں سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کا آنا جانا ہمیشہ رہتا تھا۔ ساتھ ہی میری چونکہ کمیونسٹ حضرات اور ترقی پسند دوستوں سے نسبتاً بیشتر وابستگی تھی لہٰذا ملک بھر سے جب کبھی کسی جگہ سے ان دوستوں کا کوئٹہ میں آنا ہوتا تو مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے چلتن میڈیکل ہال پہنچ جاتے۔ چنانچہ ایسے دوست جو ریپ یعنی ادویات کی کمپنیوں کی نمائندگی کرتے، وہ ضرور چلتن میڈیکل ہال مجھ سے ملنے آتے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ میرے بہت ہی پیارے دوست اعئیز جو مشہور لیفٹننٹ مرحوم ڈاکٹر اعزاز نذیر کے چھوٹے بھائی ہیں، جب بھی کوئٹہ آتے تو مجھ سے ضرور ملنے میڈیکل سٹور آتے۔ اس طرح نام یاد نہیں، ایک اور مہربان دوست مولا بخش (بخش کا لفظ ان کے نام سے وابستہ ہے)، اب شاید فوت ہو گئے ہیں۔ کسی وقت میں نواب شاہ سے اردو یا سندھی میں اخبار شائع کیا کرتے تھے۔ اخبار کا نام آزاد تھا۔ وہ بھی ملنے آتے۔ اسی طرح ابراہیم عباسی جن سے خیر پور میں اعئیز اور اعزاز نذیر کی وجہ سے واقفیت ہوئی تھی، وہ بھی کسی فرم کے نمائندہ تھے، وہ بھی آیا کرتے۔ دیگر کئی احباب مثلاً طلبا تحریک کے

چند احباب جو کراچی بدر ہوئے تھے، ان میں اقبال میمن، جوہر حسین، معراج محمد خان کوئٹہ آئے تھے۔ جوہر تو اپنے محترم والد کرار صاحب کے یہاں رہتے جو گورنمنٹ ڈگری کالج کے پرنسپل تھے۔ معراج محمد خان کا تو گھر ہی کوئٹہ میں تھا۔ لہٰذا گھر میں رہتے۔ اقبال میمن، فتح یاب علی خان اور ایک ان کے ساتھی جو لالوکھیت میں رہتے تھے اور بعد میں بھاشانی صاحب کی نیپ میں شامل ہوئے، اب نام ذہن سے اتر گیا ہے، ان کے لیے ہم نے جگہ تلاش کی اور انہیں وہاں ٹھہرایا۔ ملک عثمان نے انتہائی مہربانی اور محبت سے، مجھ سے بڑھ چڑھ کر مدارات کی اور ان کی ہر طرح کی مدد کی۔ وہ کچھ عرصہ رہ کر واپس کراچی اور سندھ چلے گئے۔ اس طرح ترقی پسند ادیب کسی بھی زبان کے ہوتے ہم دونوں سے ملنے آتے۔ ملک صاحب کے لیے سب زبانیں برابر تھیں۔ وہ سب زبانوں سے محبت کرتے اور ان ادیبوں کی مدد کرتے۔

چلتن کی ایک اور بہت ہی محبوب اور پُر کرشمہ شخصیت اور انسان (نوجوان) اکثر چلتن میڈیکل ہال آتے۔ ہم دونوں سے ان کو بہت محبت تھی۔ یہ نامی گرامی پشتو ادب کے بڑے محقق اور ادیب، سلطان محمد پانی تھے۔ پانی صاحب کی شخصیت انتہائی متاثر کن اور پرکشش تھی۔ بہت ہی نیک انسان تھے۔ پھٹا ہوا ان کا کوٹ اور پھٹے ہوئے ربڑ کے جوتے اور اسی طرح کے کپڑے اور ٹوپی ہوا کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ پشتو ادب اور تاریخ پر تحقیق کے کام میں محو رہا کرتے تھے۔ حالانکہ پانیزئی قبیلہ کے سردار مرحوم خان بہادر حاجی وہاب خان کے پوتے اور سردار میر احمد خان کے بیٹے تھے۔ گھر سے بدر رہتے۔ ان کے والد اور فیملی کے بزرگ ان سے ناراض تھے کہ وہ کچھ ٹھیک کام نہیں کرتے۔ مثلاً والد کی طرح ٹھیکیداری کرتے مگر وہ اپنے عشق میں مصروف تھے۔ شادی نہیں کی اور جواں مرگ ہوئے۔ اسی کم دستی اور پریشانی کے باوجود انہوں نے ایک رات ملک عثمان اور میرے لیے لاندی کی دعوت میں اپنے گھر بلایا جو خدائیداد روڈ میں واقع تھا۔ یہ ان کی عظمت اور محبت کی مثال تھی۔ پانی بہت عظم انسان تھے۔ سلطان محمد پانی کے مضامین اکثر ''پشتو الس'' مجلّہ میں شائع ہوتے۔ اور ایک اور محترم اور عظیم انسان نذیر اس مجلّہ کے خوش نویس تھے۔ بہت ہی خوبصورت پشتو کی کتابت کرتے۔ بعد میں کراچی گئے۔ وہاں ایک روز میرے گھر انہیں سید کامل

القادری لے آئے تھے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ملک عثمان خود عظیم انسان تھے اور ایسے عظیم انسانوں کی قدر کیا کرتے تھے۔

ایک اور ان کے پرانے دوست ہمیشہ چلتن میڈیکل ہال میں اکثر شام کے وقت موجود ہوتے تھے۔ وہ عمر میں ہم دونوں سے بڑے تھے اور اب کوئٹہ میں اپنے بیٹوں کے ساتھ جو سیکریٹریٹ میں کلرک تھے، رہا کرتے تھے۔ لیکن ملک عثمان سے انہیں بے حد محبت تھی اور ملک صاحب بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کا نام لالاگل باران تھا۔ وہ پشین کے سنزرخیل کاکڑ تھے۔ وہ اور ملک صاحب آپس میں بہت مذاق کیا کرتے اور خوش گپیوں میں ہمیں بڑی مسرت ملتی۔ ملک صاحب کو سینما دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ کبھی تو وہ، نواب خیر بخش اور میں اور کبھی وہ اور لالاگل باران ریگل انگلش فلم دیکھنے جاتے۔

ایک مرتبہ ملک صاحب ہمیں مشہور فلم ''بوڑھا آدمی اور سمندر'' مشہور ادیب ہیمنگوے کے ناول کو فلمایا گیا تھا، دکھانے لے گئے۔ بہت ہی اچھی اور دلچسپ فلم تھی۔ فلم ختم ہونے کے بعد لالاگل باران نے بہت دلچسپ ریمارک دیا اور ملک صاحب کا مذاق اڑایا کہ کیا فلم دکھائی تم نے، شروع سے آخر تک بوڑھے اور شارک کی لڑائی تھی اس میں، اس کا نام 'اولڈ میں اینڈ دی سی' کے بجائے، دی فش اور سی ہونا چاہیے تھا۔ مطلب ملک صاحب ایک ایسے پاک دل اور پاک انسان تھے۔

ملک صاحب کی سیاسی دلچسپیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ان دنوں بہت سارے سیاسی دوست پہلے تو بدنام زمانہ فوجی اذیت گاہ قلی کیمپ میں تھے، جو بعد میں ڈسٹرکٹ جیل کوئٹہ اور پھر سنٹرل جیل مچھ بھجوائے گئے۔ عبدالصمد خان اور عبدالکریم خان اور عنقا صاحب ضلع ہزارہ کے ہری پور جیل میں تھے۔ بزنجو صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ شاید اس وقت مچھ جیل میں تھے۔ حکومت نے کچھ عرصہ پہلے ہی سیاسی پابندیاں اٹھالی تھیں۔ اور الیکشن اپنے ڈھب کے کرائے تھے۔ یعنی بنیادی جمہوریتوں کے جس میں K.B (خیر بخش) اور عطا اللہ خان اور احمد نواز اور باقی بلوچ برائے نام قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی میں گئے تھے۔ جن کا ذکر تفصیل سے میں نے لکھا ہے۔ قلی کیمپ میں سیاسی لوگوں کو ٹارچر کرنے کے لیے دو مرتبہ لے گئے تھے۔ یہ بدبخت اذیت گاہ

بدستور بلوچستان میں کوئٹہ چھاؤنی میں برقرار ہے اور لوگ اس کی اذیتوں کے شکار کیے جاتے ہیں۔ شاہی قلعہ سے تو نجات حاصل ہوئی مگر قلی کیمپ سے اب تک نجات نہیں ملی۔ انسانی فکر بھی عجیب ہے، اقتدار کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ زندہ انسانوں کی کھالیں اتار دی جاتی ہیں۔ آنکھوں میں لوہے کی سرخ اور جلتی سلاخیں ڈال دی جاتی ہیں۔ نہ جانے انسان کب انسان بنیں گے؛ ملک عثمان جیسے۔

ملک عثمان کو نہ جانے کیسے خیال آیا کہ نیپ پر سے پابندیاں ہٹ گئی ہیں کیوں نہ ہم اسے دوبارہ بحال کریں۔

اس وقت پاکستان ون یونٹ کی وجہ سے دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ بیچارہ پاکستان اور اس کے مظلوم انسان کیسی کیسی آفات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ایک مشرقی پاکستان بنایا گیا، اور ایک مغربی۔ کس نے بنایا؟ پاکستان کے مظلوم عوام نے نہیں۔ اقتدار کے بھوکوں نے، نوابوں، سرداروں، وڈیروں اور چودھریوں کے نمائندوں اور انہی کی سیاسی پارٹیوں نے۔ بھٹو صاحب تو اس قدر اقتدار کے لیے پاگل ہوئے کہ انہوں نے برملا کہہ دیا جو مشرقی پاکستان اسمبلی میں شرکت کے لیے جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔

بہرکیف ہم تو مغربی پاکستان میں تھے۔ اور پھر یہاں دو ڈویژن تھے؛ ایک کوئٹہ ڈویژن اور دوسرا قلات ڈویژن۔ ملک صاحب نے سوچا کہ کوئٹہ ڈویژن میں نیپ کو بحال کیا جائے۔ وہ تھے تو دھن کے پکے۔ چلتن کے قریب سامنے والی دکانوں کی قطار میں اوپر کی منزل میں ایک دفتر لیا۔

اس وقت مرحوم صادق شہید، نوجوان خوبصورت، نیک اور پرعزم صادق، وہ بھی کاسی تھے۔ ملک عثمان کے عزیز اور دوست، ان کو ساتھ لے کر اب پکا پروگرام بنا کہ کوئٹہ ڈویژن میں نیپ کو بحال کریں گے۔ میرے خیال میں باقی ملک میں نیپ بحال کی گئی تھی۔ چنانچہ خیر بخش مری کی بیٹھک میں ایک میٹنگ ہونی قرار پائی۔ صادق اور عثمان نے خیر بخش کو بھی اس بات پر راضی کیا تھا کہ نیپ کو بحال کیا جائے۔ میٹنگ میں خیر بخش، عثمان اور صادق کے علاوہ میر عبدالواحد کرد، خالد کاکڑ، وکیل میر اکرم خان مینگل، ملک شیر محمد غلزئی اور میں موجود تھے۔ مجھ سے کہا گیا یا شاید میں اور

ملک عثمان ان کی گاڑی میں کوئٹہ کے مشہور اور نیپ کے معاون وکیل مرحوم حنفی صاحب اور ان کے رفیق ایک اور وکیل جن کا نام اب یاد نہیں، جو بعد میں بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے، اور بھٹو صاحب نے انہیں بلوچستان کا چیف جج مقرر کیا، انہیں میٹنگ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔مگر انہوں نے دعوت قبول نہیں کی۔ہم واپس ہوئے اور میٹنگ میں شمولیت کی۔ملک صادق اور ملک عثمان نے پروگرام یوں بنایا تھا۔بلکہ ملک عثمان نے طے کیا اور خیر بخش کو صدر بنایا گیا۔ملک صادق کو نائب صدر، خالد خان کاکڑ وکیل کو جنرل سیکرٹری اور مجھے خزانچی بنایا۔اور یہ طے ہوا کہ ایک جلسہ کیا جائے گا جس میں دوسرے صوبوں کے لیڈروں کو شمولیت کی دعوت دی جائے گی۔پھر نیپ کے نئے دفتر میں قلات ڈویژن کے لیڈروں کو دعوت دے کر بلایا گیا تھا۔ ان کے اکثر لیڈر اور ساتھی جیل میں تھے، میر غوث بخش وغیرہ۔میر گل خان نوشکی تحصیل میں محدود کردیے گئے تھے۔ صرف (جہاں تک مجھے یاد ہے) میر لعل بخش قلات سے اور محمود جان کرومستنگ سے آئے تھے۔ انہوں نے آکر بتایا کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے ڈویژن میں نیپ کو اس وقت تک بحال نہیں کریں گے جب تک کہ ہمارے دیگر ساتھی جیل سے رہا نہیں ہوتے۔مگر آپ کے جلسے میں ضرور شرکت کریں گے۔

چنانچہ مشرقی پاکستان سے بھاشانی صاحب کو جو نیپ کے صدر تھے، کوئٹہ میں جلسہ میں شمولیت کی دعوت دی۔محمود الحق عثمانی جو نیپ کے جنرل سیکرٹری تھے، انہیں اور محمود علی قصوری کو پنجاب سے بلایا تھا۔بھاشانی صاحب نے تو اطلاع دی کہ وہ مصروفیت کی وجہ سے کوئٹہ نہیں آسکتے۔ البتہ عثمانی صاحب اور قصوری صاحب نے شمولیت کی اطلاع دی۔

ملک صادق کے گھر میں ایک اور میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ ملک حاجی شیر محمد خان غلزئی کے ایک بڑے پلاٹ میں جو اُن کے گھر کے قریب پیر محمد خان روڈ پر واقع تھا، نیچاری میں یہ جلسہ ہوگا۔یہ پلاٹ چاروں طرف سے دیواروں سے محفوظ تھا۔

اُس وقت یہ پابندی تھی حکومت کی طرف سے کہ صرف چار دیواری اور بند جگہوں میں جلسے کیے جاسکتے تھے۔

جلسہ ہوا۔اور اس کے بعد نیپ کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔اس میں ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ خان عبدالصمد خان جو جیل میں تھے اور بلوچستان کے عظیم فرزند اور سیاسی زندگی شروع کرنے والوں میں سے تھے۔اور کوئٹہ ڈویژن کے مارشل لا لگنے سے پہلے کے صدر تھے۔ قلات ڈویژن کے صدر شہزادہ عبدالکریم خان تھے۔وہ بھی کئی اور دوستوں کے ہمراہ جیل میں تھے۔ قلات ڈویژن والوں نے دانشمندی کی کہ اپنے ساتھیوں کی رہائی تک نیپ بحال نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس جلد بازی کے نتائج بہت بھیانک نکلے، جنہوں نے بلوچستان کے عوام کو نیپ کو توڑنے اور عبدالصمد خان کو علیحدہ پارٹی بنانے پر مجبور کیا۔یقیناً اس فیصلہ سے وہ خوش نہیں ہوں گے۔

جب الیکشن (یحییٰ خان کے دور کے) ہوئے۔اس کے بعد بھی خان شہید کو سرداروں کی پارٹی نے بشمول بزنجو صاحب اور میر گل خان نصیر اور دیگر بلوچ لیڈروں نے، خان عبدالصمد خان کو نظر انداز کیا اور صدر خیر بخش مری کو بنایا۔اس خودغرضی کے نتائج بہت برے برآمد ہوئے۔اور صمد خان نے پرزور احتجاج کرکے نیپ پشتونخواہ بنایا۔ملک صادق اور عثمان کو، عبداللہ جان کاسی کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔یہ دونوں پہلے بلوچ لیڈروں کے طرف دار تھے۔بعد میں الیکشن کے بعد عبداللہ جان نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔وہ تو زیادہ عرصہ پارٹی کے معاون نہیں رہے تھے۔بہر کیف، اس سیاست نے بلوچستان کے عوام میں بلوچ پشتون مسئلہ کھڑا کر دیا، جو طلبا تک سرایت کر گیا۔اور اس خودغرضانہ سیاست اور جاہ طلبی نے (لیڈروں کی) مظلوم اور پسماندہ عوام میں تباہی مچادی۔ یہاں تک کہ پھر قتل و غارت گری شروع ہوگئی۔اس میں بھی لیڈروں کو تو کچھ نہیں ہوا۔غریب عوام، مزدور اور ریڑھی والے مارے گئے اور چند اچھے کارکنوں کی جان گئی۔

اس طرح نسل پرستی اور تنگ نظرانہ قوم پرستی نے بلوچستان کے عوام کو بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا۔

اس صورت حال نے ملک عثمان اور ہم سب پر بہت برا اثر کیا۔ملک عثمان کے ذہن پر اس تقسیم در تقسیم نے ایسا اثر کیا کہ وہ زندگی کے آخری دنوں میں ذہنی توازن سے محروم ہوئے۔اور

بات تک نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح ہم ایک بہت ہی نیک انسان کی نیکیوں سے محروم ہوئے۔ ان پر اگر تفصیل سے لکھوں تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ جو میری موجودہ ذہنی اور جسمانی صورت حال کے لیے ممکن نہیں۔

بس جو کچھ لکھ سکا۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ چلتن میڈیکل ہال کا ذکر اس لیے کیا کہ میرے خیال میں یہ لٹ خانہ سے وابستگی کا تسلسل تھا۔

ماہتاک ''سنگت''، کوئٹہ۔ اگست 2000

۳۷

جب ملک عثمان نے چلتن میدیکل ہال کا آغاز کیا تو اس وقت عجیب سیاسی دور تھا۔ ایوب خان صدر تھے اور نواب کالا باغ مغربی پاکستان کے گورنر۔ دونوں نہایت سخت گیر اور سخت منش انسان تھے۔ مگر کالا باغ نواب ہونے کے ناطے زیادہ کینہ پرور اور انتقام جو تھے۔ صدر ایوب حالانکہ مارشل لا لگا کر ملک کے بے تاج بادشاہ بن بیٹھے تھے، جو وہ کہتے وہی ہوتا۔ مگر کالا باغ کا دل کالا ہی تھا۔

عجیب بات ایک صاحب نے ایک مرتبہ بتائی۔ میرے خیال میں سردار شیر باز مزاری کے حوالے سے۔ جب NDP بنی اور شاید وہ صدر تھے۔ ملک عثمان NDP میں ان کے ہمراہ تھے۔ ملک صاحب شیر باز کے بڑے مداح تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کالا باغ سے سردار مزاری نے بلوچستان کے نوابوں اور سرداروں کی تعریف کی کہ وہ لوگوں کے خیر خواہ ہیں، ایسے نہیں ہیں جیسے حکومت کا خیال ہے۔ تو کالا باغ نے جواب دیا'' جناب آپ نوابوں کی کیا بات کرتے ہیں۔ میں خود کسی سے چھوٹا نواب نہیں۔ آپ ہمیں باہر سے نہ دیکھیں۔ ہماری باتوں پر نہ جائیں۔ ہمیں دیکھنا ہے تو ہمارے

علاقے میں آئیں۔اور دیکھیں ہم کیا ہیں اور اپنی رعایا سے ہمارا کیا سلوک ہے''۔

اس وقت ملک دو حصوں میں منقسم تھا۔مشرقی اور مغربی پاکستان کی صورت میں۔مشرقی پورا بنگال تھا اور بنگالی تھے۔مغرب میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان۔انہی حالات کے تحت پروگریسوز نے قوم پرستوں کو یکجا کر کے ملٹی نیشنل اور ملٹی کلاس پارٹی بنائی۔جو آج تک ہمارے گلے میں آویزاں ہے اور ان کی لیڈرشپ سے عوام رہائی نہیں پا سکتے۔جو چاہیں وہی کریں۔عوام تو بس بھیڑوں کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔اور جب صوبہ (جو اکثر ایسے ہیں بھی) قبائلی برادری اور جاگیرداری بندھنوں میں پھنسا ہو تو گلوخلاصی مشکل ہے۔

ہم دونوں (میں اور ملک عثمان) نیپ کے جانے پہچانے سیاسی آدمی تھے۔ہمارے پاس سیاست دانوں کا آنا جانا شروع ہوا۔ہمارے اپنے پرانے ساتھی اور نئے سردار لیڈر بھی۔انہیں اس سے کیا غرض کسی کا کچھ بگڑتا ہے۔کاروبار خراب ہوتا ہے۔جو اپنی لیڈری آ کر جماتے اور وہ تو جوان اور نڈر سیاسی کارکن سمجھے جاتے تھے۔خصوصاً ملک عثمان تو کچھ پرواہ نہیں کرتے۔گھنٹوں دکان میں مجلس اور سیاسی محفلیں جمتیں۔

ایوب خان نے بیسک ڈیموکریسی جیسی چیزیں رکھی تھیں۔یعنی فوجی طرز کی جمہوریت۔ان کے مفاد میں دو ہاؤس بنے تھے۔نیشنل اسمبلی اور صوبائی اسمبلی۔صوبائی لاہور میں قائم تھی اور قومی پنڈی میں (نہ جانے اسلام آباد تو اس وقت تک نہ تھا)۔

پہلے B.D کے الیکشن ہوئے۔ہم نیپ والوں نے الیکشن لڑا۔اپنے کچھ ممبر کامیاب کروا دیے پھر نیشنل اسمبلی کے الیکشن ہوئے۔ اس میں بھی ہمارے نمائندے کامیاب ہوئے۔بلوچستان میں دو ڈویژن تھے؛ کوئٹہ اور قلات۔کوئٹہ سے خیر بخش مری اور قلات سے عطا اللہ مینگل کامیاب ہوئے۔الیکشن کے معاملہ میں نواب اکبر خان بگٹی بلا کے انجینئر ہیں۔انہوں نے بہت کام کیا۔اور ان کی کامیابی میں ان کا ہاتھ بھی تھا۔ملاؤں سے مقابلہ تھا۔اور پھر پشتون ملاؤں سے، جن کا اس وقت عوام کے ذہنوں پر بڑا اثر تھا۔پھر بھی اکبر خان نے انہیں خیر بخش کے مقابلے میں ہرا دیا۔ہم بہت خوش تھے۔کاروبار بھولتے جا رہے تھے۔

خیر بخش مری جب اسمبلی میں گئے۔انہوں نے انگریزی میں تقریر پڑھی، انتہائی جذباتی۔بلوچستان کے لوگوں کے خیال میں ان کی بہت اچھی نمائندگی ہوئی۔پوری اسمبلی ان کی تقریر سے متاثر ہوئی اور کہتے ہیں کہ اسمبلی میں پن ڈراپ خاموشی تھی۔

بعد میں عطا اللہ نے اردو میں تقریر پڑھی۔وہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی۔بلوچستان کی خوب نمائندگی ہوئی۔

بلوچستان کے پشتون اور بلوچ جامے سے باہر ہو رہے تھے۔صمد خان شاید جیل میں تھے، جب واپس کوئٹہ ہمارے نمائندے آئے بڑا پُر جوش استقبال ہوا۔ملک عثمان پاک دل اور بہت جذباتی انسان تھے۔وہ بے حد خوش تھے اور ایک دم پروگرام بنایا کہ ان ہیرو نمائندوں کو عوامی ریسپشن (دعوت) دیں گے۔ہاں بھول گیا۔صوبائی الیکشن میں جناب احمد نواب بگٹی کامیاب ہوئے اور مکران سے باقی بلوچ۔

احمد نواز نے بھی انگریزی میں تقریر پڑھی ار بہت جوشیلی تقریر مقابلہ زعما میں سخت تھا۔باقی بلوچ نے جو میر غوث بخش کے حلقہ اثر سے کامیاب ہوئے تھے۔پاکستان اور ایران کی حد بندی پر پُر زور تقریر کی۔ان کا کہنا تھا کہ پاکستانی سفرا اور افسران نے ایران سے معاوضہ (رشوت) حاصل کر کے بلوچستان کی وہ سرزمین گنوادی ہے جو معدنیات (خصوصاً) پٹرول سے مالا مال ہے۔

ملک عثمان صاحب نے اپنے احباب کے ہمراہ کوئٹہ میونسپلٹی کے لان میں خیر بخش مری اور احمد نواز بگٹی کو ریسپشن دیا۔ملک صاحب اس قدر خلوص اور محبت میں منہمک تھے کہ خود تمام خرچہ کر رہے تھے۔بلدیہ ہوٹل والوں کو جو ہمارے دوست تھے، اور ملک عثمان کی وجہ سے یہ ہوٹل قائم ہوا تھا۔وہاں استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا۔میر جعفر خان جمالی مہمان خصوصی تھے اور خیر بخش صدر (اس وقت جماعت اسلامی کے علاوہ مسلم لیگ سے بھی اتحاد تھا، مسلم لیگ کا تعلق فاطمہ جناح سے تھا)۔

ملک صاحب خود اپنی گاڑی میں اپنے قالین اس تقریب کے لیے ڈھو کر لائے۔ان کے بھائی ہدایت اللہ بھی ساتھ تھے۔اور بلدیہ کے ہوٹل کے تمام پھولوں کے گملے خود اٹھا اٹھا کر قالینوں کے گرد جما رہے تھے۔

چونکہ عطا اللہ مینگل کوئٹہ میں موجود نہ تھے اور نہ ہی باقی بلوچ کوئٹہ میں تھے۔ لہٰذا وہ اس استقبالیہ میں شریک نہ تھے۔ ویسے بھی باقی بلوچ غریب انسان تھے۔ نہ جانے انہیں یہ اعزاز نصیب ہوسکتا یا نہ؟ مگر ملک عثمان ایک ایسے انسان تھے جو اس طرح نہیں سوچتے اگر باقی کوئٹہ میں ہوتے تو ملک عثمان انہیں سب کے برابر کا اعزاز دیتے۔

انہی دنوں ہماری دکان میں اکثر سیاسی رہنما اور کارکن اور سرکاری ملازمین جو ہمارے ہم خیال اور ہمدرد تھے۔ وہ اکثر شام کے وقت دکان کے سامنے جمع رہتے۔ عبدالصمد ترین (سرخ و سفید انگریز لباس میں ملبوس) اکثر دکان میں آتے۔ ان کی اس قدر ہمدردی اور ہم کاری کی سزا انہیں بعد میں ملی۔ نوکری سے نکالے گئے۔ کراچی میں گرفتار کیے گئے اور ان سے سخت برا سلوک روا رکھا گیا۔

ملک صاحب اور ہمارے سب سے قریب ترین دوست اور ہمکار و ہم خیال ملک صادق (شہید)، خیر بخش مری، میں، اور ملک عثمان تو تھے ہی، اس سیاسی (اگر اسے کہا جاسکے) گروہ کے میزبان ملک صادق نہایت پُر خلوص اور باہمت ساتھی تھے۔ وہ ملک عثمان کی وجہ سے شامل ہوئے تھے۔ عبدالواحد کرد بھی تھے مگر وہ دُور دُور رہتے تھے۔ اپنے اور خیر بخش مری کے کوئلہ کے کان کے لیے جان کی بازی لگا رہے تھے۔

خیر بخش کی شخصیت اُس وقت ہمارے لیے مقناطیسی قوت رکھتی تھی۔ ایک تو وہ نہایت خوبصورت تھے۔ ان کی گفتگو کا انداز نرم اور مسحور کن تھا۔ بعض دفعہ جب وہ دکان میں آتے تو میں ان کے قریب بیٹھ کر ایسا محسوس کر رہا ہوتا کہ بس کسی ایسی شخصیت کے قریب ہوں جو مجھے اعلیٰ اور ارفع خیالات اور بلندی کی طرف لے جا رہی ہے۔ یقین جانیے میں ان سے بے حد متاثر ہو رہا تھا۔ حالانکہ لٹ خانہ میں کئی مرتبہ ان سے ملتا تھا مگر ایسی صورتحال نہ تھی۔ بہر کیف یہ سب ملک عثمان کے خلوص اور پاک دلی کے کرشمے تھے۔

اسی دوران ایک عجیب واقعہ ہوا۔ بزنجو تو کوئٹہ جیل میں تھے۔ گل خان کو قلی کیمپ سے چھٹکارا دے کر زنجیروں کے ہمراہ نوشکی جیل بھیج دیا گیا۔ چند ماہ بعد انہیں نوشکی تحصیل کی حدود

میں باندھ کر رکھا گیا۔ ایک روز اس نئے انقلابی گروہ نے تاج ہوٹل (جس میں اکثر عطا اللہ ٹھہرا کرتے تھے۔ اس وقت نہ کوئٹہ میں ان کا بنگلہ تھا نہ بنگلہ خریدنے کی ان کی حیثیت تھی۔ اور نہ کوئٹہ میں چلتن ہوٹل کے سوا یا لورڈز کے بڑے لوگوں کے لیے رہائش کے قابل ہوٹل تھے۔ یہ صاحب اس قدر دولتمند نہ تھے البتہ ان کے ڈرائیور سے معلوم ہوا کہ وہ حاکم اپنی رعایا میں 'بجار' کر کے ایک لاکھ کے لگ بھگ جمع کر کے آئے تھے) دلچسپ بات یہ تھی کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس مخفی میٹنگ میں عطا اللہ، خیر بخش، اکبر بارک زئی اور میں موجود تھے۔ اور شورش بابو (جو ہم سب سے زیادہ کمیٹڈ انسان تھے)، اس کے علاوہ کوئی اور یاد نہیں پڑتا۔ ملک عثمان یا صادق چونکہ پٹھان تھے، وہ بلوچستان کے کمیونسٹ ہو نہیں سکتے تھے۔ ہمارے بلوچوں کی انقلابی سیاست میں اکثر پشتون یا غیر بلوچوں کو Exclude کیا جاتا۔ اور جب معاملہ قبیلے کا ہوتا تو اس قبیلے کا لیڈر اپنے قبیلے سے غیر کو بھی شامل نہیں کرتا۔

اتنا یاد رہے کہ اکبر نے شروع میں کہا کہ ہمیں انقلابی پارٹی منظم کرنی چاہیے۔ اور تنظیم کاری پر زور دیتے رہے۔ ان کی اس بات پر خیر بخش مسکرائے۔ اکبر اس سیریس Serious نشست میں حیران ہوئے اور شاید پوچھنے کے انداز میں ان کی طرف دیکھ کر استفسار کا سا چہرہ بنایا۔ نواب صاحب نے جواب دیا کہ تنظیم کاری کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے پاس لاکھوں کی تعداد میں (اندھے، جاہل، اَن پڑھ) قبیلوں کے عوام ہیں۔ جو اُن سے کہیں وہ کر ڈالیں گے۔ اکبر حیران رہ گیا۔ شاید اپنے مارکسی علم کے زیر اثر۔ بس اس کے بعد وہ سیاست شروع ہوئی جو سرداروں کے زیر اثر اور ان کی مرضی کے مطابق رہی۔ بعد میں جب غوث بخش بزنجو صاحب رہا ہوئے۔ تو وہ بھی اسی فکر کے پابند رہے۔ اور سمجھا کہ سرداروں کے بغیر بلوچستان میں کچھ نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً وہ سردار جو بڑے بڑے قبیلے رکھتے ہوں اور اس وقت اپنے ذاتی معاملات کی وجہ سے سرکار سے ناراض تھے اور آتے ہی سیاسی مدبر اور ملک بھر میں بے مثال ہیرو بن گئے۔ جیل اور بعد میں گوریلا جنگوں میں ان کی حیثیت دنیا بھر میں مشہور ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غوث بخش بزنجو، گل خان نصیر کی حیثیت ختم ہوگئی اور وہ خود ان کے زیر اثر ہوئے۔ بزنجو (غوث بخش) جو سب کے استاد

مانے جاتے تھے اور کہتے ہیں کہ ان کو سیاست میں لانے والے بزنجو تھے۔ ان کا انجام بلکہ اس سارے ڈرامے کا انجام المیہ میں بدل گیا۔

نہ جانے میں کس وجہ سے کراچی میں تھا۔ شیر محمد بھی وہیں تھے۔ انہیں خیال ہوا کہ عطا اللہ یہیں کراچی میں ہیں۔ کوئٹہ میں ملک عثمان نے خیر بخش اور احمد نواز کو استقبالیہ دیا تو کیوں نہ ہم یہاں کراچی میں عطا اللہ کو اس طرح کا استقبالیہ دے کر ان کی عزت افزائی کریں۔ شیر محمد نے کہا کہ اس استقبالیہ کے اخراجات کا بندوبست وہ کریں گے۔

چنانچہ ایک روز مجھے اور دیگر دوستوں کو ساتھ لے کر خدا ئیداد کالونی گئے۔ وہاں میر علی احمد تالپور کی کوٹھی واقع تھی۔ وہاں پہنچ کر میر صاحب سے اغراض بیاں ہوئے۔ انہوں نے نہایت خوشی سے استقبالیہ کے لیے رقم فراہم کرنے کا ذمہ لیا۔ چنانچہ ایک دو روز کے بعد میٹرو پول ہوٹل میں عطا اللہ کو استقبالیہ دیا گیا۔ انہوں نے تقریر کی اور سب خوش ہوئے۔

مگر باقی بلوچ کو اس طرح استقبالیہ دینے کا خیال نہ کوئٹہ میں کسی کو آیا نہ ہی کراچی میں۔

اس کے بعد (میں اس وقت کوئٹہ میں تھا) بلوچوں نے (لیاری کے بلوچوں نے، جنہیں قبائلی اور سرداری بلوچ اپنی قوم میں وہ حیثیت نہیں دیتے جو اپنوں کو دیتے ہیں حالانکہ ان کی دانست اور خدمات ان سے کئی گنا زیادہ ہے) سردار عطا اللہ کے اعزاز میں ایک بہت بڑی کانفرنس کا اہتمام کیا۔ اور وہ بھی اس تاریخی پارک میں جہاں انگروں کے خلاف محمد علی جوہر نے آتش بیانی کر کے انگریزوں کے خلاف باغیانہ تقریر کی۔ اور ان پر دفعہ 124A (بغاوت) لگایا اور سزا دی۔

اس کانفرنس میں عطا اللہ نے بھی اسی طرح آتش بیانی کی ہوگی۔ جو جوان بھی تھے، پرجوش اور خوبصورت بھی۔ ان کی کانفرنس کی آتش بیانی کی وجہ سے بے پناہ لوگ آئے ہوں گے۔ اس لیے عطا اللہ پر بھی وہی دفعہ 124A لگایا گیا۔ ان دنوں میں بھی کئی دوستوں کے ہمراہ کوئٹہ سے شہر بدری کی وجہ سے کراچی پہنچا ہوا تھا۔ مگر کانفرنس کے بعد۔ اکبر خان کراچی جیل میں تھے۔ خیر بخش بھی باقی تمام احباب کے ہمراہ کراچی میں تھے۔ وہ صدر کے Excellsior ہوٹل میں مقیم تھے۔ میں بھی انہی کے کمرے میں ان کے ساتھ رہ رہا تھا۔ شام کے وقت ہم خیر بخش

کے کمرے کے دروازے اور گیلری میں سب بیٹھے تھے کہ انٹیلی جنس کے آفیسر آئے اور وارنٹ گرفتاری دکھا کر عطا اللہ کو ہمارے درمیان سے اٹھا کر لے گئے۔ ہم سی آئی ڈی کے دفتر پہنچے تو وہاں عطا اللہ کے بھائی مہر اللہ اور عطا اللہ کے حامی قبائلی عبدو عبدالکریم کماندار گمشاد زئی کو بھی گرفتار کر کے پیشی کے لیے لایا گیا۔ ان دونوں کو خضدار اور بعد میں مچھ بھیج دیا گیا۔ مگر عطا اللہ خان کو کراچی سینٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ بس ککری گراؤنڈ کی کانفرنس اور تقریر کی وجہ سے عطا اللہ ملک بھر اور پھر عالمی سطح پر بلوچوں اور دوسروں میں مشہور ہوئے۔

کوئٹہ میں چلتن میڈیکل کے ایام میں مجھے ایک واقعہ پر اب بھی تعجب ہے۔ نجانے کیوں؟ صبح دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ ہم دکان میں بیٹھے تھے۔ دکان کیا تھی (بلوچوں کا) سیاسی مرکز تھا۔ ایک طرف سے عبدالباقی بلوچ بڑے خوش و خرم آ رہے تھے، دکان کے دروازے کے قریب پہنچے تو مخالف سمت سے خیر بخش (جسے اُن دنوں K.B کہہ کر یاد کیا جاتا تھا) اپنی کار میں آ کر رکے۔

گاڑی سے اترے تو باقی بلوچ نے بڑھ کر احترام سے ان سے ہاتھ ملانے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ کے بی نے ناراضی سے ان سے ہاتھ نہیں ملایا۔ اور پھر کے بی مجھے ٹھیک یاد نہیں، وہاں سے چلے گئے۔ باقی اندر آئے اور بہت افسردگی میں مجھ سے اس افسوسناک واقعہ کو بیان کیا۔ آبدیدہ ہو کر، وہ پمفلٹ دکھایا جس میں اس نے اسمبلی میں حکومت کے خلاف بلوچستان کی سرزمین کے ایک حصے کو ایرانیوں کے حوالہ کیا تھا، احتجاج کیا تھا؛

ببین تفاوتِ راہ کجا تا بہ کجاست (حافظ)

باقی سے میری آشنائی اُس وقت ہوئی تھی، جب میں 1957-1958 میں ''سوویت خبریں'' میں کام کرتا تھا۔ اور لی مارکیٹ میں بھائی کے پاس رہ کر ماہنامہ ''بلوچی'' میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ ان دنوں ہم غلام محمد شاہوانی، سردار خان گشکوری کے ہمراہ جاگیردار ہوٹل میں رہتے تھے۔ غلام جان کی باقی سے بہت دوستی اور آزادانہ مذاق تھا۔ خوب ہنسی اور مذاق ان سے ہوتا تھا۔ باقی بے حد خوش مزاج، خوب رو (سیاہ فام تھے) اور ذہین انسان تھے۔

وہ جام صاحب کی کوٹھی لسبیلہ ہاؤس میں رہتے تھے۔غریب آدمی تھے اور کہاں رہتے۔ بس ان کی ذہانت اور تعلیم کی وجہ سے ان کی عزت ہوتی تھی۔ میری پہلی ملاقات ان سے وہاں ہوئی۔ وہاں پتہ چلا کہ وہ ذہانت اور قابلیت کے علاوہ اچھے ادیب اور اردو کے نامور شاعر بھی ہیں۔ لاہور میں تعلیم حاصل کی تھی۔شاید ایف سی کالج میں اور وہاں مشتاق احمد گرمانی (بلوچ اور غریب اور ذہین بلوچ ہونے کے ناطے) انہیں اپنے یہاں رکھے ہوئے تھے۔ اس طرح انہوں نے تعلیم حاصل کی اور لاہور کے ادیبوں اور شعراء میں مشہور ہوئے۔ باقی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ ان کے والد جیکب آباد سندھ کے سولنگی سندھی تھے اور روزگار کے سلسلے میں مکران جا نکلے تھے۔ پوسٹ آفس میں ملازم تھے۔اور شاید تمپ میں انہوں نے کسی بلوچ خاتون سے شادی کی اور اس ازدواجی زندگی میں ان کے دو قابل اور نامور بیٹے پیدا ہوئے؛ عبدالباقی بلوچ اور سرجن عبدالمجید بلوچ (جو کراچی جناح ہسپتال کے مشہور سرجنوں میں سے تھے)

مکران میں چونکہ مادر سری کی باقیات اب تک ہیں۔ والدہ کی جائیداد تھی، کھجور کے درخت اور شاید کچھ زمین تھے۔ یہ بچے پڑھ سکے۔ والد، والدہ فوت ہوگئے۔

باقی سے بعد میں خصوصاً ملاقات ہوتی رہتی۔کبھی کبھار کوئٹہ آتے تو بھی ملاقات ہوتی۔ امان اللہ گچکی سے بھی ان کا یارانہ تھا۔دونوں ذہین انسان تھے۔اس سے بھی خوب مذاق کرتے۔

دیکھتے دیکھتے عبدالباقی بلوچ بہت بڑے اور نامور بلوچ لیڈر بن گئے۔ یہی شاید عبدالباقی بلوچ کے زوال کا باعث ہوا۔

ماہنامہ ''سنگت'' کوئٹہ۔ اگست 2000

۳۸

باقی بلوچ مغربی پاکستان کے صوبائی (ون یونٹ کے لحاظ سے) اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ جو لاہور کے اہل علم و دانش کے مرکز میں قائم تھی۔ باقی بلوچ اکثر لاہور میں قیام پذیر تھے۔اس وقت شاید اسمبلی ممبروں کے لیے علیحدہ ہاسٹل نہیں تھا۔وہ فلیش مین ہوٹل میں رہا کرتے تھے۔شام کو جیسے کہ لاہور کے دانشوروں کا دستور تھا، اکثر ٹی ہاؤس میں ان کا جم گھٹا ہوا کرتا تھا۔باقی یقیناً اسی جمگھٹے میں ہوتے تھے۔صحافی ان کے اردگرد جمع ہوتے۔ان میں سے ایک صحافی جن کا نام مجھے یاد نہیں، کوئی صدیقی صاحب تھے شاید، وہ باقی کے بے حد گرویدہ اور دوست ہوئے۔ان کے بیانات شائع کرواتے جو ون یونٹ اور مارشل لا اور گورنر کالا باغ کے خلاف ہوتے۔

اس طرح ان دونوں دوستوں نے کالا باغ کی دشمنی کو دعوت دی۔وہ کالا باغ جس نے ملک کے مشہور، عوامی اور عوام دوست شاعر حبیب جالب کو ان کی مشہور نظم 'کالا باغوں' کے بدلے ان پر حملہ کروایا۔خوش قسمتی سے جالب چھرے کی زد میں تو آ گئے، مگر بچ گئے۔کالا باغ اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو کر جالب سے پہلے رخصت ہوئے۔اسی طرح ایوب خان بھی۔کالا باغ نے اسی

طرح کا وار باقی بلوچ اوران کے دوست صحافی پر کروایا۔صحافی بیچارہ تو گولیوں کی زد میں آ کر وہیں فوت ہوا، باقی ایک گولی زد میں آ کر شدید زخمی ہوئے۔ کئی روز ہسپتال میں زیر علاج رہ کر تندرست اور زندہ لاہور سے نکلے۔حکومت کالا باغ کی اس سفاکانہ کاروائی پر ملک بھر میں بڑا احتجاج ہوا۔ بالخصوص بلوچوں اور کراچی کے بلوچوں میں۔

جب باقی کراچی بذریعہ طیارہ پہنچے تو ان کے استقبال کے لیے انسانوں کا ایک جم غفیر موجود تھا۔اب باقی کا پاکستان کے بڑے لیڈروں میں شمار ہونے لگا۔اس سے باقی بلوچ میں بھی احساس برتری نے کچھ زیادہ بری صورت اختیار کی۔

باقی اس وقت پاکستان کے بے حد مشہور اور قابل رہنما عوامی لیگ کے حسین شہید سہروردی کے پاس لکھم ہاؤس کراچی آنے جانے لگے۔ جہاں ان کی بیگم سلیمان اور ان کی خوبصورت بیٹی تمنا یا بے بی (دونوں ناموں سے مشہور تھیں) سے ملاقات ہوئی، ان کی بہت خاطر مدارت ہوتی۔اتفاق سے ہم بلوچستان کے نیپ کے چند ساتھی میں، گوہر خان زرک زئی اور ہاشم خان غلزئی مرحوم سہروردی صاحب سے ملنے لکھم ہاؤس گئے۔ زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ سہروردی کو میں نے دیکھا۔وہ واقعی متاثر کن شخصیت تھے۔ان کو بلوچستان کے حالات جو اس وقت فوجی کاروائی کی وجہ سے انتہائی خراب تھے، آگاہ کرنے گئے تھے، نیز ان کی اوران کی پارٹی کی سیاسی حمایت حاصل کرنے گئے تھے۔سہروردی صاحب نے نہایت غور سے ہماری باتیں سنیں اور ہمدردی کا اظہار کیا۔

ان کے کمرے میں ان کے بالکل سامنے ایک نوخیز دوشیزہ کی تصویر تھی۔معلوم ہوا کہ وہ ان کی نواسی اور بیگم سلیمان کی بیٹی کی تصویر تھی۔باقی اسی کے زلفوں کے اسیر ہو چکے تھے۔

بعد میں پتہ چلا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے عشق ہو گیا تھا۔ بعد میں بھی بعض لوگوں سے سنا کہ باقی نے بتایا کہ تھا کہ ہماری شادی بھی ہو گئی ہے۔مگر طبقاتی نظام کو یہ عشق بے حد ناگوار گزرا۔کہاں فرہاد اور کہاں پرویز کی بیوی شیریں............ان کے لوگوں کو پتہ تھا کہ کالا باغ باقی سے ناراض ہیں۔رپورٹ کر کے باقی کو زندان میں ڈال دیا گیا۔ اس واقعہ کے وقت سہروردی

صاحب پاکستان میں موجود نہ تھے۔کالا باغ اور ایوب خان انہیں پاکستان میں پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ سہروردی بھی پاکستان کے فوجی جرنیلوں کی دہشت سے ملک سے باہر گئے تھے اور جلد ہی بیروت (لبنان) میں وفات پا گئے۔ان کی نواسی کو ان کی والدہ بیرون ملک لے گئیں۔اور اس طرح سے باقی کے عشق کا تو خاتمہ ہوا۔مگر اس کے غم نے بالآخر اس کی جان بھی لے لی۔

باقی اس عشق میں دیوانہ تھا اور اس نے نشہ شروع کیا اور منشیات کا عادی ہوا۔ بعد میں جب اسے اپنی تباہی کا احساس ہوا تو اس نے منشیات سے جان چھڑانے کی کوشش کی اور گلشن اقبال میں واقعہ ہسپتال میں، جہاں میرے قریب ترین عزیز ڈاکٹر جہاں زیب لوگوں کا علاج کرتے تھے، باقی بلوچ ان کے زیر علاج رہے۔ میں ان کے گھر میں مہمان تھا۔انہوں نے باقی کی خستہ حالت مجھ سے بیان کی۔ بڑا دکھ ہوا۔

باقی سے میری آخری ملاقات اُس وقت ہوئی جب میں طلوع کی ادارت میں شریک تھا۔نہ جانے کس خیال سے وہ ایک روز مجھ سے ملنے ویسٹ وارف ٹریڈ اینڈ انڈسٹری پریس جو غازی صلاح الدین نے قائم کیا تھا اور جہاں ماہنامہ ''طلوع'' چھپتا تھا، آئے۔ میں کام میں مصروف تھا کہ گیٹ سے ایک آدمی نے آ کر بتایا کہ آپ کو ایک صاحب باہر بلا رہے ہیں۔ میں جب گیٹ پر پہنچا تو باقی بلوچ کا خوبصورت اور مسکراتا چہرہ نظر آیا۔ بڑا خوش ہوا۔ انہیں لے کر پریس کے ایک طرف ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ وہاں ہم کافی پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ باقی نے ماجرا سنایا اور اپنے ساتھیوں اور سیاسی زعما کی شکایت کی کہ ان سے ان کا رویہ دوستانہ نہیں۔

بس یہی ہماری آخری ملاقات تھی۔

بعد میں سنا کہ باقی اپنے بھائی سرجن مجید کے پاس رہتے ہیں۔ان کی دماغی اور جسمانی صحت درست نہیں۔اکثر درباروں اور زیارت گاہوں میں جایا کرتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے۔

ایک روز سنا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے اور انہیں میوہ شاہ کے مشہور قبرستان میں ہمیشہ آرام کرنے کے لیے دفنایا گیا ہے۔